زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

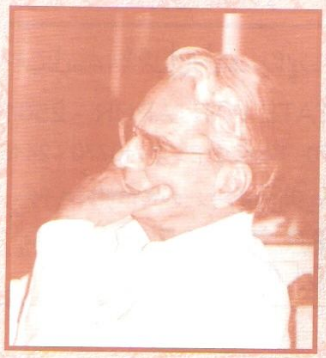

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

ربطِ سخن

ڈاکٹر خالد حمید شیدؔا
(ایم۔ڈی ہیوسٹن، امریکہ)

قہرِ جاناں کو بجز لطف و کرم کہہ نہ سکے
جو بھی کچھ رنج ملا، اس کو الم کہہ نہ سکے
بار برداریِ غم دل نے بہت کی لیکن
اُسکی بیداد کو ہم جور و ستم کہہ نہ سکے
دل کی باتیں تھیں بہت، دیکھ کے لیکن اُسکو
کہنے آئے تھے مگر ایک بھی ہم کہہ نہ سکے
ایک دن آئی وہ جب پوچھنے حالت دل کی
ایسے بدحال ہوئے، قصۂ غم کہہ نہ سکے
کہتے انداز کو ہیں خانہ برانداز، تو ہم
ناز کو فتنہ و آشوب سے کم کہہ نہ سکے
دیکھنے ہم جو گئے حرمتِ قلبِ شیدؔا
تھا وہ معمورِ بتاں، اُسکو حرم کہہ نہ سکے

☆

جلوہ نما جو شاہدِ مستور ہو گیا
روشن چراغِ دیدۂ بے نور ہو گیا
دل پر گری جو برقِ تجلّی مرے کبھی
ایسا جلا کہ نور علیٰ نور ہو گیا
اے دوست جبر اس پہ نہیں جب ترا کوئی
پھر دل کیوں اسقدر مرا مجبور ہو گیا
پہلے تو دل دُکھاتا مرا تھا کبھی کبھی
لگتا ہے اب کہ یہ ترا دستور ہو گیا
جب سے چرائی آنکھ ہے اس نورِ چشم نے
بے نور آنکھ ہو گئی، دل چُور ہو گیا
ساقی ملا کے آنکھ پلائی جو تُو نے مے
قاتل کچھ اور دیدۂ مخمور ہو گیا
رسوا جہاں میں گر ہوا شیدؔا تو کیا ہوا
شکرِ خدا کہ یار تو مشہور ہو گیا

برخلافِ رائے طبی خواہشِ یاری ہوئی
باوجودِ حبسِ دم، دل کو ہواداری ہوئی
تھا غمِ فرقت اگرچہ، فربہی بڑھتی گئی
کچھ فشارِ خون کی بھی دل کو دشواری ہوئی
سخت ہوتی جارہی تھیں دمبدم دل کی رگیں
روغنی روٹی سے لیکن پیٹ کو یاری ہوئی
نوش تمبا کو کیا اور عشق بھی کرتے رہے
کیا عجب ہے پھر کہ دل کی ہم کو بیماری ہوئی
دل ملا ورثے میں تھا بدحال، لیکن کم نہیں
باعثِ افگاریِ دل کچھ جفا کاری ہوئی
تھے مریضِ قلب پہلے ہی سے لیکن ہجر میں
دل کا دورہ جب پڑا، رقت بہت طاری ہوئی
حرکتِ دل بند بے پرہیزگاری کر گئی
موت کا باعث و لے شیدؔا استمگاری ہوئی

کبھی جلوہ بھی دکھلایا تو ہوتا
یہ دل کچھ اور تڑپایا تو ہوتا
نکل کر تُو کبھی پردے سے باہر
ہمارے سامنے آیا تو ہوتا
جہاں جلتے ہیں جبرائیل کے پر
وہاں ہم کو بھی پہنچایا تو ہوتا
کچھ اپنی آنکھ کے ساغر سے بادہ
ملا کر آنکھ چھلکایا تو ہوتا
چھپایا شرم سے اپنوں سے منہ جو
تُو غیروں سے بھی شرمایا تو ہوتا
جفائیں کر کے ظالم ہم پہ اتنی
کبھی تھوڑا سا پچھتایا تو ہوتا
کبھی جھوٹا سا کر کے ایک وعدہ
دلِ مضطر کو بہلایا تو ہوتا
پریشاں زلف سلجھائی جو تُو نے
یہ الجھا دل بھی سلجھایا تو ہوتا
کیا رسوا ہے اتنا جس نے شیدؔا
کبھی اُس دل کو سمجھایا تو ہوتا

چہارسُو

جلد:۱۵، شمارا مئی، جون ۲۰۰۶ء

مجلسِ مشاورت

قارئین چہارسُو

زرِ سالانہ

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

چہارسُو کا زیرِ نظر شمارا،

البیلی رُتوں، اَن دیکھے موسموں، اَن سُنی آہٹوں، چہچہاتے پرندوں، گیت گاتے مسافروں،

لہلہاتے کھیتوں، جھومتی ہواؤں، اُڑتے بادلوں، سرسراتی ندیوں، گُنگُناتی آبشاروں،

سرگوشیاں کرتے پہاڑوں، سوچوں میں گُم سمندروں، خوشبو بکھیرتے پھول پودوں،

گدگداتی اُمنگوں اور اَن دیکھے خوابوں سے منسوب ہے۔

بانی مدیرِ اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیرِ مسؤل

گلزار جاوید

مدیرِ معاون

بینا جاوید

رابطہ: 537، ویسٹرج-III، راولپنڈی۔ فون: 5467235 - 92-51-5462495 ای۔میل: waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

قرطاسِ اعزاز ......ادارہ
سرورق کا پس ورق ...... شعیب زیدی
پیشانی ...... مصطفیٰ ملک
امر برخوردی ...... قاری شا
ایک زمانہ بیت گیا ......دویندر اسر
براہ راست ...... گلزار جاوید
مسٹر روشو ......دویندر اسر
اسر کی افسانہ طرازی ......مہدی جعفر
مستقبل کی فکری تخلیق ...... شمیم حنفی
وہ جسے لوگ بھول گئے ......نند کشور وکرم
خوشبو بن کے لوٹیں گے ......دویندر اسر
ہم ادب کیوں پڑھیں ......دویندر اسر

قلب صمیم
صدیقی شاہد، ماہر عظیم آبادی

سخن تازہ
محسن احسان، مشکور حسین یاد، شبنم شکیل، یمین، جوہر، جاوید شاہین، سرور انبالوی، اکبر حمیدی، مناظر عاشق ہرگانوی، شاہد واسطی، عبدالرحمان عبد، کرشن کمار طور، غلام مرتضیٰ راہی، انوار فیروز، احمد ساغری، یوگیندر بہل تشنہ، قیصر نجفی، ملک زادہ جاوید، غالب عرفان، سیفی سرونجی، خیال آفاقی، اصغر مہدی، ماجد سرحدی، صدیقی فنکار، سہیل غازی پوری، کرامت بخاری، ضمیر نوری، خاور خان سرحدی، زبیر کنجاہی، شگفتہ نازلی، امتیاز راشد، ماجد انصاری، مشتاق شبنم، رؤف، حیدر اسد، طالب انصاری، محسن عباسی، پرویز ساحر، ناز بیابانی

افسانے
ایک دن ......شمشاد احمد
سرحدیں ......دیپک بدکی
کوئلہ بھی نہ راکھ ......ارشاد احمد صدیقی
یہ کیسی محبت ......ڈاکٹر رینو بہل
ترس کے سنگ سنگ ...... عمران مشتاق
لمحوں کی گرفت ......انجم جاوید
فریقِ ثانی ...... گلزار جاوید

نظم عصر
ستیہ پال آنند، یونس صابر، صفوت علی صفوت، دل نواز دل، ماجد سرحدی، مناظر عاشق ہرگانوی، قیصر نجفی، یوگیندر بہل تشنہ، غالب عرفان، خیال آفاقی، شگفتہ نازلی، ماہر عظیم آبادی، مشتاق شبنم، رخسانہ پروین، حنیف ترین۔

نشانِ راہ
اسی کا نام محبت ہے ...... تقی عابدی
اعجاز راہی کی یاد میں ......نثار یاد

تخلیقِ عصر
تازہ تصانیف کا تعارف ...... عطیہ سکندر علی

رس رابطے
جستجو، ترتیب، تدوین ......اعجاز کھوکھر

متاعِ چہارسو

اسرارِ خودی

فاری شا

نام: دیویندر ناتھ اِسّر

ادبی نام: دیویندر اِسّر

مقامِ پیدائش: کیمبل پور (مغربی پنجاب)

تاریخِ پیدائش: ۱۴ اگست ۱۹۲۸ء

والد: شری ناتھ اِسّر
(ایڈووکیٹ کیمبل پور (حال اٹک مغربی پنجاب)

تعلیم: بی اے (۱۹۴۷ء) گورنمنٹ کالج
(پنجاب یونیورسٹی) کیمبل پور
ایم اے (۱۹۴۹ء) سماجیات۔ الٰہ آباد یونیورسٹی
بی لِب (۱۹۵۳ء) دہلی یونیورسٹی
کمیونی کیشن آرٹس (۱۹۷۲ء) کارنیل یونیورسٹی امریکہ

بچپن: کیمبل پور، حسن ابدال اور راولپنڈی میں گزرا
تعلیم پرائمری سے بی اے تک کیمبل پور میں

ادبی زندگی: کالج کی میگزین "مشعل" میں مضامین سے آغاز۔
جن میں منظوم ایک ادبی ڈرامہ "کچھ ادب کے
بارے میں" کچھ ٹیگور کے بارے میں اور مُدوا؛
کتاب پر مضمون "انسانی زندگی کا معمارِ اعظم" ٹیپو
سلطان اور تبصرے وغیرہ شامل ہیں۔

پہلی کہانی: بہ عنوان "چوری" نسوانی دنیا (لاہور) کے اگست
۱۹۴۶ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔

دوسری کہانی: بہ عنوان "ردِ عمل"، "ساقی" (دہلی) کے افسانہ نمبر
جولائی اگست ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔ ہندوستان
میں شائع ہونے والا "ساقی" کا شاید یہ آخری شمارہ
تھا۔

پہلا مضمون: "آرٹ کا سائنٹفک نظریہ" نظام رنگین (بمبئی)
۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔

دوسرا مضمون: "اردو ادب اور فسادات" افکار (بھوپال) مئی
۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔

پہلا ڈرامہ: "بھوکے دیوتا" نظام رنگین (بمبئی) ۱۹۴۷ء میں
شائع ہوا۔

پہلی ہندی کہانی: لیکن (پرتی کریا) "ہنس" ہندی (بنارس) اکتوبر
۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔ ہنس میں ہی شائع شدہ
کہانی "مکتی" مارچ ۱۹۴۹ء کو سرکار نے قابلِ
اعتراض قرار دیا۔ ہنس میں ہی پہلا ہندی مضمون
بھی شائع ہوا۔
بعد میں اردو ہندی، پنجابی اور انگریزی میں افسانے
اور مضامین متعدد رسالوں میں شائع ہوئے اور
دوسری زبانوں میں ان کے تراجم ہوئے۔

ذریعہ معاش: ۱۹۴۹ء میں کانپور میں روزنامہ "امرت" کے
ادارے سے منسلک۔ ۱۹۵۰ء میں دہلی میں
پرائیویٹ کالجوں میں پڑھانا شروع کیا۔ ۳۱ اکتوبر
۱۹۵۹ میں سرکاری ملازمت اور انگریزی میں شائع
ہونے والے رسالوں کی ادارت۔ ۳۱ اگست
۱۹۸۶ء میں ملازمت سے سبکدوش۔

سفر: ایران، اٹلی، فرانس، جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ،
سوئزرلینڈ، کناڈا اور ایک سال کا قیام امریکہ میں۔

سماجی، سیاسی زندگی: کالج کے زمانے سے کمیونسٹ تحریک سے منسلک،
طلبا کی تحریکوں میں شرکت اور ۱۹۵۳ء میں اس
تحریک کو خیرباد۔
انجمن ترقی پسند مصنفین الٰہ آباد اور کانپور کے
سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ اتر پردیش انجمن
ترقی پسند مصنفین (ہندی) کی مجلس عاملہ کا رکن
"کلچرل فورم" (مختلف زبانوں کی ادبی انجمن) کا
قیام اور کنوینر جس کے صدر جناب پریم ناتھ درد
تھے۔

دائرۂ عمل: کمیونی کیشن کے مختلف شعبوں میں اکادمک اور عملی
سرگرمیاں، ہندی میں کمیونی کیشن کی کتاب "جن
مادھیم، سمپریشن اور وکاس" پر "آل انڈیا
بھارتیندو ہریشچندر ایوارڈ ۱۹۸۸ء"۔ "کیوس کا
صحرا" (افسانوی مجموعہ) "مستقبل کے روبرو"
(تنقید) اور "خوشبو بن کے لوٹیں گے" (ناول) پر
انعامات تخلیقی ادب پر دہلی اردو اکادمی ایوارڈ۔
۱۹۹۳ شرومنی ہندی ساہتیہ کار پرسکار (پنجاب)
۱۹۹۸۔ دلی ہندی ساہتیہ کار سمان ۲۰۰۲ غالب

انعام یافتہ: انعام برائے اردو نثر ۲۰۰۴ء۔

ادارت: "امرت" روزنامہ کانپور "ارتقا" ماہنامہ کانپور "شعلہ" ماہنامہ کانپور "راہی" ماہنامہ دہلی اور انگریزی میں کئی رسائل۔

تصانیف: اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی میں 40 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہندی میں اردو کی کہانیاں، شاعری اور جدید ادب کی کتابیں پیش کیں بالخصوص سعادت حسن منٹو کی تحریروں کے کئی مجموعے شائع کیے جن میں "منٹو نامہ" منٹو پر تنقیدی انتھالوجی بحیثیت اپنی طرز کی پہلی کتاب کے مقبول ہوئی۔

افسانے:

۱۔ گیت اور انگارے آزاد کتاب گھر کلاں محل۔ دہلی ۱۹۵۲

۲۔ شیشوں کا مسیحا حلقہ ارباب فکر۔ تمن جٹی۔ کراچی ۱۹۵۵

۳۔ کینوس کا صحرا۔ پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز دہلی ۱۹۸۲

۴۔ پرندے اب کیوں نہیں اڑتے۔ پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز دہلی ۱۹۹۲

تنقید:

۵۔ فکر و ادب۔ مکتبہ قصر اردو، اردو بازار دہلی ۱۹۵۸

۶۔ ادب اور نفسیات۔ مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی ۱۹۶۲

۷۔ ادب اور جدید ذہن۔ مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی ۱۹۶۸

۸۔ مستقبل کے روبرو۔ پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز دہلی ۱۹۸۲

۹۔ ادب کی آبرو۔ پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز دہلی ۱۹۸۶

۱۰۔ نئی صدی اور ادب۔ پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز دہلی ۱۹۸۲

ناول:

۱۱۔ خوشبو بن کے لوٹیں گے۔ پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز دہلی ۱۹۸۲

۱۲۔ خوشبو بن کے لوٹیں گے (چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں) (ہندی میں)

ترسیل:

۱۳۔ عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی قومی کاؤنسل برائے فروغ اردو ۲۰۰۵

ہندی: (افسانے)

۱۴۔ پھول پتھر اور زندگی ۱۵۔ انوکھا اپہار

۱۶۔ کراس پر ٹنگی تصویریں ۱۷۔ کہانی کا انت

۱۸۔ پرندے اب کیوں نہیں اڑتے ۱۹۔ آدمی پرندہ ہے

۲۰۔ کالے گلاب کی صلیب ۲۱۔ سدھارتھ

۲۲۔ بیتے موسم کی باتیں

تنقید:

۲۳۔ چنتن اور ساہتیہ ۲۴۔ ساہتیہ اور نوکرن

۲۵۔ ساہتیہ اور آدھونک یگ بودھ ۲۶۔ ساہتیہ کتی اور سنگھرش

۲۷۔ بھوشیہ کے روبرو ۲۸۔ شبد ستارے

۲۹۔ نئی صدی اور ساہتیہ ۳۰۔ کوئی آواز نہیں ہوتی

۳۱۔ سمیکشا: جن مادھیم اور وکاس

۳۲۔ سیکس، سنہا اور یوا پیڑھی

۳۳۔ اتر آدھونکتا۔ ساہتیہ اور سنسکرتی کی نئی سوچ

۳۴۔ ست رنگی تتلیاں ۳۵۔ آوارہ ہواؤں کا موسم

۳۶۔ بھارتیہ سنسکرتی اور اشلیلتا

۳۷۔ ساہتیہ اور سمکالینتا۔ پرش پرتی پرش

۳۸۔ سپنے اور سمرتی کے بیچ

۳۹۔ میڈیا، سماج اور سمواد

ترتیب و تدوین:

۴۰۔ اردو کی غزلیں ۴۱۔ اردو کی چنی کہانیاں

۴۲۔ اردو کی ناری کہانیاں ۴۳۔ سمکالین اردو کہانیاں

۴۴۔ آدھونک اردو ساہتیہ

۴۵۔ منٹو نامہ ۴۶۔ منٹو کی سرو شریشٹھ کہانیاں

۴۷۔ منٹو کی راجنیتک کہانیاں ۴۸۔ دور درشن اور ساہتیہ

۴۹۔ منٹو عدالت کے کٹہرے میں ۵۰۔ اردو کی پرتی ندھی کہانیاں

۵۱۔ ساہتیہ سنگھرش اور پریورتن

۵۲۔ ماڈرن ہندی شارٹ اسٹوریز

پنجابی: ۵۳۔ ساہتیہ دے آدھونک چنتن ۵۴۔ اتر آدھونکتا

انگریزی:

55. Images of KAMA
56. Communication, Mass Media & Development
57. Thought (ED)
58. Memoirs of Fragrance
59. Birds Fly No more

ترجمہ: ۶۰۔ میری جیل ڈائری جے پرکاش نارائن

پتہ: B-3/153 جنک پوری، نئی دہلی ۱۱۰۰۵۸

....ایک زمانہ بیت گیا

دیویندر اسر

کہتے ہیں کہ پتھروں کے شہر میں شیشہ گری کا کام بہت نازک (اور خطرناک) ہوتا ہے۔ اس میں خطرۂ جان بھی ہے اور خطرۂ ایمان بھی۔ پتھروں کے شہر میں شیشہ اور تیشہ ایک ساتھ نہیں رکھنا چاہیے۔ خاص طور پر ان لوگوں کو جن کے جسموں کے گرد آسیب منڈلا رہے ہوں۔ اور دلوں پر ناکردہ گناہوں کی سزا کے نشان ثبت ہوں۔ سنا یہ بھی ہے کہ آخری عمر میں پرانا زخم اور پرانا عشق بڑا دکھ دیتے ہیں۔ لیکن کریدنے میں مزا بھی بڑا آتا ہے۔ بھولے بسرے پرانے گیت بھی کتنے دلچسپ لگتے ہیں۔ لیکن مجھے سرعام برہنہ بازاروں میں کسی بھی زخم پرانے یا نئے کی نمائش پسند نہیں۔ نہ لکھنے میں نہ زندگی میں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شیشہ گھروں میں رہنے والوں کو بہ ہنگام بستر ہونے سے پہلے روشنیاں بجھا دینی چاہیے۔ اور پردے گرا دینے چاہیے۔ شاید کچھ لوگوں کی زندگی کھلی کتاب ہو۔ میں نے اس کتاب کے کچھ صفحات کو مستقل بند کر دیا ہے ہمیشہ کے لیے۔

اس سے جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ بڑے تذبذب میں ہوں۔ جھوٹ بولنے کی عادت نہیں رہی۔ اور سچ کہنے کی ہمت نہیں۔ سو سنیے میر کا شعر:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

ہانڈی والے لیمپ کے گرد بیٹھے ہوم ورک پورا کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ سرہانے کے نیچے سے پرندوں، پریوں اور بھوت پریتوں کی کہانیوں کی کتابیں نکالتا ہے اور پڑھنے لگتا ہے۔ خوابوں کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ پرندوں کے ساتھ اڑتے اڑتے آسماں سے پرے خلاؤں میں شامل ہو جاتا ہے۔ جھلملاتے ستاروں کے جھرمٹ میں رقص کرتی پریوں میں گھر جاتا ہے۔ حیرانی سنسنی۔ اچانک رات کے اندھیرے میں کسی تنگ گلی کے اندھے موڑ پر بھوتوں پریتوں کا غول اس پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ کوئی پرندہ گھائل ہو کر آسماں کی بلندی سے زمین پر آ گرتا ہے۔ پریاں بادلوں کی اوٹ میں چھپ جاتی ہیں۔ ستارے بجھ جاتے ہیں۔ اور وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ خوفزدہ۔ اس کی نیند کھل جاتی ہے۔ پھر وہ سو نہیں پاتا۔ سورج کی پہلی کرن دروازے کی درز سے داخل ہوتی ہے۔ وہ آنکھوں میں نیند اور دل میں دہشت لیے اسکول کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔

پانچ چھ برس کی عمر سے یہی سلسلہ جاری رہا۔ سنیچر وار کی شام کو ہوم ورک سے چھٹی ملتی تھی۔ اس شام وہ فلم دیکھنے نکل پڑتا۔ اسے نادیا کی فلمیں بہت پسند تھیں۔ سڈول سڈول طاہر کتابدن اس کے جسم میں بجلی کی طرح حرکت پذیر ہو جاتا۔ جبر و ستم کے خلاف تلوار کے وار کرتی ایک سرکش عورت..... ہنٹر والی' پری کیسی پہنا کو ائمنڈ کوئین..... جھانسی کی رانی!

پھر یہ سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ سرہانے کے نیچے سے پرندوں، پریوں اور بھوت پریتوں کی کہانیاں غائب ہو گئیں۔ ان کی جگہ ڈاکوؤں اور جاسوسوں نے لے لی۔ جگا ڈاکو کے قصے اور لوک گیت بڑے شوق سے سنے اور سنائے جاتے تھے۔ جگے ماریا لائل پور ڈاکا۔ تے تاراں کھڑک پیاں۔ آپے آپنا رنجاں ملکن گے تیرے ملنے اور پھر یا لو جس کے حسن و عشق کے چرچے اور گیت ہر زبان پر تھے۔ ہیر توں ہیر توں بھر پنجاب دی سب توں سوہنی کڑی'۔ ذرا تصور کیجیے جب ذہن میں پریوں، پرندوں اور بھوت پریتوں کی پرواز ہو۔ جگا' دایا اور یا لو کے لیڈو چیز اور رومانس ہوں تو دل و دماغ پر کیا گزرتی ہوگی۔ آنکھیں تو یہ یاد ہوتا تھا سو ہو گئے لیکن!

''نہ جانے کیوں یہ لوگ یک بیک ہی اتر سے خلا اور فضا کی لامحدود گلیوں میں بھٹک رہے ہیں اور گھر تے ٹوٹتے سیارہ میں سمت آ رہے ہیں۔ دیواروں سے سر ٹکراتے ہیں، پنکھ پھڑپھڑاتے ہیں، میرے گرد آسیب کی طرح منڈلاتے ہیں اور بار بار پوچھتے ہیں:

کون ہو تم
کوئی بھی ایک آدمی۔
سنا ہے تم بہت بدل گئے ہو
ہاں
اور کچھ پڑھے لکھے بھی ہو
ہاں
قصے کہانیاں بھی لکھتے ہو۔
کبھی کبھی۔
اور وہ ایک دم مجھ پر ٹوٹ پڑتے ہیں
تو بتاؤ۔
پرندے اب کیوں نہیں اڑتے"

(اسی نام کی کہانی سے اقتباس)

1939: "جانے والے سپاہی سے پوچھو وہ کہاں جا رہا ہے؟" مشہور شاعر مخدوم محی الدین نے کہا۔

1941: "یہ جنگ ہے جنگِ آزادی' آزادی کے پرچم کے تلے یہ" بھی اسی شاعر نے کہا کیونکہ نازی ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا تھا۔ سامراجی جنگ عوامی جنگ میں بدل گئی۔

1942: "کرو یا مرو" "انگریزو ہندوستان چھوڑو" فضاؤں میں نعرے گونج رہے تھے۔ اور کبھی کبھی کسی پردیش میں دھماکوں کی گونج سنائی دے جاتی تھی۔

پانچ سال بعد انگریزوں نے ہندوستان چھوڑ دیا۔ اور لاکھوں لوگوں نے اپنا اپنا وطن' اپنا اپنا گھر اور اپنا اپنا جسم بھی..... اپنی وطن میں۔ بے بس' بے

یادوں کے بکھرے یادنا شادنا کا دل ..... یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر۔

ہماری عمر ہی کیا تھی جب ایک نوجوان بھگت سنگھ کو پھانسی دے دی گئی تھی۔ تب ہم اسکول میں پڑھتے تھے اور اپنے گھروں کی سیڑھیوں پر بیٹھے اکثر سوچا کرتے تھے۔ کیا کریں؟ کسی نے کہا کہ ریل کی پٹری اکھاڑ دی جائے کیسے؟ کیوں نہ ہم بنائیں۔ کیسے؟ ایک جلوس نکالیں، پکڑے جائیں گے۔

1943: پورب دیس میں ڈھگی باجے بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال۔

ہم چلچلاتی دھوپ میں آگ لگی سڑکوں پر گاتے بجاتے گھوم رہے تھے۔ بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال۔ گلیوں، کوچوں، بازاروں، سڑکوں، اسکولوں، دکانوں، دفتروں، کھیت کھلیانوں اور گھروں میں ہماری ٹولی گھوم رہی تھی۔ ہم ہر جگہ موجود تھے۔

1945: لال قلعے سے آئی آواز، سہگل، ڈھلوں، شاہنواز۔ یہ آواز بہادر شاہ ظفر کی نہیں تھی جو نہ کسی کی آنکھ کا نور ہے نہ کسی کے دل کا قرار ہے بس ایک مشت غبار ہے۔

1946: بمبئی میں نیوی کے نوجوانوں نے بغاوت کر دی۔ بتایا یہ گیا کہ کیا گھنٹے تھے۔ ساحر نے پوچھا اے رہبر ملک و قوم بتا یہ کس کا لہو ہے کون مرا۔ جو دیش کا پرچم لے کے اٹھے وہ شوخ سپاہی کون تھے۔

اور پھر 1947: بٹ کے رہے گا ہندوستان، بن کے رہے گا پاکستان۔

ہندو ہندی ہندوستان .... اکھنڈ بھارت امر رہے۔

بھارت ٹوٹ کے ٹکڑے ہو گیا۔ ایک لکیر جو ایک نیم روشن کمرے میں لیمپ کی دھندلی روشنی میں نیلے نقشے پر کھینچی گئی تھی جسموں اور دلوں کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔

ملکانی نے اپنے انٹرویو میں پہلا سوال ہی یہ پوچھا 'آپ لکھنے سے کیسے جڑے' میرا مطلب ہے پرشوتم بھوئی؟ میرا جواب تھا 'پرشوتم بھوئی تو آپ کا پورا ماحول ہوتا ہے۔ گھر بار، پریوار سے لے کر سارا سنسار .... لیکن تخلیق کا سرچشمہ اس کا دروں .... 'ہر اسپیک' ہوتا ہے۔ ہر فرد میں خارج اور باطن کا توازن اور تناسب مختلف ہوتا ہے۔ پارٹیشن کے دنوں کی کچھ یادیں؟' سوال تھا۔ کانپور میں ہم ترکِ وطن کر کے آنے والوں کے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ رہ رہے تھے۔ یہ گھر بھی ایک طرح سے ریفیوجی کیمپ بن گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد میں ایم۔ اے کی پڑھائی کے لئے الٰہ آباد چلا گیا۔ چار پانچ دن تو ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک سستے سے ہوٹل میں رہا۔ لیکن جب ہوا گرم ہونے لگی تو یونیورسٹی روڈ پر دوکا پانڈے کے ایک کمرے اور کچن والے چائے ریستورانوں میں رہنے لگا۔ کرسیوں کے نیچے اپنا بکس رکھ دیا۔ رات کو کرسیاں جوڑ کر سو جاتا۔ پانڈے جی نے یونیورسٹی روڈ پر ایک مکان کی اوپری منزل پر کھپریل والے ایک کمرے میں رہنے کا بندوبست کر دیا۔ جہاں پہلے ہی سے ایک سوتی کا رہتا تھا۔ وہ دن کو سوتا تھا اور رات کو سوتیاں بڑا اشتا تھا۔ رات کو اس کا ہتھوڑا اینٹوں کے ساتھ ساتھ میرے دماغ پر بھی پڑتا تھا۔ پانڈے جی جب بھی کسی سے میرا تعارف کراتے تو کہتے کہ یہ پنجاب کا بنیا ہے۔ ایک دن میں نے کہا پانڈے جی آپ جانتے ہیں کہ شرنارتھیوں میں پنجاب کا بنیا ایک گھوڑے کا نام ہے۔ وہ ہنس دیئے بولے جو کچھ اس دیش میں ہو رہا ہے وہ کیا شرنارتھیوں سے کم ہے۔ پھر میں پیلا روڈ پر ایک نئے طالب علم چندن صاحب کے گھر شفٹ ہو گیا۔ اس کے پاس ہی بنک اسٹریٹ پر فراق گورکھپوری کا گھر تھا۔ میرا کمرہ دویندر اسر کا کمرہ کے نام سے کچھ اس طرح مشہور ہو گیا کہ بقول مدن دیکشت 'یہ کمرہ کٹرہ علاقے میں ترقی پسند ادب اور طلبا کی تحریک کی ریڈنگ اور ذہنی چھاؤنی کی حیثیت رکھے گا (دویندر اسر کا کمرہ' مدن دیکشت، ہنس جنوری 1997ء)

الٰہ آباد میں اس سے نامی گرامی ادیب اور دانشور اساتذہ اور سیاستدان رہتے تھے۔ گرما گرم ادبی اور سیاسی بحثیں ہوتی تھیں۔ شہر کی رفتار سست تھی لیکن ذہن کی رفتار بہت تیز تھی۔ جب اپنی کہانی 'سردار جی' جو بلا ہندی ماہنامہ میں چھپی تھی کے مقدمے کے سلسلے میں خواجہ احمد عباس الٰہ آباد آئے تھے تو ہم نے ان سے ملاقات کا پروگرام رکھا۔ انہوں نے رامانند ساگر کی ناول 'اور انسان مر گیا' کا دیباچہ تحریر کیا تھا جسے ترقی پسندوں کے عتاب کا شکار بننا پڑا۔ یہ دور بائیں بازو کی مسلح کرانتی کا تھا۔ مشکوک ادیبوں کو انجمن سے خارج کیا جا رہا تھا۔ اس فہرست میں عباس صاحب کا نام بھی تھا۔ نشست میں ان پر ذاتی اور سیاسی حملے کئے گئے لیکن انہوں نے بڑے ضبط اور بڑی خوش اسلوبی سے تمام اعتراضات کا جواب مدلل طریقے سے دیا۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔ میں اپنے دوست عابد کاظمی کی سائیکل پر سوار اپنے کمرے کی جانب جا رہا تھا کہ ہمارے آگے آگے رکشے پر ایک نوجوان جا رہا تھا۔ عابد نے کہا اس شخص کی صورت ساحر لدھیانوی سے ملتی ہے۔ عابد کرکٹ کا مشہور کھلاڑی تھا ادب سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس نے سائیکل کی رفتار تیز کر دی اور رکشے سے آگے نکل کر اسے روک لیا۔ جناب ذرا نیچے اتریئے۔ وہ نوجوان حیران رہ گیا۔ 'آپ ساحر لدھیانوی ہیں۔' 'جی ہاں۔' کہاں جا رہے ہیں۔ 'فراق صاحب کے ہاں بنک اسٹریٹ پر۔' یہ دویندر اسر ہے، بڑی ترقی پسند شخص۔ یہ ان کے پاس ہی رہتا ہے اگر آپ چاہیں تو ان کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ اور پھر ساحر میرے کمرے کے پاس ہی تھا۔ اب آگے کی بات مدن دیکشت کی قلم سے۔ 'رات بھر چائے کے دور چلتے رہے۔ ہم لوگ ساحر بھائی کی مختلف نظموں کو لے کر بار بار انہیں کمرے میں کھڑا کرتے رہے اور ہر بار وہ اپنی کیفیت پیش کر کے باعزت بری ہو کر کمرے سے باہر آ کر کھڑے ہوتے رہے۔'

ایک دن میں 'مدن دیکشت'، برلیش چند چندولا اور برکھوند دیال پولیس جبر کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے گرفتار کر لئے گئے۔ اس کا بیان کرتے

ہوئے چندر صاحب لکھتے ہیں: 'اس پاگل کے ختم ہونے تک بیٹا لوگ جیل میں رہے اور پھر باہر نکل کر کچھ سال بعد جا کر کانگریس کی حمایت کرتے ہوئے بڑے بنیا' جج، سرکاری کمیشنوں اور اکادمیوں کے رکن یا صدر ہو گئے... مجھے فخر ہے کہ الہ آباد میں نئے آئے دیویندر دوسروں کی طرح ان جلوسوں سے بھاگے نہیں تھے .... آج پچاس سال بعد بھی میرے دل میں دیویندر اور ان کے لئے ان حد مقام ہے ہم تب بھاگے نہیں تھے۔ اور اب بھی شاید اپنی اپنی جگہوں پر ہیں۔ کہیں کہیں چھوٹی موٹی لڑائیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔" (وہ دن وہ باتیں۔ نقش اپریل 1997)

نئے سال 1990 کا پہلا دن صبح صبح نند کشور وکرم نئے سال کی مبارکباد دے کر بمشکل واپس گئے تھے کہ ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا۔ حال ہی میں اتر پردیش پرگتی شیل لیکھک سنگھ کی مجلس عاملہ کا ممبر چنا گیا تھا جس میں ہندی کے نامور ادیب پرکاش چندر گپتا، نروتم ناگر، امرت رائے اور رام ولاس شرما شامل تھے اور اردو کے عبدالعلیم، احتشام حسین اور آل احمد سرور تھے۔ رات کے سناٹے میں آواز گونج جاتی تھی۔ چنگا تالا، حق سب ٹھیک ہے۔ اور ساتھ ہی ایک اور آواز ساتھ والی بیرک سے۔ 'ظالم زمانہ مجھ کو تجھ سے چھڑا رہا ہے۔ انجام زندگی کا نزدیک آرہا ہے۔' اپنی کہانی 'آدمی پرندہ ہے' میں اس آواز والے نوجوان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا: میں نے محسوس کیا اُس کی آواز میں بڑا درد ہے۔ ایک رات وہ گا رہا تھا: لیا دری وچیں اللہ ہو دا آواز آوے ... وہ مستی کے عالم میں ڈوب کر گا رہا تھا۔ جب دوسری صبح ہم بیرک سے باہر آئے تو میں نے ایک نوجوان قیدی سے پوچھا یہ ہر روز گانا کون گاتا ہے؟ وہ بولا۔ صاحب میں گاتا ہوں... کس جرم میں یہاں آئے ہو؟ وہ بولا قتل میں۔ اس کے چہرے پر قاتل ہونے کا کوئی عکس نہیں تھا۔ کیا بات ہوئی تھی؟ وہی جو قصوں میں ہوتا ہے صاحب... اب جیل میں مجھے اس سے ملنے نہیں دیا جاتا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ رکا اور پھر بولا... اُچیاں کندھاں ڈھک نہ سکن پھلاں دی خوشبو۔ ارے تم تو بالکل صوفی نظر آتے ہو صاحب' کہانی کا صوفی سنت بس ایک قاتل مجرم قیدی ....''

اور پھر میں دلی چلا آیا۔ قرول باغ میں اجمل خاں روڈ پر ایک گلی میں اوپر کی منزل پر ایک دوست کے ساتھ ایک ٹی اسٹال میں چائے پی رہا تھا۔ وہ نوجوان ایک دوسری میز سے اُٹھ کر میرے سامنے آ کھڑے ہوئے 'آپ دیویندر اسر ہیں؟' جی ہاں... آپ نے کیسے پہچان لیا؟ 'شاہراہ میں آپ کی تصویر دیکھی تھی۔ ایک بولا۔ وہ دونوں ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ سوال کرنے والا سریندر پرکاش تھا اور دوسرا اطہر شوا تا ہمدرد جو راولپنڈی سے آیا تھا۔ راولپنڈی سے میرا بھی رشتہ تھا۔ میرے ننھیال گورڈن کالج روڈ پر رہتے تھے۔ فوراً دوستی ہو گئی۔ میں نے ہندی میں اپنے پہلے افسانوی مجموعے کا انتساب سریندر پرکاش کے نام کیا تھا.... اُس میں اُس کی زندگی پر مبنی ایک افسانہ بھی شامل تھا۔ سریندر پرکاش نے اپنی خود نوشت میں ایک باب میرے اور اپنے باہمی تعلقات کے لئے وقف کر دیا تھا۔

آصف فرخی کو دیے گئے اپنے انٹرویو میں اُس نے لکھا ہے:

دیویندر اسر نے میرے ذہنی ارتقا میں بہت بامعنی رول ادا کیا ہے۔ اس بات کا اعتراف میں نے مشہور افسانہ نگار و نقاد آصف فرخی سے اپنے انٹرویو میں بھی کیا ہے جب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ مجھ میں جو تبدیلی آئی اُس کا سلسلہ کس کو جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ "دیویندر اسر سے ایک دفعہ ملاقات ہوئی۔ مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے ایک شخص کا نام لیا۔ انتظار حسین۔ میں نے اُس وقت تک انتظار حسین کا کوئی افسانہ نہیں پڑھا تھا۔ اور میں بھی دراصل افسانے لکھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ ایک عجیب و غریب قسم کی زندگی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میرا لکھنے پڑھنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسے کوئی بارہ چودہ برس گزار کر دلی پہنچا تھا۔ تو میں نے ان سے سوال کیا تھا کہ کون لوگ لکھ رہے ہیں۔ کیا ہو رہا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ بھئی ایک انتظار صاحب لکھ رہے ہیں اور ان کے افسانے بہت مختلف ہیں۔ ترقی پسند وغیرہ تو ان کے بہت خلاف ہیں۔ لیکن مجھے بہت پسند ہیں ان کے افسانے۔ تب میں نے ان سے لے کر کچھ افسانے پڑھے انتظار حسین کے۔ تو مجھے واقعی محسوس ہوا کہ یہ مختلف افسانے ہیں اور جو ان کے لکھنے کا اسلوب تھا، سوچنے کا اسلوب تھا، جو بات کہنے کا اسلوب تھا، اُسے میں نے بہت کچھ اندر رچانے بسانے کی کوشش کی۔ تو اس کے دو چار برس بعد پھر میں نے لکھنا شروع کیا۔" آصف فرخی کو دیے گئے ایک انٹرویو کا اقتباس۔ (شب خون الہ آباد۔ اپریل مئی 1994)

اپنی خود نوشت مضمون میں ایک جگہ سریندر پرکاش رقم طراز ہیں:

میں نے دیویندر اسر کو جتنا دیکھا، جتنا برتا، جتنا محسوس کیا۔ اس کی زندگی بالکل سپاٹ اور سیدھی سادی ہے۔ کوئی اتار چڑھاؤ نہیں۔ کوئی ایڈونچر نہیں .... اس کا باعث یہ ہے کہ دیویندر اسر نے اپنی خوشیاں اور غم بھی کسی کے ساتھ بانٹے نہیں۔ دیویندر اسر کے اندر کتنے طوفان اُٹھتے رہیں ہوں گے۔ کسی کو کوئی علم نہیں .... انہوں نے جو کچھ بھی کیا اپنے اندر رکھا۔ اسے کبھی ظاہر ہونے نہیں دیا۔

قریب آدھی رات کا وقت تھا جب میں نیویارک سے اتھیکا ہوائی اڈے پر اترا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایک بینر اٹھائے ہوئے تھی جس پر دو تین نام لکھے ہوئے تھے۔ وہ کارنل یونیورسٹی سے آئی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا اور کہا کہ مجھے بھی کارنل یونیورسٹی جانا ہے۔ حالانکہ میں نے اس کی اطلاع بھجوا دی تھی لیکن اس کے پاس اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ لیکن اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ ایک صاحب نے میرا اٹیچی اٹھا لیا۔ میں نے سوچا شاید یونیورسٹی کا ڈرائیور ہوگا۔ جب میں اُس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور باتیں ہونے لگیں تو اُس نے بتایا کہ وہ یونیورسٹی میں نفسیات کا پروفیسر ہے۔ میں حیران تو ہوا ہی پریشان بھی ہوا۔ انہوں نے رات ایک کمرے میں ٹھہرا دیا۔ کمرے میں نوجوان لڑکے لڑکیاں کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ اور کچھ سرگوشیوں میں محو گفتگو تھے۔ اس ایک رات میں میں نے جیسے سارا امریکہ دیکھ لیا۔ یہ ساتویں دہے کا دور تھا لیکن یہ لوگ ابھی

بھی گذشتہ دہے کے جوش و خروش سے بھرپور تھے۔ یہ دور بھی انتہائی ہنگامہ خیز تھا
اس کا اندازہ مجھے چند روز میں ہی ہو گیا۔ لبریشن تحریکوں کا شور ختم نہیں ہوا تھا۔ جنسی
انقلاب نئی اخلاقیات، نسوانی لبریشن۔ اسٹوڈنٹ ریوولٹ، بلیک ریولیوشن، ہپی
... ہپی .... فلاور چلڈرن۔ سوسنت کا فری اسپیچ۔ بیس اور وار گیمز۔ بلاک
پارٹیاں اور مظاہرے۔ اسٹریٹ تھیٹر۔ پاپ اور راک میوزک۔ نکسن کا زوال، نہ
جانے کتنے تجربے ہو رہے۔ یہ شہر جھیلوں، پارکوں اور پہاڑیوں کا شہر تھا۔ خوبصورت،
کشادہ، تازہ ہواؤں اور نئی تصویروں کا شہر۔ یونیورسٹی تو تحریکوں کا مرکز تھی۔ لیکن
ہنگامے کالج ٹاؤن میں بھی کم نہیں ہوتے تھے جہاں میں رہتا تھا۔ اور جہاں
لا پرنسس کو لے کر ہم نے پرزور احتجاج کیا تھا۔ یہ پہلا تجربہ تھا لیکن مقامی ریڈیو،
ٹیلی ویژن، اخبار ہماری خبروں سے بھرے رہتے تھے۔ کس طرح طلبا اس میں
شریک ہوتے تھے۔ کس طرح یہاں کی انتظامیہ ہماری پشت پناہی کر رہی تھی۔ اور
تین دن میں ہی لا پرنسس کی صورت ہی بدل گئی۔

ایک بار ہم واٹر گیٹ پلازا کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ ایک
امریکی دوست نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ جو نکسن کی قبر
ہے۔ اس پہلی رات ہوٹل کے کمرے میں بسر کی ہوئی وہ اکیلی شب وسعت اختیار
کر چکی تھی۔ اس کے ان گنت پہلوؤں کو دیکھنے، پرکھنے، سمجھنے کا موقع ملا۔ جن
مکانات اور لوگوں کے بارے میں رسالوں اور کتابوں میں پڑھتے تھے۔ ان کو
قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ یہ ایسا احساس تھا جس کا تصور تو شاید کیا جا
سکتا ہے کیونکہ میرا اپارٹمنٹ کیپیٹل کیمپس آفس تھا اس لئے اور زیادہ ایکسپوژر ہوتا
ناگزیر تھا۔ اور یہ یونیورسٹی بھی اتنا مشہور ادیب، دانشور، ریڈیکل ایکٹوسٹ آتے
رہتے تھے۔ دماغ کی کھڑکیاں کھلتی جاتی تھیں۔ اسی زمانے فرانس، اٹلی، ڈنمارک،
جرمنی، سوئٹزرلینڈ، کینیڈا، انگلینڈ، میں گھوم لیا۔ میرا ادبی پیراڈائم شفٹ ہو گیا۔
اس کا انجام اتنا خطرناک ہوگا معلوم نہیں تھا۔ مجھ حیرت ہوں دنیا کیا سے کیا ہو
جائے گی۔

یہ احساس کبھی کبھی مایوسی کے چکرویو میں بند کر دیتا ہے جس کے
اندر انسان داخل تو ہو جاتا ہے باہر نکلنے کا راستہ معلوم نہیں۔ "گریزاد کیفیات
کے فسانے" میں ساجدہ زیدی کے الفاظ یاد آتے ہیں: ایک بار دوران گفتگو
دیویندر اسر نے اپنے بارے میں یہ جملہ کہہ کر مجھے چونکا دیا۔ میں پچھلے پچیس تیس
سال سے ایک ہی فسانہ لکھ رہا ہوں۔" یہاں کے مضمون کا سب سے پہلا جملہ تھا
اور آخری کہانی لکھے ہوئے مجھے سات ساڑھے سات سال ہو چکے ہیں۔ ذہن
اس قدر بکھرا ہوا بے سمت ہو جائے گا۔ اس کا کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ دل کی دنیا اتنی
سنسان ہو جائے گی کہ نام آوری سے میرا لگاؤ ختم ہو جائے گا۔ جب ہندی میں
میرا افسانوی مجموعہ 'آدمی پرندہ ہے' شائع ہوا تو اس پر تبصرے کا اولین فقرہ ہی یہ
تھا۔ بہت کوشش کرنے پر بھی عام قاری ان کہانیوں سے اپنے کو جوڑ نہیں پاتا۔"
ایک کہانی کے بارے میں ہندی رسالے کے مدیر نے لکھا اگر کہانی کے بارے میں
ایک مختصر نوٹ بھیج دیں تو ہمارے قارئین کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔" اور جس آخری
کہانی کا میں نے ذکر کیا ہے اس کے بارے میں اسی مدیر نے لکھا کہ یہ کہانی
ہمارے قارئین کو سمجھ نہیں آئے گی۔ بیشتر .... "مجھے اس بات کا افسوس نہیں لیکن
ملال ضرور ہے کہ کہانی مکمل ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی .... آج سے قریب ساٹھ
برس قبل پروفیسر محمد حسن کے الفاظ یاد آتے ہیں جو انہوں نے میری اولین کہانی
پڑھ کر کہے تھے! فرد، اشیا اور افکار کو دیکھنے اور پرکھنے کا کوئی ایک طریقہ نہیں ہوتا۔
اور نہ ہی اظہار کا کوئی ایک پیکر۔ کسی دوسرے کے خیال اور اسلوب کی پیروی نہ
کرو۔ ہمیشہ اپ سے شروع کرنے کی کوشش کرو لیکن سب سے اہم بات انہوں
نے یہ کہی۔ عظیم ادیب بننے سے بہتر ہوتا ہے اچھا ادیب بننا۔"

شاید یہی تخلیق کے عمل کو ایک خطرناک عمل بنا دیتا ہے

یہ دلّی ہے میری جان آدھی سے زیادہ صدی اس شہر میں بیت گئی۔
اتنی طویل زندگی سے گذرنا داستان در داستان سے گذرنے کے مترادف ہے
لوگ جو بھی کہیں کہ یہ شہر عیاش پاسیوں کا بسیرا بنتا جا رہا ہے لیکن یہ شہر پیار پر
مر مٹنے والی محبتوں کا مرکز بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میں تھوڑا بہت ہو یا زیادہ
گمنام شخص ہوں۔ کسی نے لکھا ہے کہ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک
جن کا بایو ڈاٹا ہوتا ہے۔ اور دوسرے وہ جن کا کوئی بایو ڈاٹا نہیں ہوتا۔ جن کا کوئی
بایو ڈاٹا نہیں ہوتا ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ کیونکہ میرا کوئی بایو ڈاٹا نہیں لہٰذا میرا کوئی
وجود نہیں۔ میر قزلباش کا ایک شعر ہے:

تم راہ میں چپ چاپ کھڑے ہو تو گئے ہو
کس کس کو بتاؤ گے کہ گھر کیوں نہیں جاتے

دل کا نگر ایک بار آباد ہوتا ہے۔ یہ ایسی بستی ہے جو بستے بستے بستی
ہے۔ یہ ایسا شیشہ ہے جو ٹوٹ جائے تو اس کا مسیحا کوئی نہیں ہوتا۔ آج جب یہ
سطریں لکھ رہا ہوں تو ساحر کا ایک شعر زیر لب گنگنا رہا ہوں۔ ٹوٹا طلسم عہد محبت
کچھ اس طرح اہم زندگی میں وہ کوئی وہاں نہ کر سکے۔ پھر ایک ارمان تھا۔ سوچا
تھا خوشبو بن کے لوٹیں گے۔ لوٹے ضرور لیکن خوشبو بن کر نہیں۔ آشفتہ چنگیزی نے
اپنا شعری مجموعہ 'شہر گماں' خوشبو بن کر لوٹیں گے کی ان سطروں کے ساتھ بھیجا تھا۔ ہر
بار زندگی سے ہمارا سامنا ایسے ہوتا ہے جیسے پہلی بار اس سے ملاقات ہوتی ہو۔
ایسے جزیرے میں داخل ہوتے ہیں جہاں کوئی پگڈنڈی نہیں اور جو بھی اس میں
ایک بار داخل ہوا واپس نہیں آیا۔ آشفتہ بھی نہیں واپس آئے۔ اس شہر گماں میں
کہاں کھو گئے ہیں معلوم نہیں۔ لیکن آخری دعا کے طور پر یہ شعر چھوڑ گئے!

خواب جتنے دیکھنے ہیں آج سارے دیکھ لے
کیا بھروسہ کل کہاں پاگل ہوا لے جائے گی

کسی نے کہا ہے دن گئی لے آخری خواہش کیا ہے۔ جس نے ہاجرہ
ناز لی (جن کی وفات کو کچھ ہی عرصہ بیتا ہے) کی یہ سطر دہرا دی۔ 'آنکھ بند ہو اور
آدمی فسانہ ہو جائے'

براہِ راست

تیسری دنیا بالخصوص انڈو پاک برِ صغیر کی جانب سے اپنے محسن، مہربان، ناقد اور مؤرخ کی بابت بے بہری اور بے مروتی کے الزامات تو ہم سے لگا کرتے ہیں یا جناب تنزکشور وکرم کے بقول اگر اردو دنیا جناب دیویندر اِسّر کو فراموش کر چکی ہے تو اُس نے درحقیقت یا دانستہ اپنے ہاتھوں بڑا بھاری نقصان اٹھانے کے باوجود قدرت کی جانب سے عطا کردہ مہلت اور سہولت کو پوری طرح ضائع نہیں کیا ہے، غلطی اور غفلت کا ازالہ ابھی بھی ہماری دسترس میں ہے۔ جناب دیویندر اِسّر جیسا دانشور، ادیب، نقاد، مفکر اور مدبر برسوں نہیں صدیوں میں پیدا ہوا کرتے ہیں اور دیویندر اِسّر صاحب کی شخصی میں ایک نہیں ہو دو صدیاں مقید ہیں!! آیئے زیرِ نظر قرطاسِ اعزاز کے ذریعے بڑی زبان کے بڑے قلمکار کو ہم قلم و ہم آواز ہو کر خراجِ تحسین پیش کریں......!!!

گلزار جاوید

☆ ڈاکٹر اجمل صاحب نے کن اسباب کی بنا پر آپ کو افسانہ لکھنے پر مائل کیا اور بعد میں کالج میگزین میں مضامین کی تحریک اور طرز کے تھے اور اُن کا کس طرح نوٹس لیا گیا؟

☆☆ اس سوال کے چار اجزا ہیں۔ ۱۔اجمل صاحب کو نمبر ایک ۲۔کالج میگزین میں شائع مضامین کی نوعیت اور طرز۔ ۳۔ان مضامین کی تحریک اور ۴۔ان مضامین کا نوٹس۔

۱۔ میری ادبی پیدائش اور پرورش میں اہم ترین رول پروفیسر محمد اجمل صاحب کا رہا ہے۔ وہ یوں تو فلسفے کے استاد تھے (جو میرا ایک مضمون تھا) لیکن وہ انگریزی، فرانسیسی، روسی اور اُردو ادب کے ادیبوں اور رجحانات کے بارے میں اکثر ہمیں کچھ نہ کچھ بتاتے رہتے تھے۔ پڑھنے کا شوق بہت شوق تو پہلے سے ہی تھا ان کی باتوں سے اس کو مزید جلا ملی۔ اجمل صاحب کے علم اور ان کی دلچسپی کے موضوعات کی کوئی بندش نہیں تھی اور نہ ہی کوئی حد۔ وہ بار بار ہمیں ترغیب دیتے تھے کہ ہم کچھ نہ کچھ لکھیں۔ لکھنے کی صلاحیت تو تھی کہ نہیں۔ پھر بھی میں نے پہلا افسانہ اُن ہی کے کہنے پر لکھا اور فرائیڈے کلب میں پڑھا۔ انہوں نے کہا اچھا ہے۔ جس مکان میں میں رہتا تھا اُس سے دو مکان چھوڑ کر وہ رہتے تھے۔ رات کو سیر کے دوران انہوں نے یوں ہی پوچھ لیا کہ اس کہانی کا کیا ہوا؟ میں خاموش رہا۔ پھر بولے۔ اچھا کل گھر آنا۔ کھانا ہمارے ساتھ ہی کھانا۔ گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ اس کہانی کو دوسری طرح سے بھی لکھا جا سکتا ہے۔ میں نے پوچھا کیسے؟ انہوں نے کئی نکتے بتائے۔ گھر آ کر میں نے اس افسانے کو تین چار بار مختلف طور پر لکھا۔ وہ سب ڈرافٹ انہیں دے دیے۔ انہوں نے ایک ڈرافٹ اپنے پاس رکھ لیا۔ میں نے کہا کہ پہلے ڈرافٹ کے بارے میں آپ نے کہا تھا اچھا ہے۔ ہاں۔ لیکن یہ بہتر ہے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر بولے۔ پہلا افسانہ تم نے دوسرے ادیبوں کی طرز پر لکھنے کی کوشش کی تھی۔ اور یہ وہ ہے جیسا کہ تمہیں لکھنا چاہیے۔ اور کہا کہ بڑا ادیب بننے سے الگ ادیب بننا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ میں نے جب دوسری کہانی لکھی تو سوچا کہ اسے کسی دوسرے درجے کے رسالے میں بھیج دیا جائے۔ اس میں شائع ہونے کے زیادہ امکانات ہیں۔ اجمل صاحب نے کہا کہ ساقی کو بھجوا دو۔ میں نے کہا کہ ساقی تو بڑا رسالہ ہے۔ اُس میں نامور ادیب لکھتے ہیں۔ وہ بولے۔ دیر از آلودہ رسالے نوم بہت دیر تاپ۔ کہانی ساقی کو بھجوا دی۔ اسی دوران ملک تقسیم ہو گیا۔ میں دلی پہنچ گیا۔ دلی اسٹیشن پر ساقی دیکھا۔ افسانہ اُس میں شائع ہوا تھا۔ یہ ساقی کا افسانہ نمبر تھا۔ پہلا افسانہ اجمل صاحب کی وساطت سے ہی لاہور کے پرچے نسوانی دنیا، اگست 1946 میں شائع ہوا تھا اور یہ دوسرا افسانہ آزادانہ طور پر ایک سال بعد شائع ہوا۔ یہ تھی اجمل صاحب کی جادوئی شخصیت جس نے ایک عام طالب علم کو ادیب بنا دیا۔ میں ہی نہیں بلکہ طلبا کا ایک پورا گروہ اُن سے متاثر تھا۔

میں یہاں ڈاکٹر غلام جیلانی برق صاحب کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ فارسی اور اُردو کے اُستاد تھے لیکن ذہن فلسفی کا پایا تھا اور رجحان صوفیانہ تھا۔ کتاب پڑھنے کا طریقہ اور سلیقہ اُن ہی سے سیکھا تھا۔ یہ وہی ڈاکٹر برق تھے جنہوں نے 'دو قرآن' لکھی تھی اور بغاوت کیا کوئی دوسرے قرآن کا جواب دیا تھا۔ بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ لیکن ان کے قدم ذرا بھی نہیں ڈگمگائے۔ ایسی شخصیتیں اب تو تاریخ کے صفحات پر ہی نظر آتی ہیں۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جنہوں نے ہماری ذہنی پرورش میں اہم رول ادا کیا تھا اور ان میں شامل تھے پروفیسر صدیق کلیم صاحب بھی۔ ہمارے انگریزی کے اُستاد۔

یہ بڑا ہی عجیب و غریب دور تھا۔ جب ہم منٹو، کرشن چندر، عصمت اور بیدی کی کہانیاں لکھے جانے کے فوراً بعد رسالوں میں پڑھ رہے تھے۔ ہم جوش سال تھے۔ آزادی کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ایسے ہنگامہ خیز دور میں ذہن اور جسم کی بیداری کیا قیامت برپا کر سکتی ہے۔

۲+۳ کالج کی میگزین 'مشعل' لائل پور میں جو مضامین لکھے وہ اُردو، ہندی اور انگریزی میں تھے اور مختلف موضوعات پر تھے۔ جیسا کہ کچھ ادب کے بارے میں، کچھ ٹیگور کے بارے میں، ٹیپو سلطان، انسانی زندگی کے معمارِ اعظم (حضرت محمدؐ) اور منٹو ایک سماجی مزاح۔ اس مضمون کو میں نے میگزین کے طالب علم ایڈیٹر میاں نظام الدین کے نام معنون کیا تھا۔ انہیں منٹو سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ احمد ندیم قاسمی کے دلدادہ تھے اور میں منٹو کا۔ شاید قاسمی صاحب بھی اسی کالج

میں پڑھے تھے۔

یہاں دو باتوں کا ذکر برمحل ہوگا۔ تقسیم کے بعد ایک خط موصول ہوا جناب شیخ محمد ملک صاحب کا کہ وہ اس کالج کی میگزین کا ایک خاص نمبر شائع کر رہے ہیں۔ میں اس خاص نمبر (1957) کے لئے کچھ لکھوں..... میں نے اپنا مضمون 'دل کی بستی' بھجوا دیا جو اس شہر کیمبل پور (حال اٹک) کی یادوں پر مشتمل تھا۔ بعد میں اس میگزین کا گولڈن جوبلی نمبر شائع ہوا جسے مرزا حامد بیگ صاحب نے ایڈٹ کیا تھا۔ اس میں میرے تین تبصرے دیگر تفصیلات کے ساتھ شائع ہوئے تھے۔

۴۔ جہاں تک کالج کی میگزین میں شائع ہونے والی تحریروں کے نوٹس لینے کا سوال ہے تو طالب علموں میں نوٹس تو لیا ہی جاتا ہے۔ بالخصوص ایک ایسے شہر میں جہاں ادبی سرگرمیاں زیادہ نہ ہوں اس امر کے باوجود کہ ہم ایک پبلک لائبریری اور ریڈنگ روم چلاتے تھے جس میں دو درجن سے زائد رسالے منگوائے جاتے تھے جن سے لوگ مستفید ہوتے تھے اور اسی شہر میں ہم نے ایک تختہ لگا کر گاؤں کے کنارے بیچنے والے کے ہاں ادبی کتابیں رکھوانا اور بکوانا بھی شروع کر دیا تھا۔ اسی کالج میگزین میں ڈاکٹر برق صاحب نے منظور الٰہی کے مضامین کے بارے میں اپنے اداریے میں لکھا تھا کہ اگر یہ مضمون اور بجنل ہے تو میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ ایک دن یہ نوجوان ہندوستان کے اہم ادیبوں میں شامل ہوگا (الفاظ اب پوری طرح یاد نہیں)۔ اس سوال کا جواب قدرے تفصیل سے دیا گیا ہے کہ اس کے جواب میں لکھنے کی ترغیب اور نوعیت اور ماحول پر روشنی پڑتی ہے۔

☆ بحیثیت ترقی پسند مصنفین کی اکثریت نعرہ زنی کا شکار تھی۔ آپ اپنی شخصیت اور فن پر اس کے اثرات کس طرح محسوس کرتے ہیں۔

☆☆ شروع شروع میں جب میں نے لکھنا سیکھا تو مارکسیت، اشتراکیت اور سوویت یونین کے گہرے اثرات مجھ پر غالب تھے۔ کالج میگزین میں بھی میں نے مدوا (فرقت کاکوروی) پر چار دھانسو مضمون لکھا تھا۔ میرا پہلا مضمون بھی آرٹ کا سائنٹیفک نظریہ (قاہرہ نگی) ۲۲ نومبر ۱۹۳۶ء ادب اور فن کے مارکسی نظریہ کا ہی حامل تھا۔ انجمن کی لیجسلیٹری کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ جب 'مسلسل انقلاب' کا نعرہ گونج رہا تھا اور اتر پردیش میں بھی انجمن کی مرکزی کمیٹی کا رکن بھی رہا جس میں احتشام حسین، ڈاکٹر علیم وغیرہ شامل تھے۔ یعنی انجمن اور پارٹی کا فعال کارکن تھا۔ لیکن پانچ سات سال میں ہی ذہن میں سوالات اور شکوک پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ ترقی پسند اور اشتراکیت کا 'خدا' ناکام ہوتا نظر آنے لگا (اشارہ گوٹ فریٹ لیلنڈ کے ادیبوں کی جانب)۔ یہاں اس بات کا ذکر برمحل ہوگا کہ رسالہ ہند (مدیر امرت رائے) پر پابندی کے احکام جاری کئے گئے اس میں میری کہانی کٹی کا ذکر بھی کیا گیا۔ افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، ملک راج آنند اور ایسے کئی افسانے شامل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت سے ہی نہیں بلکہ ہر قسم کی سیاست سے بھی میری بیزاری بڑھتی گئی میں ہر نوعیت کے بند نظریات اور اقتدار کی سیاست کی مخالفت کرتا ہوں کیونکہ سیاست فرد کو Manipulate اور Mutilate اور Manage کرتی ہے۔ یہ چاہے سیاسی ہو یا معاشی، مذہبی یا ذات برادری کی میں اس کی تائید نہیں کرتا۔ میں نے پایا کہ سیاسی مفاد کے لئے استعمال مقصد بھی وہ جو ذری عارضی گروہی یا کسی مخصوص شخص کے مفادات یا اقتدار حاصل کرنے کی غرض سے ہو وہ غلط اور غیر اخلاقی ہے۔ جب ادب سیاست کا وسیلہ بن جاتا ہے تو وہ اپنی تخلیقی توانائی کھو دیتا ہے آخر ادیب کی تخلیقی توانائی بھی تو ہے کہ یہ ہمارے احساس جمال کی تسکین کا باعث بنتا ہے۔

امرا ءحیات کی نقاب کشائی کرتا ہے اسے عموی اور men jane سطح سے اوپر اٹھاتا ہے اور اسے نئے اخلاقی اور انسانی لینڈ اسکیپ پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادیب کا سماج سے کوئی تعلق یا سروکار نہیں لیکن حقیقت کہ کامریڈ پارٹی میں تقسیم ہونے پر انجمن میں تقسیم ہو جانا مجھے سماجی فریضے کے طور پر اپیل نہیں کرتا۔

☆ ترقی پسند تحریک کی مزعومہ اغلاط کی طرف اشارہ کیجئے جن کی بنا پر آپ نے علیحدگی اختیار کی اگر ترقی پسند تحریک آپ کی نشان زدہ غلطیاں نہ کرتی تو اس کا پیش منظر میں کیا رول ہوتا۔

☆☆ ترقی پسند تحریک سے علیحدگی کی جانب میں اشارہ کر چکا ہوں۔ بنیادی طور پر یہ اختلاف تخلیقی اور اخلاقی اقتدار کے باعث تھا جب کوئی تحریک اقتدار کی جنگ میں شرکت کے باعث سیاسی وابستگی کا شکار ہو جاتی ہے تو میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔ مجھے یہاں آشوز ایک کی بات یاد آرہی ہے اس نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ میرے دادا نے کہا تھا کہ اگر تم اس عذاب گاہ سے زندہ بچ نکلے تو سب کچھ سچ سچ کہہ دینا۔ جبر کی فلسفیانہ نظریہ کے قتل قتل ہے جب ایک بہتر دنیا کے لیے جدوجہد ضروری ہے لیکن اس جدوجہد کے اندر ایک دوسری طویل مدت تک چلنے والی جدوجہد بھی ضروری ہے اور یہ دوسری جدوجہد گہری انسانی اقدار کی فکر کرنے والے افراد اور دوسروں کے درمیان ہوتی ہے جو فوری سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک قتل اور دوسرے قتل میں فرق کرتے ہیں۔ اشتراکیت ہو یا فسطائیت، آمریت ہو یا مذہبیت یہ سب بند دنیا ئیں ہیں اور بند دنیاؤں میں سوال پیدا نہیں ہوتے بلکہ بنے بنائے جوابات ہوتے ہیں۔ ایسی دنیاؤں میں تخلیقی ادب کے لئے کوئی اسپیس نہیں لہٰذا نظریے کے ہونے یا نہ ہونے کے باعث کوئی تخلیق اچھی یا بری نہیں ہوتی بلکہ اس فنی نظم کے ہونے کے باعث ہوتی ہے جو کسی 'حقیقت' کو تخلیق بنا دیتا ہے۔ یوں تو ہر دور میں کوئی نہ کوئی غالب فکری اور ادبی رجحان ہوتا ہے جس سے اس دور کے ادیب اور

دانشور متاثر ہوتے ہیں اور جس کی جھلک ان کی تخلیقات اور تحریروں میں ملتی ہے لیکن ہمارے دور میں نظریاتی بحث نے کافی اہمیت حاصل کر لی ہے جس کے باعث ادب اور فن میں نظریے کے سوال پر بار بار بحث کی جاتی ہے۔ نظریے کے خاتمے کے اعلان کے بعد اب جمہوری کے زوال کا نعرہ بھی بلند کر دیا گیا ہے۔ آپ کے سوال کے دوسرے حصے پر میں کوئی گفتگو نہیں کر سکتا اس لیے نہیں کہ یہ ایک 'مفروضہ' ہے بلکہ اس لیے کہ اگر جامد نظریے اور سیاسی وابستگی کو خارج کر دیا جائے تو پھر ترقی پسند تحریک یا کسی بھی تحریک کا کوئی جواز ہی نہیں رہ جائے گا۔

☆ کلچرل فورم کا قیام کن مقاصد کے تحت ہوا اور اس سے کس طرح کے نتائج حاصل ہوئے۔

☆☆ کلچرل فورم کا قیام ایک بڑا ہی خوش کن اور حیرت انگیز تجربہ ثابت ہوا جو کہ پانچ برس تک جاری رہا۔ ہر اتوار کو اس کی نشست ہوتی تھی۔ بارش ہوا آندھی طوفان ایک نشست بھی miss نہیں ہوئی۔ اس کے صدر جناب پریم ناتھ در تھے جو حلقہ ارباب ذوق سے تعلق رکھتے تھے میں اس کے سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ اس میں شرکت کرنے والے مختلف مکتبہ ہائے فکر کے ادیب تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے لکھنا ہی کلچرل فورم سے شروع کیا اور بعد میں وہ صف اول کے ادیب ثابت ہوئے ذرا ان ناموں پر طائرانہ نظر ڈالیئے۔ برج ورما، کرشن بلدیو، بھیشم ساہنی، سریندر پرکاش، وشوا ناتھ درد، گوپی چند نارنگ، جگدیش چندر ودھاون، جے دیو، انجم (عالمی شہرت کے فنکار) کے ایم۔ راجندر راج، ابن ترنگی، کار رشا، ڈپٹی ناتھ درد، راج، اگنی راز، منموہن تلخ، نریندر رنگیل، دیویندر ستیارتھی، بیر بچن سنگھ، کرن کاشمیری وغیرہ۔ ان میں اُردو ہندی اور پنجابی کے ادیب شامل ہوتے تھے اور سننے والوں اور بحث و مباحثے میں حصہ لینے والوں کی تعداد لکھنے والوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ ان میں پانچ سات نام ایسے ہیں جنہوں نے ساہتیہ اکادمی کے انعام کے علاوہ کئی دوسرے انعام بھی حاصل کیے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے مختلف نظریوں اور عقیدوں کے لوگوں کے مابین مکالمے کی کیفیت قائم کی اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات کا ذکر ضروری ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے سیل میں اس میں شامل ہونے والے کمیونسٹ ادیبوں کو بار بار کہا جاتا تھا کہ اس پر غیر کمیونسٹوں کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے اور پھر ایک کمیونسٹ اخبار "ایشیا" کا کانگریس فار کلچرل فریڈم ایسے کمیونسٹوں کی آماجگاہ کہلاتا رہا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مکالمے کی جو صورت کلچرل فورم نے قائم کی تھی وہ بدقسمتی سے ناپید ہوتی جا رہی تھی۔ جس پرائیویٹ کالج میں اس کی نشستیں ہوتی تھیں اُسے میں چھوڑ چکا تھا اور کلچرل فورم درہم برہم ہو گیا۔ لیکن اس میں شرکت کرنے والوں کی فہرست پر نظر ڈالیں تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے بغیر ادب کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

☆ آپ کے خیال میں آرٹ، سماجی اور سائنسی علوم فلسفہ، نفسیات، اساطیر، تاریخ، مارکسزم، انتھروپولوجی، انفارمیشن ٹیکنالوجی نے آپ کے تخلیقی سفر میں معاونت کی یا خیالات کے انتشار کا باعث بنے۔

☆☆ ادب پر دوسرے علوم اور فنون اور نظریات کا اثر ناگزیر ہے۔ سائنس، فلسفہ اور دیگر انسانی علوم کے اثرات ادبی تخلیقات میں کسی نہ کسی صورت میں رونما ہوتے رہے ہیں۔ ادب فکر و نظر کی کشمکش کا میدان رہا ہے اُن کی مسلسل جانچ پڑتال کرتا رہا ہے یہ بات تخلیقی ادب کے مقابلے میں تنقیدی نظریات اور عملی تنقید میں نمایاں نظر آتی ہے جس کے باعث ادبی تنقید میں کئی طرح کے دبستان نمایاں ہوتے ہیں۔ ادب جس فکر و احساس کی ترجمانی کرتا ہے اس کے بارے میں یہ علوم بحث کرتے ہیں۔ ادب انسانی زندگی اور کائنات کے کسی نہ کسی پہلو کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے اور تمام علوم ان ہی مسائل کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ ادب انسانی ذہن، اقدار اور اقتدار کی کشمکش، ماحول اور معاشرے کی تہہ در تہہ پیچیدہ حرکیات کے بارے میں براہ راست مشاہدے کے ساتھ ساتھ ان علوم سے بھی آگاہی حاصل کرتا ہے۔ فلسفہ، سائنس، نفسیات اور سماجیات پر نظر ڈالیں تو کتنے ہی نام اور نظریات ہیں جو ادب پر اپنے اثرات کے باعث دہرائے جاتے ہیں۔ جینیت پرستی، اظہاریت، جدلیاتی مادیت، عملیت پرستی، تحلیل نفسی، علامت نگاری، ساختیات اور پس ساختیات، وجودیت وغیرہ ادب کی اساسی فکر اور پیرایہ اظہار میں شامل ہو چکے ہیں۔ ذہنی کیفیات، روحانی واردات، جنسی اور جذباتی رشتے، سماجی عوامل اور عناصر، اقدار، رویے، طرز عمل، حیات و موت کے مسائل ادب کے اہم موضوعات رہے ہیں۔ انسانی علوم بھی ان ہی مسائل کے روبرو ہوتے ہیں۔ اس لئے ادب پر ان کے اثرات پڑنا فطری ہے لیکن فکری ادب اور ادبی فکر میں فرق ضروری ہے یہی وہ مقام ہے جہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ادبی فکر جو ادیب کی اپنی اپج ہو بھی کوئی چیز ہے یعنی ایسی فکر جو ادبی تخلیقات سے ہی پیدا ہوتی ہو نہ کہ نظریات محض سے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادبی مطالعہ پہلے سے کہیں زیادہ بین العلومی ہو گیا ہے لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ بین العلومیت کے باعث ادب کی اتنی حصار بندی اس سے قبل کبھی نہیں ہوئی تھی لیکن ادب نے اپنی منفرد حیثیت، مکمل، تخلیقی اور تشکیلی قوت سے اپنے وجود اور "خود مختار مملکت" کو تسلیم کرانے اور خود اپنا جواز بننے کی اتنی جدوجہد بھی کبھی نہیں کی تھی۔ جس کے باعث انتشار کی سی صورت حال پیدا ہوتی نظر آتی۔ میرے خیال میں انتشار اور تخلیقی عمل کو دو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر کے دیکھنا صحیح نہیں۔ کیا انتشار (chaos) کے بغیر تخلیق ممکن ہے۔ چاہے معاملہ کائنات کا ہو یا فطرت کا یا ادب اور آرٹ کا انتشار ناگزیر ہے انتشار کے بطن سے ہی تنظیم اور تخلیق کا جنم ہوتا ہے۔

☆ پریم تخلیقی وحدت آپ کی ذات کا وصف گردانے والے کس چیز کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں۔

☆☆ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب میرے لئے انتہائی مشکل ہے۔ لہٰذا میں اپنی جانب سے کچھ نہ کہہ کر ہندی کے ایک معروف ادیب کے الفاظ دہرانا چاہتا ہوں: "خوشبو، رنگ اور آواز پکڑنے والے جتن کی حد تک پہنچا کرنے والے تخلیق کار دیویندر اِسر کی تمام تخلیقات میں ایک خاموشی اور سیلانی رجحان اور بالکل اکیلا پن موجود ہے..... ظاہر ہے دیویندر اِسر جسے کچھ میں نہ آنے والے ادیب کے تمام تخلیقی سرکاروں کو اتنی وضاحت، گہرائی اور گیرائی کی نظر سے دیکھنے کا وسیلہ ہندی تنقید کے لئے نہ تو سہل ہے اور نہ ہی جانا پہچانا۔ یہاں تک کہ دیویندر اِسر کی اوپر سے شانت دکھائی دیتی لیکن اندر بھاری پر شور دنیا سمیٹے اور انجام کار موت سے ہمکنار ہونے والے کرداروں کی پر اسرار دنیا سے جڑی دہریات اور تخیلات کو سہل بنا کے جن اصطلاحات میں ادیب کے تخلیقی سرچشمے کی مکمل باریک بینی کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے وہ اصطلاحات بھی ہم عصر ہندی تنقید کے لئے ایک دعوتی ہے۔ اس کی ساخت اور تشکیل بھی بالکل جدت طرازی کی حامل ہے..... جسے پریم چند کی روایت کے برعکس اگیے، ایلا چندر جوشی، نرمل ورما اور کرشن بلدیو وید جیسا سور ادیبوں نے دھار دی ہے۔ ظاہر ہے کہ دیویندر اِسر اس دوسری دھارا کے ایک سرکردہ ادیب ہیں۔ (روزنامہ مرٹ بجن ہندی ۲۴ جنوری ۱۹۹۸ء)

حالانکہ یہ بات ہندی کے حوالے سے کہی گئی ہے لیکن اس سے آپ کے سوال کا جواب کسی حد تک مل جائے گا۔

☆ مہابیانیہ سے انحراف کی ترکیب بھی ابہام پیدا کرتی ہے؟

☆☆ آخر مہابیانیہ سے مراد کیا ہے؟ نئی ادبی تھیوری نے کسی کے زوال کے تحت کلاسیکی ادب کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور مہابیانیہ کی اصطلاح مستعمل ہو گئی۔ اس سے ابہام پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس نسل، جنس، رنگ، طبقہ، مقامیت، تفریقات، شناخت، تشخص کی خصوصیات کی بنا پر ادبی تخلیق کی قدر و قیمت متعین کی جاتی ہے؟ سوال مہابیانیہ سے انحراف کا نہیں بلکہ اسے وسعت دینے کا ہے۔ ادب میں ابہام کی اپنی اہمیت ہے۔ اگر سب کچھ آئینہ سا صاف شفاف ہے تو اتنی تشریحات کی کیا ضرورت ہے۔ ایک جانب مہابیانیہ سے انحراف کی بات کی جاتی ہے اور دوسری جانب متن کی کثیر المعنویت کی دہائی دی جاتی ہے۔ کیا ابہام کے بغیر کثیر المعنویت ممکن ہے۔ اور سوال یہ بھی ہے کہ کیا نئی یا مہابیانیہ کی قبر پر رنگ برنگ پھول کھلائے جا سکتے ہیں؟ کوئی ایک شعریات یا تھیوری سارے ادب کو اپنے اندر سمیٹنے سے قاصر ہے۔ ہر تخلیقی فن پارے میں کئی آوازیں ہوتی ہیں۔ اس میں ہر کہانی کی صورت مسلسل پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ادب ذات سے لے کر کائنات اور ذاتی شعور سے لے کر سماجی حوالوں تک سب کو اپنا موضوع بناتا ہے اور اسے مختلف پیکر عطا کرتا ہے۔ اسی باعث تخلیق کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ ابہام ترسیل کی ناکامی کے باعث کم اور فہم و ادراک کی کمی کے باعث زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ مہابیانیہ سے انحراف تو مابعد جدیدیت کی رائج کی ادبی تھیوری کا محض ایک بیانیہ ہے۔ نئی ادبی تھیوری کے زوال کی داستان تو گذشتہ صدی کے خاتمہ سے قبل ہی لکھی جا چکی ہے۔

☆ بھارت جیسے لسانی، مذہبی، سیاسی، سماجی تفریقات والے ملک میں کائناتی تصور، فکر اور سائنس، فرد اور فطرت کی بات کیا سود مند ہوگی۔

☆☆ یقیناً سودمند ہوگی۔ تفریقات شاید صحیح اصطلاح نہیں۔ اس کے لئے Diversties کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ لوگوں کے عقیدے، ایمان، تہذیبیں، زبانیں، ثقافتیں، علاقے، قبیلے، رسم و رواج، روایات، نا رنگیں الگ الگ اور مختلف ہو سکتی ہیں لیکن اگر ان میں کائناتی تصور نہیں ہوگا تو وہ سیاہ اور سفید کے معاندانہ تشخص میں تقسیم ہو جائیں گے۔ دنیا کے عام فرد کی اولین ابتدائی فطرت کم و بیش ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ البتہ ثانوی فطرت اور اضافی اقدار ان کے ماحول اور معاشرے سے پرورش پاتی ہیں۔ اولین فطرت کائناتی تصور کی جانب لے جاتی ہے اور ثانوی فطرت ان کے تشخص کی غمازی کرتی ہے۔ ان میں تناسب اور توازن کی کمی آویزش کا باعث بن جاتی ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک کے فن پارے اور ان کی زبانوں کے ادب اسی کائناتی تصور کے باعث آفاقی نوعیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اپنے اپنے جداگانہ تشخص کے تحفظات کے باوجود ان میں یگانگت اور ہم رنگی پیدا ہوتی ہے۔ آخر کیا باعث ہے کہ ہومر، کالی داس، فردوسی، غالب، گوئٹے، شیکسپیئر اور عہد حاضر کے دوسرے ادیب دنیا بھر میں پڑھے جاتے ہیں ان تمام تر تفریقات اور تفرقات پر مبنی شناختوں کے باوجود جن کا ذکر آپ کے سوال میں کیا گیا ہے؟

☆ تمام تر انقلابی رویوں کے باوجود آپ کے ہاں زندگی سے فرار کے شواہد بھی دستیاب ہیں!

☆☆ آخر زندگی سے کیا مراد ہے۔ زندگی کا نہ تو کوئی ایک تصور ہے اور نہ ہی اسے بسر کرنے کا کوئی ایک طریقہ۔ فراریت پسند ادب کا ایک مقبول لفظ ہے جسے pejorative طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ سدھارتھ جب ایک مخصوص قسم کی زندگی سے فرار کر کے گھر سے نکلے تو بدھ بن کر لوٹے۔ کس نے کس سے فرار کیا۔ یہ معاملہ موضوعی ہے۔ یہاں میں رونالڈ ڈیوڈ لینگ جسے پاگلوں کا مسیحا کہا گیا ہے کی ایک بات سناتا ہوں۔ نفسیاتی مریض کون ہے؟ وہ تیرہ برس کی لڑکی جو کچھ ہوئے بغیر خالی دیوار دیکھتی رہتی ہے یا اس کے والدین جو گھنٹوں ٹی وی اسکرین پر نظر جمائے رہتے ہیں۔ لینگ نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ لڑکی اتنی دیر تک دیوار نہیں دیکھتی جتنی دیر تک اس کے والدین ٹی وی دیکھتے ہیں۔ لیکن انہیں اس لڑکی کے دیوار دیکھنے پر اعتراض ہے اپنے ٹی وی دیکھنے پر نہیں۔ یہ محض اپنی پسند کا سوال ہے۔ لڑکی کا دیوار دیکھنا ایک پرانا اور سادہ طریقہ ہے جو اُسے آس پاس کے ماحول سے الگ کر دیتی ہے۔ میں اسے وجدانی سمجھتا ہوں، میں

اپنے آپ کو اس معنی میں خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ جب 'انقلابی' ادیبوں نے 'زندگی سے فرار' لوگوں کے لئے اپنے دروازے بند کر لیے تو میں نے انھیں اپنے افسانوں میں اپنی گم شدہ پہچان' اپنے بسرے ہوئے ماضی' اپنی بھولی ہوئی یادوں۔ اپنی تشنہ آرزوؤں کی تلاش کے مواقع فراہم کیے۔ آخر کس کی زندگی 'مستند' ہے آج تو 'مادی' سائنس میں بھی 'روحانیت' کے پہلو تلاش کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ ادب تو پھر بھی خلاقانہ مسئلہ ہے۔

☆ آپ کے افسانوں کا راوی سایہ بن کر تاریکی کو شکل میں ڈھالتا رہتا ہے۔ آپ اس قدر ذہنی اور ماورائی پرچھائیوں کا تعاقب کیوں کرتے ہیں؟

☆☆ آخر آپ نے وہ سوال پوچھ ہی لیا جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔ میری ایک کہانی کا عنوان ہی یہ ہے 'پرچھائیوں کا تعاقب' پہلے شگفتہ چنگیزی کی ایک نظم 'پرچھائیاں پکڑنے والے' کی یہ سطریں دیکھئے: "دھندلے جگمگاتے ہوئے شہر کی بتیاں/ ابجد کرتی ہوئی کہکشاں/ خوبصورت خلاؤں کی پھرتی ہوئی ٹولیاں/ میا لگتا ہے سب/ ایک مدت سے پرچھائیوں کو پکڑنے میں مصروف ہیں۔"

جب آپ کسی کردار کے چہرے مہرے افعال اور اس کی حرکات و سکنات کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں کوئی دشواری نہیں ہوتی لیکن جب آپ ان کے پیچھے حرکت پذیر محرکات اور اس میں متحرک مختلف "شخصیات" کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو یہ ناممکن تو نہیں دشوار ضرور ہو جاتا ہے۔ میں اس زندگی کا ذکر نہیں کرتا جو ہم جی رہے ہیں بلکہ اس زندگی کا ذکر کرتا ہوں جو ہم سے بچ کر نکل گئی ہے! جس کی حسرت لئے ہوئے تمام زندگی گذار دیتے ہیں۔ یہ دوسری زندگی ہماری پرچھائیں ہوتی ہے جو بظاہر فریب نظر معلوم ہوتی ہے لیکن جو در اصل 'حقیقت منتظر' ہے جو ادب کے لباس مجاز میں ظاہر ہونے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ ہم اس دنیا میں جہاں ابھی اندھیرا ہے دھند ہے کوئی ٹھوس یا واضح شکل نہیں سب کچھ پرچھائیں سا ہے۔ جس میں ہم داخل نہیں ہوئے یا داخل ہونے سے ڈرتے ہیں یا ضرورت نہیں سمجھتے یا جرأت اور ہمت کا ثبوت نہیں دیتے جس میں کوئی تجربہ یا کیا اس کا نہیں دیتا جہاں ہمارا تجربہ بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ کو کیسے بیان کریں گے۔ ادب محض جانی پہچانی دنیا کا آئینہ نہیں بلکہ اس دنیا سے defamiliarize کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسے آپ پرچھائیوں کا تعاقب کہیں یا انجانی دنیاؤں کی تلاش معاملہ اپنی اپنی پسند کا ہے۔

☆ آپ کے خیال میں کہانی کے لئے تمثالی اور بیانیہ ڈسکورس کا تناسب کس طرح ہونا چاہئے؟

☆☆ میرے ذہن میں ایسا کوئی فارمولا نہیں جس کے تحت ان کے تناسب کا تعین کیا جائے۔ ادب میں ایسی تحریریں بھی موجود ہیں جن میں تمثالی تو موجود ہے لیکن بیانیہ ڈسکورس نہیں یا اس کے برعکس یہ ادیب کی تخلیقی ضرورت اور حیثیت پر منحصر کرتا ہے کہ وہ ان تصورات کو کیسے اپنے ادب میں شامل کرتا ہے۔ میرا رجحان بیانیہ ڈسکورس کے بجائے تمثالی کی جانب زیادہ ہے۔

☆ ایک مدت سے اُردو افسانے میں چار ستون منٹو کرشن' بیدی اور عصمت تصور کئے جاتے رہے ہیں جب کہ آپ عصمت کو پانچویں اور اپندر ناتھ اشک کو چوتھے نمبر پر رکھتے ہیں اگر آپ کی ترتیب درست مان لی جائے تو چھٹے ساتویں اور آٹھویں نمبر کے ساتھ آپ کے اپنے نمبر کی بابت بھی فیصلہ آپ کی زبانی ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔

☆☆ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی ایسی درجہ بندی کی ہے۔ یہ سب اپنے دور کے انتہائی تخلیقی ذہن تھے۔ اور اب بھی ان کا شمار اردو افسانے کے سنہری دور کی عکاسی کرتا ہے۔ جہاں تک اپنا تعلق ہے میں تو ادب کی بیری کی ٹہنی پر ہوں۔ محض ایک آؤٹ سائیڈر جو مرکز کی جانب ایک نظر بھر کے دیکھتا ہے اور پھر محیط اور حاشیے پر اپنا مقام قائم رکھتا ہے۔

☆ ڈسپلن کی پابندی تخلیق کار کے ہاں کس حد تک ضروری ہے اور آپ کے ہاں صورت حال کیا ہے؟

☆☆ ڈسپلن ایک اضافی معاملہ ہے جو ہر تخلیق کار اپنے لئے خود متعین کرتا ہے اور کئی بار مختلف تخلیقات میں بدلتا بھی رہتا ہے۔ میرے ہاں ڈسپلن ایک سیال روپ کی صورت میں متحرک رہتا ہے لیکن مضامین میں اس بات کا خیال رکھتا ہوں کہ اس میں فکری نمو کے ساتھ ساتھ نئی سوچ اور ارتقا کا عمل بھی جاری رہے اور نئے نئے امکانات کی صورت بنی رہے اور حتمی فیصلے سے گریز کیا جائے۔

☆ آپ اپنی کامیابی میں سوچ اس وقت کے حالات اور کمٹمنٹ میں کسے زیادہ نمبر دیں گے؟

☆☆ اول تو یہ کہ میں کامیاب ادیب نہیں ہوں۔ کمٹمنٹ کی تو یہ صورت ہے کہ میں چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک رہرو کے ساتھ اس امر سے انکار نہیں کہ ہم معاشرے کلچر' سیاست اور مخصوص معاشی نظام میں پرورش پاتے ہیں لیکن ادبی تخلیق معاشرہ نہیں کرتا فرد کرتا ہے۔ جو بہت ہی پیچیدہ اور مختلف النوع عناصر سے ترتیب پاتا ہے اور مخصوص انداز میں متاثر ہوتا ہے اگر نمبر دینا ہی پڑے تو میں اپنی سوچ کو اولیت دوں گا۔ ارتقا کی مختلف منازل کے باعث فکر و احساس میں تبدیلی ناگزیر ہے۔

☆ کیا آپ اس بات سے اتفاق رکھتے ہیں کہ نظریے سے بندھی تخلیق وقتی ہوا کرتی ہے یا تبلیغ گردانی جاتی ہے۔ ہمارے سوال کی روشنی میں آپ کی تخلیقات کی نسبت سوالیہ نشان فطری بات ہے۔

☆☆ کوئی بھی فرد BIASES تعصبات' ترجیحات اور تضادات سے عاری نہیں ہوتا۔ ہر انسان کے ذہن میں ایک فلٹر مسلسل کارفرما رہتا ہے جو اس کی پسند اور ناپسند کی آئینہ داری کرتا ہے۔ جسے ہم سہولت کے لئے ذہنی یا وقتی ہم آہنگی یا ذہنی (وقتی) بے آہنگی کہہ سکتے ہیں۔ اور اس کے تحت اپنا نظریہ یا رویہ

متعین کرتا ہے لیکن نظریہ ایک مقید اور منظم نظامِ فکر ہے جس سے ہمنا اخر تو ممکن ہو کرنا ضروری ہے ورنہ وہ آپ کی تخلیقی صلاحیت پر حاوی ہو جائے گا اور آپ کو مقصود طے شدہ منزل کی جانب راغب کرنے کی کوشش کرے گا جس کے باعث وعظ اور تبلیغ کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ دراصل ہر تخلیق بذاتِ خود ایک سوالیہ نشان ہوتی ہے۔ وہ سوال کو جنم دیتی ہے کیونکہ اس کے پیچھے دنیا بھر میں لوگ سوچنے سمجھنے سے نیا وجود اٹھیں جاری کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں سوالات نہیں اٹھتے۔ وہ بس پہلے کے جوابات مانگتے ہیں۔ اس لئے بغیر کسی دلیل یا شہادت کے سب کچھ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اس بے ثمر سے شور میں ادب کی آواز دب کر رہ گئی ہے۔ دراصل ہر تخلیق ہمیں کسی نہ کسی سوال کے روبرو لا کھڑا کرتی ہے۔ آمروں کے دنیا میں سوالات نہیں ہوتے۔ ان کی دنیا میں صرف جوابات ہوتے ہیں۔ یہ نظریہ بند فکر اور بند سماج میں ہی ممکن ہے۔

☆ بہت زیادہ پڑھے لکھے فنکاروں کے ہاں نت نئے نظریات اور ان کی تاویلیں مغربی ادب کے چربے کیوں تحریر کی جاتی ہیں۔

☆☆ یہ زمانہ تغیر پذیر ہے۔ ہمارے یہاں کلاسیکی ادب اور اوریجنل فکر کی جو روایت تھی وہ قریب قریب ناپید ہوتی جارہی ہے۔ چنانچہ ہمیں نئی فکر کے لئے دوسرے ذرائع کی جانب دیکھنا پڑتا ہے یا تو ہم ماضی کی جانب مراجعت کریں یا زمانہ حال کو ساکت و جامد تصور کرکے غور و فکر کریں یا مستقبل کی جانب رجوع کریں۔ یعنی نوجوت نئی سوچ کی جانب راغب ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ گذشتہ دو صدیوں سے ہمارے ذہن پر نوآبادیاتی اثرات غالب رہے ہیں۔ ادب میں بھی ہم مارکسیت، جدیدیت، وجودیت، تحلیل نفسی، لسانیات، نوتاریخیت اور تشکیل وغیرہ کے حوالے سے اپنے تخلیقی ادب کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب تک نئی اوریجنل فکر، جدت طرازی اور اپنے ادب کے بطن سے پرکھ کے پیمانے دریافت نہیں کئے جائیں گے یہ صورت حال غالب رہے گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے دماغ کی تمام کھڑکیاں دروازے بند کر لیں۔ ہمارے ادب میں بے پناہ تخلیقی قوت ہے اسے بروئے کار ہونے کی ضرورت ہے لیکن جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اس میں مغرب اور مشرق کے مابین دیواریں اور حد بندیاں منہدم ہو رہی ہیں۔ یہ دو اہم منقسم ہو رہے ہیں۔ ہم اس امر کو فراموش نہیں کرسکتے کہ مختلف تہذیبوں کے اشتراکِ عمل کو روکا نہیں جا سکتا اور نہ ہی مصنوعی تقسیم کے ذریعے کسی فکر کو زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ سوال مکالمے اور مفاہمت کا ہے تاکہ مناقشے اور مخالفت کا۔ ہاں باہم تبدیلی سے خائف رہتے ہیں اور اس کی مزاحمت کرتے ہیں جس کے باعث نہ معاشرے اور تہذیب میں اور نہ ہی تسلسل اور تحریر میں ہم تخلیقی مداخلت کر سکتے ہیں۔

☆ آپ کی کہانیوں میں عورت آزاد ہوتے ہوئے بھی مرد سے ہر مرحلے پر پیچھے نظر آتی ہے۔ کہیں اس عمل میں آپ کے عشق کی ناکامی اور ازدواجی زندگی کی الجھنیں تو نہیں!

☆☆ میری کہانیوں سے یہ نتیجہ اخذ نہیں ہوتا کہ عورت آزاد ہوتے ہوئے بھی مرد سے ہر مرحلے میں پیچھے نظر آتی ہے۔ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں پھر میں خود کچھ نہ کہہ کر ایک کمنٹ پیش کروں گا اس بار انگریزی میں۔

"Despite having suffered betrayal and mental torture in a situation ravaged by the anarchic winds of feminism that swept across the sixties, Devendra treats his female characters with a dignity, and an understanding that any person liberated in a true or rather post-modern sense, will appreciate and admire. He is perhaps one of the few Indian writers, who could recognize the woman in her pure human individuality, that is, even without the frame of reference of a home, family or other social labels and yet restored to her the dignity of womanhood, which she was being stripped off in the name of her liberation from man."

☆ آپ کی طرح کے فلاسفر تخلیق کار مدت سے انسان اور انسانیت کو کھوج رہے ہیں اس تلاش کا ثمر کب تک حاصل ہونے کے امکانات ہیں؟

☆☆ انسان ہونے کے معنی کیا ہیں؟ یہ ادب، فن اور فلسفہ کا اہم مسئلہ رہا ہے اس کی مختلف تاویلیں پیش کی جاتی رہی ہیں لیکن ہنوز کوئی حتمی رائے نہیں دی جا سکی۔ موجودہ دور میں انسانیت پر بھی سوالیہ نشان لگایا جا رہا ہے۔ کیا انسان کی اصل یا ازلی فطرت ہے؟ کیا وہ فرشتہ سیرت ہے یا شیطان خصلت یا یہ دونوں عناصر اس میں شامل ہیں کب کون سا عنصر غالب آ جاتا ہے کہنا مشکل ہے لیکن انسانیت ہمیشہ ایک امکان ہی رہے گی۔ ایک آدرش جو تشنۂ تکمیل رہے گا مگر اس کے حصول کی جدوجہد بھی جاری رہے گی۔ خیر و شر کی رزمگاہ میں کون کس وقت ظفریاب ہوتا ہے یا شکست ہوتا ہے ادب اسی کی ترجمانی کر رہا ہے۔ تلاش کا سفر جاری ہوتا تمام رہے گا ثمر یابی شاید ممکن نہیں۔

☆ اُردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی میں لکھنے کے باعث کس زبان کا ادیب دریافت ہوتا ہے اور یہ مستقبل کے خاکے میں کس زبان کے حوالے سے رہنا پسند کرے گا؟

☆☆ ”خوشبو بن کے لوٹیں گے“ میں ایک باب زبان کے حوالے سے ہے۔ پہلے اردو میں لکھنا شروع کیا۔ تقسیم کے بعد ہندی میں۔ پنجابی میری مادری زبان ہے اور روزی انگریزی سے کماتا ہوں۔ چنانچہ اب کچھ گڈمڈ ہو گیا۔ میں نے انگریزی میں تخلیقی ادبی کام نہیں کیا۔ انگریزی میں تخلیقی ادب کا ترجمہ دوسرے لوگوں نے کیا۔ ”خوشبو بن کے لوٹیں گے“ کا انگریزی ترجمہ مشہور شاعر اور آرکیٹیکٹ ریاض لطیف تقی نے کیا جو انگریزی میں memories of

fragrance کے نام سے شائع ہوا۔ انگریزی میں میں نے دوسرے موضوعات یعنی آرٹ، ماحولیات، ابلاغ اور ثقافت پر مضامین لکھے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ ان موضوعات پر انگریزی میں زیادہ کتابیں میسر ہیں۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ جس زبان میں میں لکھتا ہوں وہ بہتر ہوتی ہے اس کا ترجمہ کمزور رہتا ہے سچ تو یہ ہے کہ کوئی زبان بھی مجھے صحیح اور مکمل طور پر نہیں آتی۔

☆ برصغیر کی تقسیم کے عمل میں بہت اعلیٰ ادب تخلیق ہوا ہے آپ کے خیال میں اردو ادب میں اس کے اثرات منفی رہے ہیں یا مثبت؟

☆☆ یقیناً تقسیم کے عمل میں بہت اعلیٰ ادب تخلیق ہوا ہے جہاں تک اردو ادب پر اس کے اثرات کا سوال ہے تو میں نے کبھی منفی اور مثبت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ ادیب کے لئے یہ مسئلہ تاریخ اور تخیل کے مابین کشمکش کا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی اخلاقی ڈائیلما کا بھی۔ تاریخ کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ ادب میں اسی طرح در آئیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرد کے لئے کوئی یکساں تاریخ نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ ادیب کس focus پر کھڑے ہو کر تاریخ کو دیکھتا ہے اور کیسے اُسے تخیل کے غلاف کے ذریعے تخلیق کرتا ہے ادیب تاریخ کو Re-write نہیں کرتا زیادہ سے زیادہ Re-visit کرتا ہے اسی سے سب کچھ فرق ہو جاتا ہے

☆ پاکستان اور بھارت میں ادبی معیار دیانت اور امانت کے حوالے سے کس مرحلہ میں ہے اور مستقبل میں کس روش پر گامزن ہونے کے امکانات ہیں؟

☆☆ دونوں ممالک میں ادبی معیار بہت بلند ہے۔ دیانت کا مسئلہ ادیب کی ذات سے متعلق ہے اور امانت کا ثقافت سے۔ مستقبل کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے سکولوں، کالجوں اور جامعات میں ہزاروں طلبا ادب پڑھتے ہیں اور اساتذہ پڑھاتے ہیں۔ آئے دن سیمینار ہوتے ہیں۔ کتابوں کی رونمائی ہوتی ہیں۔ تقاریر ہوتی ہیں۔ سپاسنامے پیش کئے جاتے ہیں۔ اعزازات کی بھی کمی نہیں۔ پھر بھی ادیب اور ذوق کے زوال پر گریہ زاری جاری ہے ایسی صورت میں آپ کیا محسوس کر سکتے ہیں سوائے اس کے کہ ثقافت اور سوچ کو سیاست زدگی کا شکار بنانے کے بجائے معاشرت کے بدلتے ہوئے چہرے کو پہچانا جائے اور ایک متوازی فکر کی ترویج کی جائے۔ بہرحال سوال یہ ہے کہ گذشتہ کئی برسوں سے ادیب سے مایوسی بڑھ گئی ہے۔ تجریدی کی دہشت نے تخلیقی ادب کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ تخیل اور جمالیات عہد رفتہ کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ کیا نئی صدی کا ادب نئے سرے سے شروع ہوگا۔ دیومالاؤں، داستانوں، حکایتوں سے گذرتے ہوئے افسانے کا جو سفر جاری رہا ہے وہ رک جائے گا؟ آج افسانے کو حقیقت کے بدلتے تصور کے باعث ضمیر، شعور، فکر، احساس، تخیل، وجدان، قلم و زبان، اسلوب و بیان اور تشکیل کے ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ ادیب اس نئی نسل کے لئے جو الیکٹرانک میڈیا، گلوبل اطلاعاتی ماحول اور سائبر اسپیس میں پرورش پا رہی ہے اس کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر رہا۔ نئی نسل کی حقیقت کا ادراک اور اقدار اور نظریہ حیات کا تعلق میڈیا اور کمپیوٹر کے متحرک اور مرکب امیجز سے اور نئے صوتی آہنگ سے متاثر ہوں گے۔ چنانچہ یہ پیشین گوئی کرنا مشکل ہے کہ تخلیقی ادب کس سمت کو جائے گا۔ اس کی نوعیت کیا ہوگی۔ لیکن میں جب تخلیق کے لامحدود اسرار اس میں مضمر قوت اور رنگا رنگی کے امکانات کا تصور کرتا ہوں تو مجھے ایک عجیب تحرک کا احساس ہوتا ہے۔

☆ اگر بات نمبر دینے کی ہو تو آپ کس خطے کو کس صنف کے حوالے سے زیادہ یا کم نمبر دینا پسند کریں گے؟

☆☆ میں نے اس طرح کبھی نہیں سوچا۔ اگر یہ سوال نظریہ باز نقادوں جامعات کے استادوں اور پیشہ ور نقادوں سے کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

☆ موجودہ سیاسی مفاہمت کے ردعمل میں اردو زبان و ادب کو کس طرح فوائد پہنچنے کے امکانات ہیں اور وہ کس قدر دیرپا ہیں؟

☆☆ "سیاسی مفاہمت" کے عمل میں بڑی پھسلن ہے۔ اس پر بھروسہ کرنے کے بجائے کلچرل اشتراک پر عمل کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ یہاں میں اپنے ایک پرچے کے آخری حصے کا اقتباس پیش کر کے اس ملاقات کے سلسلے کو ختم کرنا چاہوں گا:

SLEEPING WITH THE ENEMY

On the one side is the urgent call for peace and secularism and on the other side is the rising insurgent religious and ethnic fundamentalism. On the one side is the ever-increasing politicisation of the intellectual discourse and on the other is the emphasis on the civilizational clash. People gather together in seminars and demonstrations alongwith their ideological friends while the need is to enter into a dialogue with those who differ with us. The result is the widening gulf between the two. Slogans and statements do little to fill in the gap. It is the people, whether, friends or foes, who matter. Sleeping with the enemy is after all not such a bad proposition.

DANCING ON THE HYPHEN

In 1947, Maulana Abdul Kalam Azad had said; "The division is only of the map of the country and not in the hearts of the people, and I am sure it is going to be a short lived one". No way, for me shared Punjab means an hyphenated Punjab. If we eliminate the hyphen by force violence and war will follow. We are doomed to destruction. As Gautam says to Roshan Ara in The River of Fire by Qurratulain Hyder that "In this divided world, we can meet each other only on borders." So let us meet on the borders and dance on the hyphen alongwith Shiva, the benevolent and Shiva means the embodiment of goodness, the Good itself.

مسٹر روشو

دیویندر اِسّر

روشو یا اُس کا اصلی نام تھا یا!

معلوم نہیں۔

کسی نام کی بگڑی ہوئی شکل بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً روشن، بیٹنو، سلمان رشدی، آوشو، راشومان، کرشن، رشی کلپ، ہیروشیما، یروشلم۔

ممکن ہے۔ لیکن ہم اُسے مسٹر روشو کے نام سے ہی جانتے تھے۔

تو ہاں۔ تم اِس مسٹر روشو کے بارے میں کچھ بتانے جا رہے تھے۔

مسٹر روشو اِس چائے خانہ میں ہر روز آتے تھے۔ بلاناغہ، ہر شام، بارش میں، آندھی میں، طوفان میں، بیماری میں، یہاں تک کہ کرفیو میں بھی۔ چھپتے چھپاتے تو وہ آتے ضرور تھے سوائے ایتوار کے۔ تخلیقِ کائنات کے بعد اِس دن تو خدا نے بھی چھٹی کی تھی۔

سنا ہے کہ ایتوار کی صبح کو وہ شہر سے کہیں بہت دور نکل جاتے تھے۔ اور دوسرے دن سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہی لوٹ آتے تھے۔ لیکن یہ اسرار ہی رہا کہ وہ کہاں جاتے ہیں؟ کس سے ملتے ہیں؟ نہ انہوں نے پردہ اٹھنے دیا نہ کسی نے اسے اٹھانے کی کوشش ہی کی۔ چائے خانہ میں اُن کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ لیکن وہ آتے تھے جب سورج غروب ہونے کو ہوتا تھا۔ جب روشنی کی آخری کرن سمٹتے سمٹتے ننھا سا نقطہ بن جاتی تھی اور سورج وہ جو ننگی پہاڑیاں دیکھ رہے ہیں نا، اُن کے پیچھے پھسل جاتا تھا۔ جب آسمان کا رنگ سرخ سے سیاہ ہو جاتا تھا۔ وہ اُس وقت تک چائے خانہ میں بیٹھے رہتے جب تک کہ چائے خانہ کے بند ہو جانے کا وقت نہیں ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو آخری آدمی بھی جا چکا ہوتا تھا۔ میزوں سے جھوٹی پیالیاں ہٹائی جا چکی ہوتی تھیں۔ کرسیوں کو میزوں پر اُلٹے منہ رکھنے کا کام شروع ہو چکا ہوتا تھا۔ لیکن جب تک مسٹر روشو خود اُٹھ کر جانے کے لیے تیار نہیں ہو جاتے تھے اُن کی میز کے اُوپر والا چھوٹا سا بلب جلتا رہتا تھا۔ اُس کی زرد روشنی کے دائرے میں وہ کسی گزرے ہوئے زمانے کا درویش نظر آتے تھے۔ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھے۔

مسٹر روشو ہمیشہ کافی کے دو پیالے منگواتے تھے۔ اپنے لیے بلیک کافی اور سامنے والے کے لیے کریم کافی۔ پھر وہ اپنے کالے چمڑے کے بیگ سے کوئی کتاب نکالتے اور اُس کے ورق پلٹ پلٹ کر سامنے والے کو سنانے لگتے۔

کیا وہ اُن کا کوئی دوست تھا؟

نہیں۔ یہی تو بات ہے۔ اُن کے سامنے کوئی نہیں ہوتا تھا۔ کرسی خالی ہوتی تھی۔ لیکن وہ کتاب اِس طرح پڑھتے تھے، اِس طرح جھک جھک کر باتیں کرتے تھے، مسکراتے تھے جیسے سامنے وہاں کوئی دوسرا موجود ہے.... کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ جب کوئی ہماری بات سننے والا نہیں ہوگا تو کیا ہم بھی خالی کرسی سے ہمکلام ہوں گے!

اِس کی فکر نہ کرو۔ اِس سے پہلے ہی ہم گونگے ہو جائیں گے۔ تو ہاں تم مسٹر روشو کی داستان سنانے جا رہے تھے۔

کہاں سے شروع کروں؟

کہیں سے بھی شروع کر سکتے ہو۔ سب داستانیں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔

ہاں۔ لیکن انجام الگ الگ ہوتا ہے اور مسٹر روشو.....

اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق ہوتا ہے تو بس اتنا ہی کہ آخر میں کردار یا تو سرنگ میں سے نکل رہا ہوتا ہے یا داخل ہو رہا ہوتا ہے۔

لیکن مسٹر روشو تو ایک ہی سرنگ سے نکلتے تھے تو سامنے دوسری سرنگ موجود ہوتی تھی۔

لیکن معاملہ ہر حال میں تو سرنگ پر ہی ختم ہوتا ہے۔

تو چلو بیچ سرنگ سے ہی شروع کرتا ہوں۔ پھر آگے پیچھے۔

”اس دن وہ کسی ادبی نشست سے واپس آئے تھے۔ رات کے قریب نو بجے تھے۔ ریڈیو پر خبریں سنائی جا رہی تھیں۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی، جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ۔ لفظوں کے اندر آواز تھی، جس عورت کے ساتھ شام گزار کے آ رہے ہو واپس اُس کے پاس چلے جاؤ۔ مسٹر روشو نے دوبارہ دستک نہیں دی۔ یہ اُن کا دستور نہیں تھا۔ انہوں نے ایک لمحہ اُس بند دروازے کو دیکھا جسے وہ کئی راتوں کو نیم وا رکھتے تھے کہ نہ جانے وہ کب کسی ڈرامے کی ریہرسل سے لوٹے۔ ایک بجے، دو بجے، تین بجے، پو پھٹنے کے وقت.... اور اُسے دستک نہ دینی پڑے۔ دروازہ بند نہ ملے۔ مسٹر روشو ہولے ہولے بغیر چاپ کے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گئے۔ مین گیٹ کھولا اور باہر سڑک پر آ گئے۔ اُن کے ہاتھ میں وہی بیگ تھا۔“

کون سا بیگ؟

وہی کالا چمڑے کا بیگ جو اُن کے ہاتھ میں تھا جب انہوں نے پہلی بار گھر چھوڑا تھا۔ جب انہوں نے اپنا شہر اور وطن چھوڑا تھا۔

اُس نے پہلی بار گھر کب چھوڑا تھا؟

بتاتا ہوں۔ پہلے اس گھر کا قصہ ختم کر لیں۔ جو انہوں نے خود بنایا تھا۔ پہلی اور آخری بار، تو ہاں، جب وہ سڑک پر آ گئے تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ اور بس اسٹاپ پر پہنچتے پہنچتے بارش تیز ہو گئی۔ وہ دوڑتے دوڑتے ایک بس میں سوار ہو گئے۔ بازار ابھی پوری طرح بند نہیں ہوئے تھے۔ وہ اپنے زیر تعمیر مکان میں رات گزارنے (پناہ لینے) جا رہے تھے۔ جب وہ اس کے نزدیک والے اسٹاپ پر اترے تو بارش بہت تیز ہو گئی تھی سب جل تھل ہو گیا تھا۔ مکان کے سامنے پانی اور کیچڑ بھر گیا تھا۔ گیٹ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے۔ آنگن بھی پانی سے بھر گیا تھا۔ انہوں نے نالے میں جالی لگائی، نکالنے کی کوشش کی اٹک گئی تھی۔ نہ جانے نالے کو کب سے زنگ لگ چکا تھا۔ وہ بارش میں بھیگتے رہے اور تالا کھولنے کی کوشش کرتے رہے۔ کٹ کی آواز آئی اور تالا کھل گیا۔ کنڈی بھی بڑی مشکل سے کھلی دروازہ بھی دیوار بن چکا تھا۔ لیکن دو چار ٹھوکریں کھانے کے بعد کھل گیا۔ مسٹر روشو بارش میں بھی پسینہ پسینہ ہو گئے تھے۔ اندر سے بند کمرے کی گرم باسی ہوا ان کے بدن کے ہر مسام میں داخل ہو گئی اور ناک سے ہوتی ہوئی ان کے پھیپھڑوں میں بھر گئی۔ وہ تھوڑی دیر یونہی دروازے سے لگے کھڑے رہے اور پھر چپکے سے دبے پاؤں اندر داخل ہوئے جیسے اپنے ہی گھر میں چوری کرنے آئے ہوں۔ انہوں نے کمرے کی کھڑکیاں کھولیں، گیلے کپڑے اتارے، نچوڑے اور کھڑکی پر لٹکا دیے اور ایک کونے میں فرش پر پست کر بیٹھ گئے۔ فرش پر سیلن بھری پرانی گرد جم گئی تھی۔ سنگ مرمر کا فرش، سکون نہ شور نہ روشنی نہ ماضی نہ مستقبل بس خلا اور سناٹا قبر کی سی تاریکی اور تنہائی۔"

(خاموشی... داستان رک گئی۔ سکوت طاری ہو گیا اور وہ جیسے کمرے میں داخل ہو گئے تھے)

"گھر اس نے پہلی بار نہیں چھوڑا تھا لیکن اس طرح کبھی اکیلا نہیں ہوا تھا۔ جب پہلی بار اس نے گھر چھوڑا تھا تو وہ 'کیمون' میں آ گیا تھا۔ یہ کوئی باقاعدہ کیمون نہیں تھا۔ پبلک لائبریری تھی جس میں لکڑی کے ایک میک شفٹ کیبن میں ایک کامریڈ رہتا تھا۔ یار دوست وہیں ملتے تھے۔ ہر شام محفلیں لگتی تھیں۔ اسٹڈی سرکل ہوتے تھے رات کو شعر و شاعری ہوتی تھی کہ اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں۔ مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔ زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے..... حسن و عشق کے سچے جھوٹے قصے سنائے جاتے تھے۔ کتابیں پڑھی جاتی تھیں۔ کرشن چندر، منٹو، کارل مارکس، قصے کہانیاں، چیخوف، کافکا، گورکی، کامیو......"

لیکن اس نے گھر کیوں چھوڑا؟

بس ایسے ہی یوں ہی۔ اسٹالن گراڈ پر حملہ ہوا تو ریڈ آرمی بنا لی۔ اگست انقلاب ہوا تو دیواروں پر عبارت لکھ دی۔ انگریزو ہندوستان چھوڑو ـــ بنگال کا قحط پڑا تو گلی کوچوں میں بھوکا ہے بنگال رے ساتھی گاتے ہوئے کپڑے لتے آٹا چاول جمع کرنے لگا۔ جب شہر کی فضا بگڑنے لگی تو اس نے طالب علموں کا جلوس نکالا۔ اُس تاریخی شہر میں اس سے بڑا جلوس پہلے کبھی نہیں نکلا تھا اور لوگوں نے اس طرح ایک ساتھ مارچ نہیں کیا تھا۔ اُس دن بھی نہیں جب شہر کی سڑکوں پر ہجوم اُبل پڑا تھا۔ لال قلعے سے آئی آواز۔ ڈھلوں شاہنواز، کچہری کے پاس پولیس نے جلوس کو روک دیا۔ روشو اور اس کے ساتھ دو اور طالب علموں کو حراست میں لے لیا گیا۔ بس اس کے بعد اس نے گھر چھوڑ دیا۔

اُس وقت اس کی عمر کیا رہی ہوگی؟

یہی کوئی سترہ اٹھارہ برس۔ لیکن 'کیمون' بھی گھر نے لگا تھا۔ شہر کی دوپہر گرم ہونے لگی۔ چھوٹ پٹ خنجر بازی کی وارداتیں ہو چکی تھیں۔ روشو کو اس کے دوستوں نے ہوسٹل پہنچا دیا اور پھر دو دن بعد وہاں سے رات کے اندھیرے میں چوری چھپے ریلوے اسٹیشن ــ اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر سرحد کے اس پار آ گیا۔ اُس وقت بھی اندھیرا تھا۔ اب بھی اندھیرا تھا۔ اُس رات بھی بارش ہو رہی تھی۔ اب بھی بارش ہو رہی تھی۔ اُس وقت بھی وہ ایک نامعلوم منزل کی جانب جا رہا تھا۔ اب بھی وہ ایک نامعلوم منزل کی جانب جانے والا تھا۔ کمرے کے خاموش اندھیرے میں وہ راستے کی تلاش کر رہا تھا کہ بادلوں کے گڑگڑانے کی آواز سے کمرے کا سناٹا ٹوٹ گیا۔ بجلی زور سے کڑکی اور کمرے کے اندھیرے کو چیر گئی اور اس شور اور روشنی کے ساتھ روشن دان سے برف کی ایک چمکتی ہوئی سل سی کمرے میں داخل ہوئی اور بالکل اس کے پاس اس کے سامنے میلے فرش پر چاندنی سی بچھ گئی۔ برف کی سل دھیرے دھیرے پگھلنا شروع ہو گئی۔ جہاں جہاں سے برف پگھل رہی تھی نیلی نیلی رگیں ابھرنے لگیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے برف کی سل ایک انسانی پیکر میں بدل گئی۔ ہونٹوں میں ہلکی سی لرزش ہوئی، جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ گہری سبز نیلی آنکھیں جھلمل سی چمکنے لگیں۔ صوفیوں کا سفید ڈھیلا ڈھالا لبادہ۔ مسٹر روشو گھور رہا اس نورانی ہیولے کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک جیسے کسی جادوئی عمل سے جاگ کر وہ خوشی سے چلایا۔ "پروفیسر صاحب" "کیسے ہو روشو!" ہونٹ سرگوشی کے انداز میں ہلے۔ "اور آپ پروفیسر صاحب!" پائپ لبوں پر، دونوں انگلیوں تک گئی وہی سگریٹ، وہی آواز، وہی آہنگ، وہی کھنک، وہی تجسس بھری بے چین آنکھیں۔ وہی مسکراہٹ ہو اکثر نہ جانے مہکاتے۔ سب کچھ وہی تھا بس جسم ایک شفاف آئینہ تھا۔ مسٹر روشو اس جسم کے گرد سیاہ شیروانی اور سر پر فیلٹ ٹوپی کا تصور کر رہا تھا۔ یہ اُس کے فلاسفی کے پروفیسر تھے۔ اُس شہر میں جو اُس سے چالیس برس پہلے چھوٹ گیا تھا۔ جس مکان میں روشو رہتا تھا اُس سے دو مکان چھوڑ کر وہ رہتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے گھر میں اور کبھی شام یا رات کو ٹہلتے ہوئے ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ زندگی جینے اور سمجھنے کا شعور ان کے قریب بیٹھ کر اور ان کے ساتھ باہر کھلے میں گھوم کر

اُسے ملا تھا۔ ایک بار جب وہ سخت بیمار ہوئے اور انھیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا تو روشو اُس وقت تک اُن کے ساتھ رہا تھا جب تک کہ وہ تندرست نہیں ہو گئے تھے۔ وہ اس شہر میں اکیلے تھے۔ روشو نے اسپتال میں ایک دوسرے ہی شخص کو دیکھا تھا۔ جو مارکس، فرائیڈ اور آئن اسٹائن کے بجائے حیات، موت اور امر اور کائنات پر اس طرح باتیں کرتا تھا جیسے کوئی عالم جذب میں بول رہا ہو۔ روشو یہ سب سن کر بڑے تذبذب میں تھا کہ کیا یہ وہی شخص ہے جس نے اُسے جدلیاتی مادیت کا درس دیا تھا اور وہیں اسپتال میں پہلی بار اُسے اُن کی شاعری سننے کا موقع ملا تھا۔ جس میں گھن گرج کے بجائے روحانی افسردگی تھی۔ اور اب وہ انھی پپّا اُس کے سامنے بیٹھے تھے۔

دیکھو یہ خود رو!

"جب تک ہم انا کے جیلوں بیابانوں، اُس کی فریب فروزی سے پوری آگہی پیدا نہ کریں، ہم اپنے اندر اس تخلیقی سرچشمہ کو پھوٹنے نہیں دیں گے جو ہمارے اندر فطرت کی آمد ہے۔ یہی آگہی تخلیقی سرمستی ہے۔ اسی آگہی کی بدولت انسان پتھروں، درختوں، پھول، کانٹوں اور پرندوں سے ہم کلام ہو سکتا ہے۔... اسی آگاہی سے لازوال ہوتی ہے وہ بے وقت کا سناٹا جو تخلیق کے دریا میں تموج اور طوفان پیدا کرتا ہے۔ ظہور میں آتا ہے لفظوں کی اس مجبوری کی آگہی ہی خاموش آگہی پیدا کرتی ہے جس میں کسی جذبے کی احساس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ افکار اور جذبات ایک دوسرے میں اس طرح جذب ہوتے ہیں کہ اُن کے محبوب لمحۂ تخلیق کی اِس بیاباں میں بے برگ و بار نظر آتے ہیں......"

مسٹر روشو کو محسوس ہوا کہ وہ پرندے کی طرح پرواز کرنے لگا ہے۔ وہ زمینوں اور زمانوں کے پار پہنچ گیا ہے جہاں نہ معنی ہے نہ لفظ، نہ شور ہے۔ بس ایک ہی صدا اُن کے ذہن کو گونج رہی ہے۔ اللہ ہو۔ اللہ ہو۔ مسٹر روشو نے دیکھا کہ برف کی سل روشنی کا ہالہ بن کر روشندان سے باہر نکل کر بادلوں میں گم ہو گئی ہے۔ لیکن اُن کی موت کو تو کئی برس بیت گئے تھے۔

کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ باہر بارش کی بوندوں کا شور تھا۔ اندر بھی اندھیرا تھا اور باہر بھی اندھیرا تھا۔ مسٹر روشو پاؤں پھیلا کر دیوار کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔ اور جیسے عالم جذب میں چلا گیا ہو۔ اُسے پتا سا محسوس ہوا کہ دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے۔ نیم خوابیدہ نیم آگہی میں اُسے دستک کی آواز بہت دور سے آتی سنائی دی۔ آواز قریب آتی گئی۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور باہر کی طرف دیکھا۔ باہر دروازے پر کوئی زور زور سے دستک دے رہا تھا۔ اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے۔ جو آیا ہے اُسے ایک دم کیسے معلوم ہو گیا کہ مکان میں کوئی آ گیا ہے۔ کوئی اُس کا پیچھا تو نہیں کر رہا تھا۔ کوئی بھوت پریت تو نہیں۔ کہتے ہیں کہ جو جگہیں سنسان پڑی رہتی ہیں اُن میں بھوت بسیرا کر لیتے ہیں لیکن بھوتوں کے لیے بند دروازے کیا اور کھلے کیا۔ وہ تو دیواروں کے بیچ سے بھی پرگٹ ہو جاتے ہیں۔ بھوت ہو یا دوست یا دشمن اُسے دیکھنا تو ہے ہی۔ جس دروازے پر دستک ہو رہی تھی وہ تو اُس کمرے کا دروازہ ہے۔ اس سے پہلے تو گلی کا دروازہ آتا ہے۔ یہ شخص دیوار پھاند کر پیچھے والی گلی سے کیوں آیا ہے؟ مسٹر روشو نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور اُس کے پیچھے چھپ گیا۔ "روشو صاحب۔۔۔ میں ہوں۔۔۔ وہ ملہوترا۔" کون وہ؟ ۔۔۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ مسٹر روشو کو اندھیرے میں دیکھنے کی کچھ کچھ مشق ہو گئی تھی۔ مسٹر روشو کو وہ لڑکا پہچاننے میں مشکل پیش آئی۔ لیکن اُسے اتنا احساس ضرور ہو گیا تھا کہ یہ چہرہ اس نے پہلے کہیں دیکھا ہے۔ کہاں؟ کب؟ کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اب ڈر کی جگہ اشتیاق نے لے لی تھی۔

"اگر آپ مجھے نہ بچاتے تو میں یہاں آپ کے پاس نہ ہوتا۔ وہ لوگ مجھے مار ڈالتے۔" "کون لوگ؟" "وہی جیل میں بند ہمارے ساتھی۔" مسٹر روشو کو کچھ کچھ یاد آنے لگا۔ وہ لڑکا جیل میں اُس کے ساتھ اُسی بیرک میں تھا۔ ابھی اُس کی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ اب اُس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہو رہے تھے۔ مسٹر روشو کو یاد آیا کہ ایک دن وہ ابھی پوری طرح جاگا بھی نہیں تھا کہ "اسے مارو۔ مار ڈالو سالے کو، مخبری کرتا ہے" کی آوازیں سنائی دیں۔ مسٹر روشو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سب لوگ اس لڑکے کو بُری طرح پیٹ رہے تھے۔ وہ [illegible] کہ پولیس سے مخبری کے لیے بٹھایا گیا تھا اس پر الزام لگایا جا رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی اٹھا اور بیچ بچاؤ کرنے لگا۔ "کیوں مار رہے ہو بیچارے کو؟" "یہ بیچارہ ہے! سی آئی ڈی کا مخبر ہے۔ اسی نے پولیس کو ہمارے انڈر گراؤنڈ ٹھکانے بتائے ہیں اور ہمارے کئی ساتھی گرفتار ہو گئے۔" "لیکن اس کی بات بھی سن لو۔" "کیا سنیں اس کی بات اسے باہر سے جو باتیں آتی ہیں اور یہ ہماری ساری کارروائیوں کی رپورٹ باہر بھیج دیتا ہے۔" بیرک میں جو ہیڈ وارڈر کو چھپا پڑا تھا۔ کیسی ذمہ داری ہے۔ باتیں بھی ہو رہی تھیں اور اس کی پٹائی بھی جاری تھی۔ تھوڑی دیر میں ہنگامہ ختم ہو گیا وارڈن آ گیا تھا اور اس نے اُس لڑکے کو دوسری بیرک میں ٹرانسفر کر دیا تھا جس میں عادی مجرم بند تھے۔ شام کو بیرک بند ہونے سے پہلے مسٹر روشو اُس سے ملنے گیا۔ وہ گھٹنوں میں سر چھپائے گم سم بیٹھا تھا۔ "سچ سچ بتاؤ کہ بات کیا ہے؟" مسٹر روشو نے اُس سے پوچھا۔ "میری ماں بہت سخت بیمار ہے۔ کوئی اُس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں۔ میں تھا لیکن گرفتار ہو گیا۔ ایک چھوٹی بہن ہے جو ابھی پرائمری اسکول میں پڑھتی ہے۔ میں نے وارڈن سے اپنی مصیبت بیان کی۔ میں کبھی کاغذ کے ٹکڑے پر، سگریٹ کی ڈبیا پر اپنا سندیسہ لکھ کر وارڈن کو دے دیتا ہوں۔ وہ اُسے میری ماں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ کسی نے وارڈن کو میرے گھر جاتے دیکھ لیا تھا۔ بس یہی بات ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں مخبری کر رہا ہوں۔ ان کی خفیہ میٹنگوں کی خبریں پولیس تک پہنچاتا ہوں۔" مسٹر روشو نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مسٹر روشو جیل کی یادوں کے دھندلکے

سے باہر آ گیا تھا۔ "آج کل کہاں ہو! کیا کر رہے ہو؟" اس نے بتایا کہ اس نے پارٹی چھوڑ دی ہے۔ اب امریکہ میں سیٹل ہو گیا ہے۔ بڑا بزنس پھیلا لیا ہے۔ ہر سال ایک بار دیوالی پر انڈیا آتا ہے۔ اپنے گاؤں کی مٹی کی بھر مٹی لے جاتا ہے بس یہی رشتہ رہ گیا ہے اس کا اس سرزمین سے۔ مٹی کی بھر مٹی ۔۔۔ شادی وادی کی؟ ہاں! ایک میکسیکو لڑکی سے۔ میرے ساتھ ہی کام کرتی تھی۔ "اور بچے" "دو۔ ایک لڑکی ایک لڑکا" "تمہاری ماں اور بہن تمہارے ساتھ ہیں!" "ماں نہیں رہی۔ بہن نے ساتھ چلنے سے منع کر دیا" "یہاں کیا کرتی ہے" "پہلے تو آپ رینڈ فوکس (uprooted folks) کے دوبارہ بسانے کے لیے کام کرتی تھی۔ بے گھر لوگوں کے لیے جن کی بستیاں اجڑ گئی ہیں یا ڈھ میں بھوکپ میں یا دھ سے نے دنگے فساد میں جلنے سے لیکن اب کہتی ہے کہ اس کی صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ اب اتنی دوڑ دھوپ نہیں ہو سکتی۔ اب وہ گری جنوں کی ایک بستی میں کہیں بس گئی ہے ایک ہاتھ میں کتاب لیے دوسرے میں دوا۔ اچھا تو چلتا ہوں۔ میری فلائیٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔ بارش میں یوں بھی سڑکوں کی خستہ حالت ہے۔ دروازہ اچھی طرح بند کر لیں۔ آج کل کچھ پتہ نہیں۔ کون کس بھیس میں اندر گھس آئے۔ لوٹ لے یا پیٹھ میں چھرا گھونپ دے۔ ایسے ہی حادثے۔ جسٹ کا ذکر لیے بڑا آدم خور دور ہے" اس نے مسٹر روشو کے پاؤں چھوئے پرنام کیا اور چلا گیا۔

سامنے والا آدمی داستان سناتے سناتے رک گیا، کافی کا گھونٹ بھرا اور کرسی پر پیچھے جھک گیا۔ چائے خانہ میں شور تھا۔ سب لوگ سب لوگوں سے اونچے اونچے باتیں کر رہے تھے۔ بزنس کی باتیں، سیاست کی باتیں، فلموں کی باتیں، کرکٹ کی باتیں، سکیم اور سیکس اسکینڈل کی باتیں۔ باتیں، باتیں، باتیں۔ اب آپ بھی تھک گئے ہوں گے۔ مسٹر روشو نے عمر بھی لمبی پائی تھی اور اس کی داستان بھی بڑی طویل ہے۔

نہیں میں بڑے شوق سے سن رہا ہوں۔ ایک دور کافی کا اور ہو جائے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مسٹر روشو دروازہ بند کر کے ابھی کمرے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ انہیں کھڑکی میں ایک پرچھائیں سی تھرتی دکھائی دی۔ بارش کی بوندوں کی چلمن کے پیچھے کسی کا چہرہ چاند سا جھلکا۔ چھن چھنن۔ چھن چھن۔ کھڑکی کے شیشے سے نکل کر ایک پھول سا بدن ملے فرش پر ننگے پاؤں سے بر چہرہ کرنے لگا۔ من کی چھت پر گرتی بوندیں ننھی ننھی گھنٹیوں کی طرح بجنے لگیں۔ اور پھر دھرتی اپنے محور پر گھومتے گھومتے جیسے ایک دم رک گئی ہو۔ پھر یہ ماں کی بدرانی وہ لڑکی مسٹر روشو کے سامنے بیٹھ گئی۔ نمسکار۔ مندر کی گھنٹی بجی، تم؟ گلاب کی پنکھڑی کھل گئی۔ یہ وہی تھی جو مسٹر روشو کو جب وہ ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھاتے تھے ہر روز ایک پھول پیش کرتی تھی۔ نت نیا پھول۔ اور ہر پھول کے ساتھ ایک پرشن لیا ہوتا تھا۔ نت نیا پرشن۔ میرے من میں سنشے (شنکا) ہے پروفیسر صاحب۔ ہر بار اس کے من میں سنشے پیدا ہوتا تھا۔ ہر روز مسٹر روشو اس کے پرشن کا جواب دیتے، اس کا سنشے دور کرنے کی کوشش کرتے۔ پھول اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا سنشے اس کے من میں۔ مسٹر روشو نے ایک دن اس سے پوچھا تمہارے من میں ہر روز ایک نیا سنشے کیوں پیدا ہوتا ہے۔ اس نے کہا، جب تک سنشے ہے جیون کی گتی ہے۔ جس روز سنشے ختم ہو جائے گا جیون کا انت ہو جائے گا۔ ہر کوئی ان پرشنوں کو ختم کرنے کے لیے لڑتا جاتا ہے۔ یہ ساہت ہو جاتا ہے پرشن سنشے رہ جاتا ہے اور رہ جاتے ہیں جیتاؤں کے وشیش (کھنڈر)۔ مسٹر روشو سوچ میں پڑ گئے تھے۔ بہت کتابیں پڑھ ڈالی تھیں لیکن ایسی کتاب تھی جس میں کوئی جواب نہیں تھا۔ بس سوال ہی سوال تھے۔ اس نے کہا تھا جن کے پاس تمام پرشنوں کے جواب ہوتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ سوال کیا ہیں۔

مجھے سقراط کا ایک قصہ یاد آ رہا ہے۔ سقراط سے مصر کا ایک پروہت کہتا ہے مصر مر گیا ہے۔ ہم مر گئے لیکن تم زندہ ہو۔ یونان زندہ ہے۔ سقراط زندہ ہے۔ جانتے ہو کیوں؟ کیوں کہ میں سقراط کے ہر ایک شبد سے میں ہر سقراط وقت میں ایک متجسس بچے کو دیکھتا ہوں۔ جس دن یہ بچہ مر جائے گا سقراط بھی مر جائے گا مصر کی مانند"

سامنے بیٹھا ہوا آدمی جو مسٹر روشو کی داستان سنا رہا تھا سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

یہ اب سمجھ میں آیا کہ اس لڑکی کے من میں جو سوال تھا جو سنشے تھا وہ دراصل ایک کوتوہل بچہ ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اس لڑکی نے کہا تھا کہ اگر ارجن کے من میں سنشے شیش رہ جاتا تو مہابھارت نہ ہوتا۔ کرشن نے تمام سنشیوں کو سماپت کر دیا تھا۔ اسی لیے سورج کو دھوئیں کے غبار نے نگل لیا تھا۔ اسی لیے دھرتی پر پھول نہیں کھلتے تھے آگ اُگتی تھی۔ پرندے نہیں اڑتے تھے موت منڈلاتی تھی۔ لاشوں کے منچ پر تانڈو نرتیہ ہوتا تھا۔ یدھ سماپت ہونے پر گاندھاری نے اپنی آنکھوں سے کالی پٹی کھولی تھی۔ اس نے مرگھٹ بنی دھرتی دیکھ کر کرشن کو شراپ دیا تھا "سنو کرشن! اپر بھو یا پرماتما کچھ بھی ہو۔ سارا تمہارا ونش اسی طرح پاگل کتوں کی طرح ایک دوسرے کو پیر پھاڑ کھائے گا۔ تم خود ان کا وناش کر کے کئی ورشوں بعد کسی جنگل میں سادھارن ویادھ کے ہاتھوں مارے جاؤ گے۔ پربھو پر مارے جاؤ گے پشو کی طرح" شاید کرشن کے من میں پہلی بار سنشے پیدا ہوا اور وہ مارا گیا ایک سنسان جنگل میں رات کے اندھیرے میں۔ تنہا۔ بالکل اکیلا۔ سنشے گرست۔ مسٹر روشو نے کہا تھا۔ یہ سنشے مجھے بار بار کیوں سانپ سا ڈستا ہے کیوں میں اس لڑکی کے سامنے خاموش ہو جاتا تھا۔ کیوں میری ساری کتابیں ایک ایک کر کے بند ہو جاتی تھیں۔ اس لڑکی کے من

میں کون سا نئی شش و پنج کے بیچ آ گیا ہے اور پھر جو کچھ مسٹر روشو نے بتایا شبدوں سے نہیں آنسوؤں سے کہا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک دن اس لڑکی نے ایک کے بجائے دو پھول پیش کیے۔ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا کیوں آج دو پیش ہیں۔ وہ مسکرا دی نہیں کل شاید میں نہ آ پاؤں۔ دوسرے دن نہیں آئی۔ تیسرے دن بھی نہیں آئی۔ ایک دن اور بیت گیا۔ پھر دن بیتتے چلے گئے۔ وہ نہیں آئی۔ (خاموشی) لیکن یہ بات تو ادھوری رہ گئی۔

"ہاں ادھوری زندگی کی بات ادھوری رہ جاتی ہے"

"پھر بھی"

ہوا یہ کہ اس دن کے بعد وہ لڑکی نہیں آئی۔ مسٹر روشو نے اس سے پوچھا جب وہ اس رات ان کے کمرے میں آئی تھی "تم اچانک کہاں غائب ہو گئی تھیں" اس لوک میں چلی گئی۔ جہاں نہ آتیت ہوتا ہے نہ بھوشیہ۔ بس سے ہوتا ہے ورتمان

معاف کرنا دوست! یہ فلسفہ والا معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ فلسفہ نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہو گا۔ اگر کبھی تھا تو اب وہ مر چکا ہے۔ تم نے نطشے کا نام سنا ہے

ہاں سنا ہے اور تھوڑا بہت پڑھا بھی ہے

اس نے ایک پاگل کا کردار پیش کیا تھا جو ہاتھ میں لالٹین لیے ہوئے بازار کی طرف چلا ہوا دوڑتا ہے۔ مجھے خدا کی تلاش ہے مجھے خدا کی تلاش ہے۔ لوگ اس سے کئی طرح کے سوالات کرتے ہیں۔ وہ پاگل چیختے ہوئے کہتا ہے تم پوچھتے ہو کہ خدا کہاں چلا گیا کہ تمہیں اس کی تلاش ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ ہم لوگوں نے اس کو قتل کر دیا ہے۔ ہم نے اور تم نے۔ خدا مر چکا ہے خدا کی موت کے لیے ہم ذمہ دار ہیں۔ ہم قاتلوں کے قاتل ہیں۔

بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ یہی تو وہ لڑکی مسٹر روشو سے کہہ رہی تھی۔

"یعنی"

وہ لڑکی اکثر گایا کرتی تھی۔ کتی پی یا روی ترگ دھونا۔ آگ لاوس کلاں نوں۔ یا "کتی پی یا روی اللہ ہو دا آوازہ آوے" اس لڑکی کے والہانہ عشق سے مسٹر روشو کو عرفان ہوا کہ عشق ہی عبادت ہے عشق ہی خدا ہے عشق اور عبادت دونوں جنون ہیں۔ عشق مجازی ہی عشق حقیقی کی جانب لے جاتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ہیر وارث شاہ کو محض ایک داستان عشق کے بجائے صوفیانہ کلام نہ کہا جاتا۔ جب عشق نہیں رہتا تو خدا کا قتل ہو جاتا ہے

یہ اسرار و رموز کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ مسٹر روشو کو آ گئی ہوں تو مجھے معلوم نہیں۔ میں نہ مرکالی ہوں نہ فوق البشر نہ آتی مالس۔ بس ایک عام آدمی ہوں بہر حال لڑکی والی بات تو بیچ میں رہ گئی۔

مسٹر روشو نے اس لڑکی سے پوچھا یہ جو آتمائیں خواب میں ہی کیوں ملتی ہیں۔ لیکن وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ لڑکی سمٹے سمٹے ایک بت دو بن گئی تھی اور فضا میں تحلیل ہو گئی تھی۔ لیکن مسٹر روشو کے خواب میں وہ اسی طرح آتی رہی تھی۔ وہی سفید شلوار قمیص۔ وہی بسنتی چنری۔ وہی بالوں میں زرد پھول وہی تھرکتے پاؤں میں گھنگروں کی گھنٹیاں۔ اچانک گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور مسٹر روشو کا خواب منتشر ہو گیا۔

یہ گاڑی بیچ میں کہاں سے آ گئی

میں نے بتایا نہیں کہ جب آدمی سرحد پار کرنے لگتا ہے تو سپنے پیدا ہوتا ہے سرحد زمین کی ہو یا زندگی کی۔ جب مسٹر روشو کی گاڑی سرحد پار کرنے لگی تھی تو اس کے من میں سپنے پیدا ہوا تھا جب لڑکی حقیقت سے ماورائے حقیقت کی سرحد پار کرنے لگی تو وہ گاڑی کے نیچے آ گئی۔ وہ سپنے گرست تھی اس وقت۔

یہ تو ذہنی مرض ہے

شاید آپ صحیح کہتے ہیں کچھ لوگ یہی کہتے تھے کہ وہ لڑکی سکیزوفرینیا کی شکار تھی۔ خود و خدا کے بیچ جھول رہی تھی۔ کچھ کہتے تھے کہ دراصل وہ X زون میں چلی گئی تھی۔ جب خود اور خدا میں کوئی فرق نہیں رہتا

یہ کیوں نہیں کہتے کہ ایسے لوگوں پر کوئی عذاب نازل ہو چکا ہوتا ہے

ہو سکتا ہے کہ ایسے لوگ لسے ورون بجھے ہوں

جیسا کہ مسٹر روشو (ہنستا ہے) خیر اپنی کتھا ہی جاری رکھو۔ وہ کیا کہتے ہیں آج کل کے اپار کاوسے میں جادوئی حقیقت نگاری

آپ اسے جو چاہے کہیں۔ نوتی ہیجان مریضانہ اسرار کی عبارت کا محض وہم یا خیالی خبط لیکن اس رات ان کا کمرہ یادوں کا مسکن بن گیا تھا یا مرگھٹ لیکن پھر اس کمرے میں مسٹر روشو نے کسی کو نہیں آنے دیا۔ بارش بدستور جاری تھی۔ ٹین کی چھت پر کوئی بلی بین کر رہی تھی۔ اچانک وہ بلی کود کر کمرے میں آ گری اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئی۔ نہ جانے کون کون اس اندھیرے میں منہ لپیٹے رو رہا تھا اس کمرے میں اس رات (چائے خانے سے لوگ رفتہ رفتہ جانے لگے تھے۔ چائے خانے کے بند ہونے کا وقت قریب آ رہا تھا اور مسٹر روشو کی داستان انجام کو پہنچنے والی تھی)

صبح مسٹر روشو نے کھڑکیاں کھولیں۔ آسمان صاف ہو گیا تھا۔ دھوپ کی ایک کرن کمرے میں دیوار سے اتر کر فرش پر چلنے لگی۔ نیلے آسمان پر قوس قزح کے رنگ چھا گئے تھے دن بھر مسٹر روشو اس شہر کے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومتے رہے اور رات کی گاڑی پر سوار ہو کر اس شہر میں آ گئے۔ جو ان دنوں ایک قصبہ تھا۔ خیر اب تو یہ خوب بس گیا ہے۔ ملوں کارخانوں کا دھواں، ٹرکوں اور بسوں کا دھواں شہر کے گلی کوچوں اور گھروں میں غبار سا گھومتا رہتا ہے۔ مسٹر روشو نے محسوس کیا کہ اس دھوئیں میں انہیں اپنا چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس شور میں انہیں اپنی آواز سنائی نہیں دیتی لیکن اگر ان کو کہیں سکون ملتا تو اس چائے

خانے میں۔ اس دن وہ چائے خانے میں بڑی دیر تک بیٹھے رہے۔ جب چائے خانہ بند ہونے لگا تو وہ اپنی کرسی سے اس طرح اٹھے جیسے کہ ان کی پیٹھ پر کوئی بھاری چٹان رکھ دی گئی ہو۔ وہ کچھ تھکے تھکے سے لگتے تھے۔ وہ بوڑھے تو تھے ہی لیکن اس دن وہ اپنی عمر سے کئی برس اور پرانے ہو گئے تھے۔ وہ اپنی گلی کی طرف واپس جانے لگے جو اس چوراہے کے پار اس باغ کے پیچھے تھی۔ وہ اپنے کمرے کو گلی ہی کہتے تھے۔ اس دن شہر میں بڑا تناؤ تھا جس چوراہے کو پار کر کے وہ اپنے کمرے میں جاتے تھے اس پر پولیس کا پہرہ تھا۔ شہر کے دو گروہوں میں اس چوراہے پر بت نصب کرنے پر تناؤ بڑھ گیا تھا۔ ایک گروہ کے مطابق چوراہے کی زمین شہر بننے سے کئی برس پہلے ان کی ملکیت تھی جب یہ نیا نیا قصبہ تھا اور دوسرا گروہ اس پر ایک یادگار مجسمہ نصب کرنا چاہتا تھا۔ ایک سڑک پر چائے خانہ ہے اور چوراہے کو پار کر کے اس کے مقابل سڑک پر پولیس کی بکتر بند گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دائیں اور بائیں کی سڑکوں پر مخالف گروہ شام سے ہی جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دن میں چھرا گھونپنے کی دو چار وارداتیں ہو چکی تھیں۔ پہلے تو پولیس کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔ جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تو اس نے لاٹھی چارج کیا۔ پھر آنسو گیس چھوڑی اور آخر گولی چل گئی۔ گولی باری میں کئی لوگ زخمی ہو گئے۔ دو کی جائے واردات پر ہی موت ہو گئی۔ تیسرے نے اسپتال جاتے ہوئے ایمبولنس میں ہی دم توڑ دیا۔ اس تیسرے کی شناخت نہیں ہو سکی۔ لہٰذا لاوارث قرار دے کر اس کی لاش جلا دی گئی۔ دوسرے دن ایتوار تھا۔ اور ایتوار کو مسٹر روشو چائے خانے نہیں آتے تھے۔ جب کہ اس کے اگلے دن بھی نہیں آئے تو ہمیں تشویش ہوئی۔

ممکن ہے جہاں وہ جاتے تھے وہیں رہ گئے ہوں۔ یا کئی دن سے

وہ ہر ایتوار کو جاتے کہاں تھے؟ شاید کچھ پتا چل جائے

"یہ تو معلوم نہیں، کچھ کا خیال ہے کہ وہاں جنگلوں میں ان کا کوئی دوست روپوشی کی زندگی بسر کر رہا ہے اس سے ملنے جاتے ہیں۔ اس پر تشدد آمیز کارروائی کرنے کا الزام ہے۔ پولیس اس کا تعاقب کر رہی ہے

"دہشت گرد یا نکسل وادی؟"

معلوم نہیں۔ کسی کی رائے ہے کہ وہاں کسی لڑکی سے ملنے جاتے ہیں۔

"محبوبہ!"

"معلوم نہیں۔"

لیکن وہ وہاں پہاڑی علاقوں میں گری جنوں میں سوشل ورک کرتی ہے۔ معلوم نہیں کہاں سے آئی ہے لیکن وہیں بس گئی ہے

یہ معاملہ کچھ پیچیدہ نظر آتا ہے

لیکن کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ وہاں کسی پیر فقیر کی قبر ہے۔ جب جنگل کٹ رہے تھے اور بارشیں شروع ہو گئیں تو ایک چٹان کھسک کر ان پر گر پڑی اور وہ اس کے ملبے کے نیچے دب گئے۔ وہیں ان کی قبر بن گئی۔ مسٹر روشو ہر ایتوار کو اس فقیر کی قبر پر پھول چڑھانے جاتے ہیں۔ سچ کیا ہے کوئی نہیں جانتا

آخر مسٹر روشو کی شناخت کیا ہے؟ میرا مطلب ہے آخر اس کی کوئی نہ کوئی آئی ڈینٹی تو ہو گی شاید یہ جان کر ان کے اس طرح غائب ہو جانے پر کچھ روشنی پڑے

یہی سوال تو ہم سب کو پریشان کر رہا ہے کہ ان کی آئی ڈینٹی کیا ہے

جب وہ آخری بار چائے خانے میں آئے تھے تو جیسا کہ میں بتا چکا ہوں وہ کچھ پریشان سے نظر آ رہے تھے۔ اس روز وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے۔ سچ کیا ہے میں نہیں جانتا۔ ہاتھ میں بم بندوق یا ہو دے لیے ان لوگوں کی بیا کر دینا جنہیں ہم اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ یا ایک ہاتھ میں کتاب لیے اور دوسرے میں دوا کی شیشی۔ دن رات ان لوگوں کی خدمت کرنا جنہیں روگ اور الم سے نجات چاہیے۔ یا جسم سے پرے روح کی نجات۔ لیکن سچ یہ بھی ہے کہ روح کی نجات کا راستہ جسم سے ہو کر گزرتا ہے یا اپنے جسم کو فنا کر دینا عشق میں، عبادت میں۔ میرے من میں اتنا سچ کبھی نہیں تھا جتنا آج ہے اس پل۔

تھوڑی دیر مسٹر روشو خاموش رہے۔ پھر بولے۔ شاید سفرنگ (suffering) سے بڑا سچ کوئی نہیں۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔

سوچ رہا ہوں۔ یہ خواب ہے یا حقیقت تھا یا افسانہ یا زندگی سے بھاگنے کا بہانہ

یہی ہوتا ہے جب گم شدہ پرندے کا بکھر جاتا ہے آشیانہ

ہاں تو یہ بتایئے کہ مسٹر روشو کا کوئی پتا چلا

نہیں۔ چوراہے اور سڑکوں پر ہر چیز ٹوٹی پھوٹی بکھری پڑی تھی۔ بائیکوں، لوہے کی چھڑوں، چاقوؤں، خنجروں اور کٹے سروں کے بیچ۔ ایک گروہ کی بنائی ہوئی چاردیواری کی اینٹوں اور دوسرے گروہ کے نصب کردہ مجسمے کے ٹوٹے پتھروں، چپلوں، جوتوں، آنسو گیس کے خالی کینوں اور خالی کارتوسوں اور جلتے گولوں کے بیچ ایک بیگ ملا اور اس سے تھوڑی دور ایک تصویر پڑی تھی۔

اس بیگ سے کچھ پتا چلا۔ آپ نے بتایا تھا کہ مسٹر روشو جب چائے خانے آتے تھے تو ان کے پاس ایک کالا چرمی بیگ ہوتا تھا۔ وہی بیگ جو ہر بار گھر اور شہر چھوڑنے کے وقت ان کے پاس ہوتا تھا۔

یہ تو ٹھیک ہے لیکن!

اس بیگ کی اندر کی چیزوں سے تو یقیناً کوئی سراغ مل سکتا تھا

بیگ تو خالی تھا۔ بس ایک کتاب تھی۔ ورق ورق۔ اس کے پنے بہت جھڑ کے پتوں کی طرح پیلے پڑے تھے بالکل خستہ۔ چالیس پچاس برس تو پرانی ہو گی ہی۔ اس کی عبارت بھی نہیں پڑھی جا سکتی تھی۔ اور پھر اردو میں تھی۔

"اور تصویر!"

تصویر تو بالکل ہی نہیں پہچانی جاتی تھی۔ سیپا رنگ تصویر تھی۔ دھول میں اٹی ہوئی مٹی میں سَنی سی۔ بارود کے دھوئیں سے سیاہ کی ہوئی۔ خون کے جمے ہوئے کالے دھبے۔ جوتوں کے روندی ہوئی۔ اس تصویر پر کس کا چہرہ تھا کچھ صاف نہیں تھا۔ اس پر جیک بوٹوں کی چھاپ تھی۔

لیکن آپ مسٹر روشو کے بارے میں یہ سب کچھ کیسے جانتے ہیں

اصل بات یہ ہے کہ وہ میں ہی تھا جو ان کے سامنے کرسی پر بیٹھتا تھا۔ جس سے وہ باتیں کرتے تھے۔ جس کے لیے وہ کافی منگواتے تھے

لیکن آپ تو کہتے تھے کہ وہاں دوسرا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ کرسی خالی ہوتی تھی

وہ شخص یعنی داستان گو کچھ نہیں بولا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ دھول اور مٹی میں اٹا ہوا سا ہوا بارود کے دھوئیں سے سیاہ چہرے پر جمے ہوئے خون کے کالے دھبے۔ جوتوں کے روندا ہوا۔ اور اس پر جیک بوٹوں کی چھاپ تھی۔ اسکا چہرہ تصویر بن گیا تھا۔ میں نے دہشت میں آنکھیں بند کر لیں۔ جب دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں اور انگلیوں کے بیچ سے جھانک کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ نہ چہرہ نہ تصویر۔ کرسی خالی پڑی تھی۔ میز پر کافی پڑے پڑے ٹھنڈی ہو چکی تھی

چائے خانہ بند ہونے جا رہا تھا۔ لوگ باگ اٹھنے لگے تھے۔ بتیاں بجھنا شروع ہو چکی تھیں۔ ایک آخری بلب جل رہا تھا جس کی روشنی کا گولا میز پر پڑا تھا۔ اور اس گولے کے آئینے میں ایک شخص کے خد و خال نمایاں ہونے لگے۔ بالکل ویسی ہی تصویر سے اچانک وہ چہرہ مسکرا دیا۔ وہ مائی گاڈ۔ یہ میرا چہرہ تھا۔ میز کے اوپر والا بلب ایک دم بجھ گیا۔ اور وہ چہرہ اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا۔ میرے کندھے پر کسی نے پیچھے سے ہاتھ رکھا تو پھر چلیں مسٹر روشو۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اچانک زور کا دھماکہ ہوا جیسے کوئی بم پھٹ گیا ہو۔ چائے خانہ کھنڈر بن چکا تھا۔

اور میں اس میں کسی بوسیدہ خانقاہ میں کسی عمر رسیدہ فقیر کی طرح بیٹھا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے کرسیوں، میزوں اور ملبے کے بیچ سے گزرتا بار بار ٹھوکر یں کھاتا چائے خانے سے باہر نکل آیا

میرے پیچھے چائے خانے کی سب بتیاں بجھ چکی تھیں اور باہر سامنے سڑک پر لاوس کی لمبی رات سیاہ سانپ سی بل کھائے پڑی تھی

اور اس سانپ کا منہ ایک انت ہین اندھی سرنگ کی طرح کھلا تھا۔

بقیہ: شمیم حنفی

گروہوں، مسلکوں، جلسے جلوسوں سے ہمیشہ الگ اور دور۔

اس تنہا روی نے انور صاحب کو کتنے دکھ دیے اور کتنی آزمائشوں سے گزارا اس کے بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں۔ شاید ان کے قریبی دوستوں کو بھی پتا نہ ہو گا۔ تاہم اس بات کا اندازہ انور صاحب کو دور سے دیکھ کر بھی لگایا جا سکتا ہے کہ زندگی کے بارے میں، دنیا کے بارے میں اور آج کی ہولناک، قدرے مضحکہ اور بد صورت انسانی صورت حال کے بارے میں گمبھیر اور گہرے سوچ بچار کی عادت انور صاحب کو کچھ اپنے اکیلے پن کے باعث بھی پڑی تھی۔ تنقیدی اور آسو وانی مضامین کے علاوہ انور صاحب کے افسانوں .... گیت اور انگارے (۱۹۵۲ء) 'شیشوں کا مسیحا (۱۹۵۵ء) 'کیوبس کا صحرا (۱۹۷۳ء)' پرندے اب کیوں نہیں اڑتے (۱۹۹۲ء) اور ناول 'خوشبو بن کے لوٹیں گے (۱۹۸۸ء) جسے جدید شاعر اور آرٹسٹ ریاض لطیف نے انگریزی میں منتقل کیا ہے' ان سب کے مطالعے سے بھی اپنی آگہی اور دنیا شناسی کے باوجود انور صاحب کی تخلیقی تنہائی اور خودروی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ رومانیت کی ہلکی سی دھند ان کے احساسات پر چھائی ہوئی ہے۔ خارجی حقیقتوں کے مشاہدے پر ان کی بصیرت کا انحصار نہیں ہوتی اور وہ اپنے ماحول کے علاوہ اپنے کرداروں کے باطنی منظر نامے تک پہنچنے کے جتن بھی کرتے رہتے ہیں۔ انور صاحب نے اپنی تحریروں میں بہت اضطراب آسا اور فضا سے طوفان خیز تجربوں کی عکاسی کی ہے لیکن ان کی عام شخصیت کی طرح ان کی کہانیوں، مضمونوں میں بھی ایک خاص پاس وضع کا رویہ نمایاں ہے۔ انور صاحب کی آواز گہری، گونجیلی اور بھاری ہے لیکن ان کا لہجہ ہمیشہ دھیما رہتا ہے۔ وہ کبھی اونچے سُروں میں نہ لکھتے ہیں، نہ باتیں کرتے ہیں، نہ زندگی گزارتے ہیں۔ ایک ٹھہراؤ، ایک ضبط کا احساس، ایک تردد اور تکلف کی کیفیت بالعموم ان کی تقریر اور تحریر کے تعاقب میں رہتی ہے۔ وہ بیند و ستیا رتھی پر اپنے مضمون "دیوگندر ستیارتھی سے آگ دیو کی آخری ملاقات" کا خاتمہ انور صاحب نے امبرتو ایکو کے اقتباس پر کیا ہے:

"It is very late. I left Paris this morning. I left many clues. They've had time to guess where I am. In a little while, they'll be here. I would have liked to write down everything I thought today. But it they were to read it, they would only derive another dark therory and spend another eternity trying to decipher the secret message hidden behind my words. It's impossible"

یہ اقتباس اس سے آگے بھی جاتا ہے مگر میری بات شاید پوری ہو چکی ہے

دیویندر اسّر کی افسانہ طرازی

مہدی جعفر

دیویندر اسّر حقیقت اور ماورائے حقیقت کا ملا جلا منظرنامہ پیش کرتے ہیں۔ جس میں کبھی حقیقت کا تناسب بڑھ جاتا ہے اور کبھی خوابناک حقیقت حاوی ہو جاتی ہے۔ ان کے یہاں زمانے کی نئی حقیقتوں کے ادراک اور ان کے تخلیقی رد عمل کا معاملہ ہے۔ ان کا فن آدمی کی ذات کے تعلق سے احساس کی اجنبیت اور "دوسرے پن" کو اپنی تخلیق کے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ ساجدہ زیدی کا خیال ہے "(ان) کی نگاہیں ظاہری واقعات، حادثات، کرداروں اور زندگی کے نشیب و فراز کے تنوع کے باہر کچھ اور تلاش کر رہی ہیں، کچھ ان کہی سچائیوں کو گرفت میں لینے کے لئے سرگرداں ہیں، ایسی واردات اور کیفیات کی نقاب کشائی کرنا چاہ رہی ہوں جو اپنی سرشت میں مبہم اور گریزپا ہیں۔" اسّر کے افسانوں پر لکھتے ہوئے ساجدہ زیدی گریزاں کیفیات کا پتہ لگاتی ہیں۔ یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ اسّر کے فن میں باطنی مظہریت کا ظاہری ارتباط ہے اور پرچھائیوں کو گرفت میں لینے کا ہنر ہے۔ ان کے افسانوں کا راوی کبھی کبھی خود سایہ بن کر قاری کو مشکل میں ڈال دیتا ہے کہ سایا سا جو گھیرے اس کو پکڑنا مشکل ہے۔ مصنف نہ صرف ذہنی اور ماحولیاتی پرچھائیوں کا تعاقب کرتا ہے بلکہ اس کے بعض کردار زندگی کے پُرفریب رویوں، حقیقی احساسات، اشیا اور مبہم اور موہوم روشنی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ ایک افسانہ "پرچھائیوں کا تعاقب" ہے۔ "بہت برس بیت گئے اس بچے کو کھوئے ہوئے۔ اس کے ماں باپ نے بتلایا کہ اسے تتلیاں پکڑنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک کالی تتلی اس کی کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ لگی بیل پر آکر بیٹھا کرتی تھی۔ جوں ہی وہ اسے پکڑنے کی کوشش کرتا وہ اڑ جاتی تھی۔ کئی دنوں تک ایسا ہی چلتا رہا۔ وہ اسے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھاتا، تتلی اڑ جاتی تھی۔ ایک دن اس نے چپکے سے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں اس تتلی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ تتلی کبھی ایک پودے پر بیٹھتی کبھی دوسرے پر۔ وہ ہاتھ بڑھاتا، وہ اڑ جاتی..... پھر وہ شاید اس کے پیچھے پیچھے بہت دور نکل گیا تھا۔ اس کے ماں باپ نے بتلایا کہ انہوں نے اس کی بڑی تلاش کی لیکن وہ نہیں ملا۔ لیکن اس دن کے بعد وہ کالی تتلی بھی نظر نہ آئی۔" کالی تتلی ایک حقیقی شے بھی ہے اور استعارہ بھی۔

کالی تتلی کا کپاس سے ابھرنا ایک خوش نما منظر ہے کہ سیاہی کا حسن سفیدی کے حسن سے دوبالا ہو جاتا ہے۔ ایک کھنچاؤ، کشش ہے جو بچے کو تتلی کے گھیرے میں ڈال دیتی ہے۔ اس کے انسانی احساس میں جان ڈال دیتی ہے۔ بچہ تتلی کی دھن ہی میں کھو جاتا ہے۔ یہ زندگی یا زندہ ہونے کی طاقت ہے۔ میں ڈاکٹر گرچرن سنگھ کے کہانی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے ان کے اس نتیجے سے اختلاف کرتا ہوں کہ ایک کا خاتمہ ایک کی روشنی کا باعث ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے

اسّر کا سلوک اس کے برعکس ہے۔ انہوں نے افسانے میں سفید کپاس سے سیاہ تتلی کی نمود اور وجود آشکار کیا ہے جس کے بالمقابل پانکی ہے، جس میں بے درد حملہ آورانہ کشش ہے۔ یہ دنیا کا رویہ ہے۔ نوعی کپاس اور وہی تتلی جو کھاد سے کی جان ہے۔ مگر ان بصری پیکروں کے واسطے سے اسّر داخلی اور خارجی رنگ و روپ کا تضاد پیش کرتے ہیں تاکہ یہ کہا جائے کہ چیزیں اصل میں کیا ہیں اور دنیاوی سطح پر ان کا کس طرح استعمال اور استحصال کیا جاتا ہے۔ اشیا کو ظاہری عنوان سے پیش کرتے ہوئے ان کی مظہریاتی سطحوں یا ان سے متعلق داخلی ازلی اور بے کراں احساسات کو ابھارا گیا ہے۔ اکثر راوی یا کوئی کردار تشکیل کے عمل (Transcendence) سے گزرتا ہے۔ (میرا جسم جنگل بن چکا تھا۔ اس کے اندر جنگل تھا) یا داخل میں سفر کرتے ہوئے غرق محسوس کرتا ہے۔ اسا سواتی صورتحال کا درد و صدمہ انہیں بے چین کر دیتا ہے۔ جنگل، ریگستان، تتلی کا تعاقب، پرچھائیاں، سدھارتھ، ملن، کھیت، چاند اور چاندنی جیسے استعاروں سے انہوں نے اپنے افسانوں کے میڈیم کو نکھارا ہے۔ اپنی رائٹر بلڈنگ کی اوٹ سے پہلے ماہتاب کا نکلنا (مجازی طلسم آلودہ سے مناسبت) ازلی حقیقتوں سے گریز پائی کا صدمہ پہنچاتا ہے۔ چاندنی کی ازلی حقیقت "پرچھائیوں کا تعاقب" میں کامیابی سے پیش ہوئی ہے اور اس کا تعلق عورت (نوبیاہتا دلہن) کی داخلی مدہم نورانی حسی لطافت سے قائم کیا گیا ہے "ایک بار شرد پورنما کی رات وہ ..... کھڑکی کے پاس کھڑی پورے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے کھڑکی کی سلاخوں سے اپنے دونوں بازو باہر پھیلا دئے جیسے پورے چاند کو اپنی بانہوں میں سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہے..... اور پھر اس نے چپکے سے دروازہ کھولا، آنگن میں تلسی کے پودے کے پاس بہت دیر تک چاندنی میں بھیگتی رہی اور پھر دبے پاؤں چاند کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔"

بچہ کالی تتلی کے پیچھے چلتے چلتے گم ہو جاتا ہے تو دلہن چاندنی بکھیرنے والے چاند کے پیچھے بھاگتے بھاگتے گم ہو جاتی ہے۔ غور طلب بات ہے کہ ان منظری پیکروں کے ڈانڈے یونگ کے اجتماعی لاشعور سے ملتے ہیں جو صدیوں بلکہ لاکھوں برس سے انسانی احساس کی پرورش کر رہا ہے اور جہاں سے "خوشبو بن کر لوٹنے" کی بھرپور امید ہے۔ اس تجسیم سے ہٹ کر اگر ہم اسّر کی فنکاری پر توجہ دیں تو ان کی سایہ سا گرفت پر حیرت ہوتی ہے۔ یوں اسّر حیرت جگاتے ہیں۔ ایسی حیرت جس میں ماورائے حقیقت والی حقیقت ہوتی ہے۔ اس میں نئی نویلی دلہن کے لطیف احساس کو الفاظ میں اسیر کیا گیا ہے۔ ایک طرف "وہ سائز ریلوے اسٹیشن" میں برتی گئی ستارہ وار تو جو سگریٹ سلگا کر لمبا کش لیتی ہے اور فلمی انداز کی فیشن زدگی اور نمائش میں جلا ہے یا "جنگل" کی ملال ہے یا "سدھارتھ" کی شعور انسانی فیشن زدہ اسّر ہے جس نے اپنے عورت پن کے اوپر فیشن کا خول چڑھا لیا ہے اور معنوی زندگی کی فضا میں اڑتی پھرتی ہے اور چاندنی سے محروم ہے تو

دوسری طرف "پرچھائیوں کا تعاقب" کی دلہن ہے جو اپنے زیورات کو اتار کر فرش پر پھینک دیتی ہے اور دونوں بازو پھیلا کر چاند کی جانب لپکتی ہے کہ چاندنی میں ٹھنڈک ہوتی ہے، ملائمت ہوتی ہے، مدھم روشنی ہوتی ہے، رات کو منور کرنے کی خاصیت ہوتی ہے، رات کا حسن ہوتا ہے، ایک سرور کی سی کیفیت ہوتی ہے کہ چاندنی، عورت کا حسن، اس کا وجود ہے۔ عورت کے وجود سے چاندنی چلی گئی تو وہ ملال بن گئی یا جب وہ ملال بن گئی اس کی زندگی کی چاندنی معدوم ہو گئی۔ لہٰذا عورت چاند کے تعاقب میں بہت دور نکل جاتی ہے۔ یہ ایک پُر اسرار کیفیت ہے عدمیت کی صورت حال ہے جسے عہد حاضر کی رواں دواں زندگی کے چہرے پر نقش کر دیا گیا ہے۔ یہ واقعہ یا اسی طرح لڑکے کا واقعہ جو کالی تتلی کے پیچھے بھاگتا ہے اور گم ہو جاتا ہے، ورائے حقیقت ہے۔ سرریت واقعی انداز میں بیان کی گئی ہے۔ یہ سب حقیقت ہوتے ہوئے بھی پُر اسرار ہے۔

سرریت کی رو سے دیکھئے تو "مردہ گھر" میں ایک مردہ ہے جو افسانے کا بنیادی کردار ہے۔ یہ مردہ اپنی زندگی کا احتساب کرتے ہوئے زندگی کی روداد بیان کرتا ہے اور بچپن میں اپنے بڑے بیٹے کے پیدا کردہ جبر کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ یہ استعارہ بھی ورائے حقیقت (سرریلزم) کی حدود میں آتا ہے یا "وے سائیڈ ریلوے اسٹیشن" میں بیشتر حقیقت بیانی ہے مگر آخر آخر میں فنتاسی کا تاثر افسانے کی معنویت کو نمایاں کرتا ہے۔ سرریت کا ایک ماحول سا بن جاتا ہے جو آج کی تہذیب کے کھوکھلے پن کو عیاں کرتے ہوئے اس کی غیر ضروری سرعت رفتار اور دباؤ کا ردعمل پیش کرتا ہے۔ اس ردعمل میں سرریت ہے قدیم سے مطابقت ہے۔ "جب چکنی مٹی کسی برتن، کسی کھلونے کی صورت کی شکل میں بدل جاتی ہے، سوکھ کر کوری ٹھیکریوں میں بکھرنے لگتی ہے تو میرا جنم ہوتا ہے۔ ایک کمہارن کا جنم..... ایک چاک تیز کی کمہارن..... مٹی کو کوئی نہیں مار سکتا۔ مٹی امر ہے۔ شیشم شیشم دم عورت سوہنی جو دور سے بول رہی تھی۔" یہ فنتاسی ہے مگر حقیقت اور اسطوریت سے بہت قریب۔ انور کے ان افسانوں کی سرریلزم میں اڑان نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت کی زمین پر متحرک ہے۔ ان میں میجک ریلزم ہے۔

جہاں میجک ریلزم کی بات آتی ہے اس سے متعلق چند خصوصیات پر روشنی ڈالنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ میجک ریلزم نسبتاً عصری دریافت ہے حالاں کہ یہ اصطلاح جرمن پینٹنگز کی شناخت کے لیے ۱۹۲۵ء میں فرانز روہ (Frans-roh) نے استعمال کی مگر میجک ریلزم کا لفظ ہسپانوی امریکہ میں بعض فکشن کی شناخت کے طور پر چوتھی دہائی کے اواخر میں نظر آتا ہے۔ مغربی ادبی حلقوں میں اس اصطلاح کا چلن ۱۹۸۰ء کے بعد کچھ ایسے فکشن کے لیے استعمال ہونے لگا جس میں حقیقت پر فنتاسی کا انطباق یا دونوں کی باہمی آمیزش تھی۔ جس میں زمانے کی فنی منتقلی (Shift) سمجھے ہوئے پلاٹ یا عینیکا استعمال، خوابوں، اساطیر یا پریوں کے قصوں کا ضمنی یا مستغرق برتاؤ، الجھی ہوئی علمیت (arcane erudition) کے علاوہ حیرت، صدمہ، ابہام اور خوف کی ورائے حقیقت اور اظہاریت اور بیانیہ شعریت شامل تھی۔ میجک ریلزم کے ذیل میں نیر مسعود کے اکثر افسانے آتے ہیں جن میں ورائے حقیقت اور فنتاسی کے عناصر زیادہ ہیں۔ انور کی میجک ریلزم نیر مسعود سے ان معنوں میں بھی مختلف ہے کہ وہ اس کا برتاؤ پورے افسانے کے ساتھ نہیں کرتے نیز انور کے یہاں فنتاسی کا عنصر کم ہے۔ تیسرے یہ کہ انور عام طور پر حقیقت خیز افسانوں کی بافت کے ساتھ میجک ریلزم کا برتاؤ کرتے ہیں جب کہ نیر مسعود خواب یا خوابناک وجودیت کے ساتھ یہ عمل کرتے ہیں۔ انور کے افسانوں میں اساطیر (عموماً کرداروں کے واسطے سے) حیرت، صدمہ، خواب اور time shifts کے علاوہ شعری سرریت ہے۔ ان کی تخلیقی اور فنی جہت کو نمایاں کرنے کے لئے یہاں تین افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے "جنگل" "جیسلمیر" اور "آرکی ٹیکٹ"۔ میجک ریلزم ایک فروعی جزو ہے۔ اصل چیز افسانوی فنکاری ہے۔ انور کہانی بیان کرنے کا فن جانتے ہیں۔ "جنگل" "جیسلمیر" اور "آرکی ٹیکٹ" جیسے افسانے جو قدرے مشکل افسانے ہیں ان میں افسانویت موجود ہے۔ ان کے فن میں ایک عجیب بات ہے کہ ایک افسانہ پڑھیے تو اکثر دوسرے افسانے احساس میں گردش کرنے لگتے ہیں اور ایک مجموعی تاثر پیدا کرتے ہیں بالکل کہ ایک انسلاک قائم کرتے ہیں جس کا رابطہ قدیم سے قائم ہوتا ہے۔

"جنگل" افسانے میں جنگل کی حیثیت پس منظری ہے۔ جنگل کا تصور کرتے ہیں ہے بات چیت میں اس کا عمل اور ردعمل ہوتا ہے۔ اس کی امیج بنائی جاتی ہے کہ بھیانک ہے۔ اس میں خوف کا عنصر ہے۔ یہ بھی کہ اور طرح کے جنگل ہیں اور ان کے پس منظر میں ایک خاص جنگل کی بات ہو رہی ہے۔ اس مخصوص جنگل میں ایک درندے نے کردار نو جو ہوئی ہے اس پر حملہ کر دیا تھا پھر اس نے درندے کی بپا کر دی تھی۔

"جنگل" میں بیان ایک بستی کا ہے جس کی حیثیت پس منظری نہیں بلکہ اس کی آخری سرائے کا منظر نمایاں ہے جہاں افسانے کے سارے کردار اکٹھا ہیں۔ رات کا تیسرا پہر ہے۔ الاؤ ہے، سرائے والا قہوہ ہے، دیوار پر لپکتے ہوئے شعلوں کے سائے میں پرچھائیاں حرکت کرتی ہیں۔ کہانی کی سطح پر سارا بیان استعاراتی بیان ہے جس میں شعری کیفیت ہے۔ بستی کی آخری آماجگاہ، سرائے کے آگے جنگل کا وجود ایک شدید احساس بن کر قاری کے ذہن پر منطبق ہو جاتا ہے۔ بستی کے برعکس ایک بڑے شہر کا نقش ثبت کیا جاتا ہے۔ دلّی۔ وہاں کی خاصیت یہ ہے کہ شدید گرمی پڑتی ہے۔ گرمی کے احساس کی رو سے بڑے شہر کا ردعمل قائم کیا گیا ہے۔ ایک کردار سکھ دوت ہے جس کا وہاں اسٹوڈیو ہے۔ یہ کردار دوسرے افسانوں میں بھی نظر آتا ہے۔ "میرے اسٹوڈیو میں ماڈل کے

بے چہرہ بدن سے پسینے کی بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگتی ہیں اور میں پیاس سے بے حال ہو جاتا ہوں..... میرا اسٹوڈیو اندھا تنگل میں ہے جہاں بجلی کے پنکھے تو ہیں۔ ایئر کنڈیشنڈ نہیں۔ اور گرمیوں میں دن کو اکثر بجلی چلی جاتی ہے۔" انور کے یہاں روزمرہ کے واقعیا سامنے کی بات استعارہ میں بدلتی ہے اسی انداز میں شہری ٹریجڈی کو ابھار کر استعارے میں بدلا گیا ہے چوں کہ "جنگل" کرداروں کے ذہنی اور حسی زاویے سے تخلیق ہوا ہے یہاں مختلف کرداروں کو ایک دوسرے کے زاویۂ نظر سے متعارف کرایا گیا ہے۔ راوی جو ایک دلچسپ اور اہم کردار ہے خود بھی گفتگو میں شامل ہے۔ افسانے کا بیان جمع متکلم یعنی "ہم" سے شروع ہوتا ہے اور "ہم" پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ افسانے کا بیشتر حصہ مکالماتی ہے۔ یکسانیت توڑنے کے لئے بیچ بیچ میں راوی کا بیانیہ شامل ہے۔ جمع متکلم کے ٹریٹمنٹ سے کرداروں کی یکجائی کے ساتھ ساتھ باہمی تفہیم اور مفاہمت کا ماحول قائم ہے۔ کرداروں کے متعلق آغاز میں ہی بتا دیا گیا ہے "ہم الاؤ کے گرد ہم سب جمع تھے۔ میں، 'وہ'، مدام مردول اور سنگھ دوت۔" پھر "ہم" میں سے "وہ" الگ ہوتا نظر آتا ہے۔ "تو تم کل جا رہے ہو؟" ہم نے پوچھا "ہاں" اس نے کہا۔ جب موضوع گفتگو آگے بھیانک جنگل ہونے کی طرف مڑتا ہے تو 'وہ' کہتا ہے "اس سے بھی زیادہ (بھیانک) جو میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔" یہاں ماڈرنیت کا شائبہ ہے۔ اس طرح 'وہ' یعنی راوی کی پُراسراریت ابھاری جاتی ہے۔ بیان میں ایسا ٹریٹمنٹ ہے جس سے کردار غیر مرئی معلوم ہوتا ہے اور اس کے غیر معمولی شعور کا اندازہ کرایا جاتا ہے "(میں اس جنگل کی بات کر رہا ہوں) جس میں اس درندے نے مجھ پر حملہ کیا تھا اور میں نے اس کی بیا کر دی تھی۔" آگے چل کر 'وہ' یعنی رام سرن دوبے عرف تقی علی 'درندے' کی بیا کی طرح ایک ماڈرن آدمی کی بیا کی بات کرتا ہے "جب وہ آیا تو نشے میں دھت تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ قمیص کا کالر کھلا ہوا اور ٹائی کی گرہ ڈھیلی۔ اس نے آتے ہی اسٹریو چلا دیا۔ ڈسکو میوزک بہت پُرشور تھا۔ درندے سے اس شخص کی قائم مقامی آگے آنے والے جنگل کے برعکس عہد حاضر کے جنگل کا استعارہ تشکیل کرتی ہے۔ یہ شخص عہد حاضر ہے یا نوآبادیاتی ملکوں کا استعارہ ہے؟ واقعی یہ بپا ہے یا آزادی حاصل کرنے کا استعارہ؟ جس کے تقاضوں کو ابھارنے کے لئے کہا جاتا ہے "باہر لان میں چاندنی ہری ہری گھاس سے لپٹ رہی ہے"

ہر کردار جنگل کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ اور سنگھ دوت بھی کی آخری سرائے میں آنے کی وجہ تلاش کرتے ہیں۔ شاید کوئی فرار شاید کوئی کشش؟ (یا دونوں نہیں بس یوں ہی) شاید یہ فرار بڑے شہر سے ہے جس کا تمدن بگڑا ہوا ہے جہاں شدید گرمی اور پیاس ہے۔ سنگھ دوت کے اندر تڑپ کر کہتا ہے "تم گرمی سے بھاگتے ہو یا اس ماحول سے یا اپنے آپ سے" ان لفظوں کی گہرائی یا وسعت افسانے کو کھولنے کا کام کرتی ہے۔ اس سہ شعبہ بیان (گرمی، ماحول، خود) میں جائے وقوع منتہا ہو کر پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ پھر بھی جنگل کی طرف مراجعت کا ہلکا ہلکا احساس قائم ہے۔ آگے یہ مکالماتی بیان ہو سکتا ہے گرمی اور ماحول کی نوعیت پر آ جاتا ہے۔ پھر گفتگو صرف ماحول کی وحشت رہ جاتی ہے کہ تمام چیزوں میں شاید ماحول ہی اس فرار کی بنیادی وجہ ہے۔ اب ماحول کا نام بتایا جاتا ہے۔ رانگی۔ اور رانگی کا "بہت دیر سے جسم جلا دیا کر شعلہ سا کچھ اپنی آنکھوں میں تھا۔" رانگی کا ازلی اور زمانی کیف سے اخراج اور ترک اور "دور کی طلب" کی اوس اختیار کرنا عہد حاضر کی ہولناک تبدیلی ہے جسے ایک طرح کا جنگل بتایا گیا ہے "تم کس جنگل کی بات کر رہے ہو" "یہ یا جنگل اصل جنگل نہیں ہے۔ شاید بدلتے ہوئے شہروں کا معنوی یا صنعتی جنگل ہے" "لوگ کہتے ہیں یہ بھیانک جنگل ہے" "کتنا بھیانک" اس نے کہا۔ "اس سے بھی زیادہ جو میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔" انہی باتوں ہی باتوں میں قاری کو ایک جانکاہ تبدیلی کا احساس کراتے ہیں۔ اس جنگل کا احساس قاری کو رانگی سے ماحول کے بدلتے ہوئے طبعی رویہ (behaviour) سے ہوتا ہے۔

سرائے کی جانب مدام مردول کی کشش اور وہ یعنی تقی علی عرف رام سرن دوبے کے فرار کی وجہ مشترک ہے (اور سنگھ دوت کے "ماحول" سے فرار کی وجہ بھی بہت مختلف نہیں کہ یہ وجوہات عہد حاضر سے متعلق ہیں۔) اس شخص سے نجات جو قتل ہونے کے بعد بھی اعصاب پر سوار ہے کیا اس درندے سے نجات ممکن ہے؟ مدام مردول اور تقی علی عرف دوبے کے ذریعے الگ الگ اس شخص کی امیج ابھاری جاتی ہے۔ "جب وہ آیا تو نشے میں دھت تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے ٹائی کی گرہ ڈھیلی تھی۔ آتے ہی اسٹریو آن کر دیا۔" تقی علی اور مدام مردول کے تقریباً ایک جیسے بیان میں مختلف تجربوں کا عکس ہے۔ مدام مردول کا تجربہ "بے حس، بے آواز، بے حرکت، بے رنگ، بے بو اور بے بدن" اور تقی علی کا تجربہ "بے مزہ" جس کی سب تائید کرتے ہیں۔ یکساں بیان کے ذریعے مدام مردول اور تقی علی کی زندگیوں کا اتصال مرتسم ہوتا ہے۔ یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ جس شخص کی تقی علی بپا کرتا ہے وہ دنیا کی خارجیت سے آ کر شاید تقی علی یا رام سرن دوبے کی معنوی اور بے لطف داخلی شخصیت بن گیا تھا جس سے گلو خلاصی کے بعد مدام مردول کا لطیف احساس جاگتا ہے۔ چاندنی جو ہری ہری گھاس سے لپٹ کر اس کی داخلی اور روحانی طلاوت بن جاتی ہے۔ "اور پھر ایک دم چاندنی جیسے سیلاب کی طرح میں امنڈ آئی ہو اور میرے جسم کو اندر گھٹ تک شرابور کر گئی ہو۔" تقی علی کہتا ہے "اور تم۔ تم جو چاندنی میں تحلیل ہو چکی تھیں۔" یا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ گوشت پوست کے کردار نہ ہوں بلکہ ان کی ارواح ہوں۔

وہاں رام سرن دوبے عرف تقی علی اتنا مطلع ہو محسوس کر دیا گیا ہے گویا کردہ قاری کے اندر کا شخص بن کر اسے جھنجھوڑتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ شخص جس کی بپا کر دی گئی ہے قاری کی شخصیت کا ایک غیر ضروری حصہ بن جاتا ہے اور جو ہمارے علاقے کے داخلی احساس سے نکل نہیں کھاتا۔ اس معنوی شخص سے فرار

ایک اضطراری یا حسی ردِعمل ہے جس میں افسانے کے تمام کردار گرفتار ہیں۔ مصنف نے معنویت کو اسکاٹی اکسپریس، اِئی رائز بلڈنگس، فرائے بھرتی سڑکوں، ملال زدگی کی گرمی وغیرہ کے احساس سے قاری کے وجود کو متاثر کرنے کی کوشش کی ہے دوسری طرف قدیم سے گہرا ربط اور اس کی سکون اور تازگی بخشنے والی کیفیات یا امنگ کو مادام مردوں کے حسی تجربے اور فطری جنگل یا گھاس کی ہریالی کے زندگی بخش تصور کے باہمی عمل اور ردِعمل سے نمایاں کرنے کی سعی کی ہے۔ دام مرن دو بے حرف تعمیر کا پُراسرار کردار مرد کے عوام کا قاتل ابھرتا ہے۔ وہ افسانے کے اختتام میں پُراسرار طور پر غائب ہو جاتا ہے اور سرائے کی دیوار پر کوئلے سے لکھا ہوا ہے ''رب ہمارا ماشاءاللہ''۔ امر کی خوبی یہ ہے کہ وہ تجریدیت کی فنکاری میں حقیقت کی زمین پکڑ کر چلتے ہیں۔ حقیقت کی نمائندگی مدھیہ پردیش کی گھاٹوں کی تصویر کشی ہے یا دلی کی گرمی اور وہاں نکل چلے جانے کا بیان ہے، تخلیقی ساخت کے باوجود یہ افسانہ بیان کا تاثر چھوڑتا ہے۔ بیانیہ کی بہتر نثری شعریت میجک دکوم کاننگ گہرا کرتی ہے۔

''جیسلمیر'' افسانے کی تخلیقی حیثیت ذات پر قائم اور منفرد وجودی افسانے کی ہے جس میں بیشتر داخلی کرب کی عکاسی کی گئی ہے۔ پہلے جملے میں افسانے پر روشنی ڈالنے کا عمل ہے جس میں افسانے کا عنوان شامل ہے۔ فورشیڈوینگ میں مصنف کے تخلیقی محرکات کی دلچسپی بنائی گئی ہے تاکہ افسانہ پڑھا جائے۔ ان محرکات کی نمائندگی امر کے دوسرے افسانوں، ذاتی بیانات اور بالخصوص ناول ''خوشبو بن کے لوٹیں گے'' میں کہیں کہیں ہوتی ہے۔ یہ چیز قاری کے لیے افسانے کی پیچیدگی اور بھی کم کر دیتی ہے۔

افسانے کا آغاز (عنوان) اور انجام ہیئت پر قائم ہے۔ درمیان حصے میں برتے گئے تمام احساسات کی حیثیت علاقائی ہے بھی اور نہیں بھی۔ ریت، ڈبل بیڈ، گیلکس، ترکوں کی فوج، ملال، گرل، فلم اسٹار، ہوٹل، ٹوکیو اور جیٹ جیسے لفظ اور بورڈ ریکیو ولی فورس یا کستانی جاسوس، دہشت پسند جیسے تلازمے محیط الوضعیت کی نشاندہی کرتے ہیں اور افسانے کی داخلی حسیت کا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔ عنوان ''جیسلمیر'' (راجستھانی صحرا کا مشہور مقام) کا مفہوم بس وہی ہے جیسے کہ کہا جائے ''ہمارا ڈزرٹ''۔ عنوان افسانے کو اپنی زمین سے جوڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیانیہ میں مرد اور عورت کا داخلی اختلاط سیاسی دکھائی دیتا ہے جو لا درد ہے جو ایک دوسرے پر منطبق ہونے یا ایک دوسرے سے قربت کے باوجود الگ الگ ہے۔ اتصال کا شکشن ڈبل بیڈ کی امیج انجام دیتی ہے۔ افسانے کی تشکیل کا انتظام یوں کیا گیا ہے کہ پہلے بڑے حصے میں مرد اور عورت کی اختلافی کیفیات کو نمایاں کرنے کے لیے ڈبل بیڈ کی قربت یا رتیلے احساس کے باوجود فاصلہ دکھایا گیا ہے۔ درمیانی حصے میں وہ باہم نگر معلوم ہوتے ہیں مگر یقین نہیں آتا کہ ایسا ہی ہے۔ اختتام والے حصے میں مرد اور عورت کے باہم سفر کی خارجیت کو حتمی انداز میں ملا دیا ہے۔ یہ ذرا مشکل مرحلہ تھا جسے فنکار نے ذیل کی کلٹ کی تکنیک سے حل کیا ہے۔ اس سے افسانہ افسانہ بن گیا ہے۔ دیکھنے کی بات ہے کہ افسانہ مرد کے حیاتی بیانیہ سے شروع ہوتا ہے اور سوچنے کی بات ہے کہ امر نے مرد کو افسانہ شروع کرنے کی فوقیت کیوں دی؟ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ آغاز عورت کے بیانیہ سے ہو کر زیادہ دلچسپ ہو جاتا۔ یہ ٹریٹمنٹ ہوتا تو سارا افسانہ زاویہ نظر کی تبدیلی کی بنا پر بدل جاتا۔ کیا عورت سوچ اور احساس کے اس ماحول کو اسی طرح لیتی؟ شاید یہ احساس کا اور بھی مشکل فن ہوتا کہ مصنف مرد ہے اور شاید افسانہ کچھ زیادہ ہی ناقابل فہم ہو جاتا۔ اس طرح دیکھنے سے ہمیں گمان ہوتا ہے کہ شاید عورت کے محسوسات کو اتنی جگہ نہیں دی گئی کہ افسانے کو ضرورت تھی۔ یا یہ کہ فن کاری میں مرد کے اپنے احساسات حاوی ہو گئے ہیں۔ یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ ظاہر ہے امر نے بہت اچھوتے انداز میں داخلی احساسات کی تصویر کشی کی ہے اور بیا اختلاط مصور کیا ہے جس کی گرمی اور آنچ یا اشتعال عہد حاضر کی سیاسی ہڑبڑی اور معاشرتی برتاؤ کی دین ہے۔ اب مشہور انگریزی مقولے we are in hot waters (ہم گرم پانیوں میں ہیں) کے مقام پر کہا جا سکتا ہے ہم جیسلمیر میں ہیں۔ ''جیسلمیر'' کی تکنیک کا تقابل بطراج کمن راؤ کی ''کپوزیشن'' (جس میں اخبار والے لڑکے کو دہرا دہرا کر بتایا گیا ہے) یا دلیپ گر یک کی The Shore سے کیا جا سکتا ہے جہاں بیان بار بار دہرایا جاتا ہے اور ذرا سے فرق کے ساتھ بات کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔ شاید امر کی تکنیک کی یہ مماثلت اتفاقی ہے اس لیے کہ افسانے کی تخلیقیت تکنیک پر حاوی ہے۔ غالباً سست رفتار بیانیہ کے باعث مماثلت کا گمان پیدا ہوتا ہے جب کہ اندرونی اور افسانے کی رفتار خاصی تیز ہے۔ ''جیسلمیر'' کے ضمن میں میں زور دے کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ تجریدی افسانے کی قلب ماہیت ہے۔

یہ افسانہ گیارہ پاروں (پیراگراف) پر مشتمل ہے جنہیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹریٹمنٹ اور اسٹرکچر کا افسانہ ہے۔ تمام پاروں میں پہلے سات پاروں کی نوعیت اس طرح ہے کہ ان میں دو ہی نام کرداروں یعنی ''میں'' (مرد) اور ''وہ'' (عورت) کا یکے بعد دیگرے وجودی اور احساساتی بیان ہے۔ یہ بیان گہرے داخلی اور علامتی نہج پر قائم ہے اور بظاہر یکساں معلوم ہوتا ہے۔ توجہ سے دیکھا جائے تو اس میں مرد اور عورت کے جنسی افتراق سے کوئی بات کہنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ عورت اور مرد کے کپڑوں کے فرق کے علاوہ دونوں کے درمیان زندگی اور احساس کی نوعیت کا فرق ہے۔ مثلاً مرد کے لیے کوئی راستہ نہیں، کوئی سڑک نہیں، کوئی پگڈنڈی نہیں، کوئی پل نہیں، نہ پانی نہ ہریالی جب کہ عورت کے لیے کمرے میں قوم کا نیز بند گلی سے سڑک اور سڑک سے شاہراہ پر آتی ہے۔ اس کے لیے سبز باغوں کی بہاریں ہیں۔ عورت بھی شاید مرد کے اتصال کی وجہ سے ریت کا بستر اور چبھن محسوس کرتی ہے۔ مرد کے ساتھ رتیلے صحرا میں ہرنی کی طرح دوڑتی پھرتی

ہے۔ وہ مرد کے ریشمی گرم احساس کی جگہ پر ریت کے نیلے اور برف کی سل کا احساس کرتی ہے۔ نگلس کا وجود مرد کے لیے اپنے آپ سے باہر ریت پر نظر آتا ہے جب کہ عورت کو خود اپنا جسم کانٹوں بھرا نظر آتا ہے گویا وہ خود ہی نگلس ہو۔ اس طرح سانپ کا وجود مرد کے لیے خود سے باہر چمکتی ہوئی ریت کی بل میں داخل ہوتا اور بل سے باہر آتا دکھائی دیتا ہے جب کہ عورت یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کے بدن کے اندر سانپ داخل ہوتا اور باہر آتا ہے۔ اور یہی فرق ہیں۔

اگر نے مرد اور عورت کے درمیان جسمانی (جنسی نہیں) اور روحانی فاصلے میں 'دوسرے پن' (the other) کی تخلیق کی ہے جو کبھی اصل معلوم ہوتا ہے اور کبھی گمان (illusion) میں بدل جاتا ہے۔ یہ ایک خوابناک مصوری ہے جو حقیقت کو ماورائے حقیقت کی صورت منقش کرتی ہے۔ یہ سر مکلوم ہے۔

آخری دو پاروں (یعنی دس اور گیارہ) جو صرف ایک ایک جملے پر مشتمل ہیں اور افسانوی پہیلی کا کام انجام دے رہے ہیں) کے علاوہ باقی نو پاروں کا انتظام یہ ہے کہ پہلا پارہ جس بیان پر ختم ہوتا ہے ٹھیک اسی بیان کو دہراتے ہوئے اگلا پارہ شروع ہوتا ہے۔

آٹھویں پارے میں دونوں کردار ایک دوسرے میں پیوست ہو کر "وہ (وے)" کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ مگر یہ پارہ راوی کے زاویے سے بیان ہوا ہے۔ اس ٹکڑے کی خاص بات یہ ہے کہ بیان کا بیشتر حصہ عورت کی خارجی حقیقت اور ماحول پر مشتمل ہے۔ "وہ نیم اندھیری گلی کے شام کے جھٹپٹے میں دبے پاؤں نکلی تھی اور دبے پاؤں قدم بڑھاتے گھر سے گلی میں اور گلی سے سڑک پر اور سڑک سے شاہراہ پر آگئی اس کی نگاہوں کے سامنے سبز باغوں کی بہاریں تھیں۔ سیلز گرل سے ماڈل گرل اور ماڈل گرل سے فلم اسٹار اور فلم اسٹار سے وہ اوپر ہی اوپر اڑی جا رہی تھی۔ اوپر اور اوپر۔ اس کے پیروں کو پنکھ لگ گئے تھے۔ اس کے سامنے سارا آکاش تھا۔ ایک ہوائی جہاز سے دوسرے ہوائی جہاز تک۔ ہانگ کانگ، ٹوکیو، سنگاپور، بنکاک، جیٹ سٹ، جیٹ لیگ، وہ اکثر ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تھے۔ کبھی کسی ہوٹل کی لفٹ میں کبھی کسی کمرے کے بستر پر" ماحول میں عورت کے ساتھ خارجی دنیا کا ٹریٹمنٹ ہے۔ پھر اچانک مرد اور عورت ایک ہو جاتے ہیں۔ شاید دونوں کا اختلاط ہے جس میں اپنے کا عمل ہے؟ آدمی کا گولہ ہے اور گلی بستر ہے۔ ابھی افسانہ تکمیل کو نہیں پہنچا بلکہ خط وتعاقب موڑ اختیار کرتا ہے اور خارجیت میں ابھرتا ہے جہاں گولیاں چلنے کی آواز ہے۔ دن دنا دن دن دنا دن۔

نویں پارے میں (آٹھویں کے ٹھیک برخلاف) مرد کی خارجیت کو بتایا گیا ہے۔ (یہ دنیا کا سلوک ہے یا عورت کا اس سے سلوک ہے؟) "گولیوں کی بوچھار شروع ہوگئی۔ یہ مجھ پر کون وار کر رہا ہے؟ یونائیٹڈ سیکیورٹی فورس کا جوان ہوں۔ کون کیا ہے؟ معلوم نہیں۔ کون کس پر گولی چلا رہا ہے؟ معلوم نہیں۔ میں کون ہوں؟ وہ کون ہیں؟ میں کہاں سے آیا ہوں؟ وہ کہاں سے آئے ہیں؟ میں کدھر جا رہا ہوں؟ وہ کدھر جا رہے ہیں؟ سب کچھ ریت میں دفن ہو چکا تھا۔ ریت میرے خون سے سیراب ہو چکی تھی۔ لیکن میرے ساتھ دوڑتی ہوئی ہرنی۔ کچھ پتہ نہیں۔ میں زخمی پڑا تھا۔" وجود ریت کے اس موڑ پر انسانیت کا سوال قائم ہے۔ دسویں اور گیارہویں پارے ایک جملے کا اختتامیہ رکھتے ہیں۔ مرد اور عورت کے درمیان ایک بڑے فاصلے کا وجود ہے۔ دونوں الگ الگ جگہ مرتے دکھائے گئے ہیں۔ جب کہ دونوں کے پاس سے دلی سے وودے پچے کے دل کی گٹھ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ فیوژن کی تکنیک ہے جس میں چیزیں حقیقی ہوتے ہوئے ابہام میں بدلنے لگتی ہیں کہ حقیقتاً یہاں مرد اور عورت کے دو کردار ہیں یا یہ ایک ہی کردار ہے جس کا احساس منقش ہوا ہے یا ایک منزل کے کنٹوں سے ہمارا یہ مفہوم نکالنا کہ آخری دو جملے ایک شخص کے ضمن میں لکھے گئے ہیں اور ایک دوسرے کی قائم مقامی کرتے ہیں اور افسانے میں عورت دنیا کے مفہوم میں استعمال ہوئی ہے ایک طرح کی تعمیم (generalization) ہوگی۔ جو درست نہیں۔ یہاں عورت دنیا سے مختلف بھی نظر آتی ہے۔ مصنف نے دنیا کو ایک فاصلے پر رکھتے ہوئے اپنے تخلیقی تجربوں کا سایہ منقش چھوڑا ہے۔ وجودی واقعیت کے ساتھ مرد کا مفہوم کو بتایا گیا ہے۔ یہ افسانے کی جھلک دکھلوم ہے۔ مگر کہتے ہیں۔ "جب سچ کو چھونے کی کوشش کروں گا تو وہ پھسل کر حقیقت کی حدوں سے باہر سرک جائے گا۔" "جسلیمر" میں جسم اور روح کے تناسل اور تقابل کی پیکر ریت کے منعکس ہونے کے باوصف یہاں کسی طرح کی فلسفہ طرازی سے اجتناب ہے اور چیزوں کو ان ہی دکھایا گیا ہے۔ یہ پلاٹ لیس افسانہ ہے۔

"آرکی ٹیکٹ" کا مرکزی پلاٹ کچھ اس طرح ہے۔ مشغل پرشر بلڈنگ کے نقشے بنانے میں مشہور ہے۔ راوی کے دوست کو اپنا مکان بنوانے کے سلسلے میں نقشے کی ضرورت ہے۔ یہ شخص پرشر سے اس کے دفتر میں ملنا چاہتا ہے کوشش کے باوجود وہ دفتر میں نہیں ملتا۔ وہ پرشر کا گھر تلاش کرتا ہے۔ وہاں جا کر پتا چلتا ہے کہ یہ مشہور آرکی ٹیکٹ کسی اور کے مکان کے اوپر والی برساتی میں مقیم ہے۔ وہاں اس کی حیثیت گمنام ہے۔ ملاقات ہونے پر یہ شخص دیکھتا ہے کہ آرکی ٹیکٹ آرام کرسی پر کوئی کتاب پڑھ رہا ہے۔ اس کی باتوں سے یہ شخص پہلے تو آف ہو جاتا ہے اور شبہ کرتا ہے کہ یہ آدمی نارمل ہے بھی یا نہیں۔ پھر بھی یہ شخص اپنی نقشہ بنوانے کی غرض بتاتا ہے۔ آرکی ٹیکٹ کی گفتگو میں نقشہ بنانے کا خیال ضمنی رہتا ہے وہ عجیب سے اضطراب کے عالم میں بولتا رہتا ہے۔ وہ اس شخص کے بر عکس کیس سے خوف کھاتا ہے۔ درمیان میں اٹھ کر چلے جانا چاہتا ہے۔ باتوں ہی باتوں میں آرکی ٹیکٹ اس واقعے پر آ جاتا ہے جس نے اس کے وجود کو متزلزل کر دیا ہے۔ وہ سامنے والی پانی والی بلڈنگ کا نقشہ تعمیر کرنے کا تذکرہ کرتے ہوئے اور دیکھتے ہوئے وہاں فلیٹ حاصل کر لینے کے بعد کا واقعہ بیان کرنے لگتا ہے وہ جس فلیٹ میں رہتا تھا

اس کے ساتھ والے اپارٹمنٹ میں ایک بزنس والا شخص رہتا تھا۔ اس سے کوئی دعا سلام کی حد تک بھی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ بریف کیس لیے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کسی نہ کسی فلائٹ کو پکڑنے کی تگ و دو میں رہتا تھا۔ اچانک ایک روز اوپر سے کود کر خودکشی کر لیتا ہے۔ نیچے اس کی لاش پڑی ہوتی ہے۔ تھوڑے فاصلے پر کھلا ہوا خالی بریف کیس پڑا ہوتا ہے۔ پولیس کی تفتیش وغیرہ کے بعد قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ آرکی ٹیکٹ پر اس واقعے کا گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ اس منظر کو بھولنے کے لیے گاؤں چلا جاتا ہے۔ گاؤں کے ماحول میں یہ واقعہ اس کے ذہن سے تقریباً محو ہو جاتا ہے لیکن ہر وقت رات میں خواب دیکھتا ہے کہ وہ شخص بریف کیس لیے اپنے شیشوں والے لبادے کے ساتھ مگر ننگے بدن اور ننگے پاؤں سمندر کے کنارے بہت پرے تیز تیز چل رہا ہے۔ کبھی وہ آگے نکل جاتا ہے اور کبھی آرکی ٹیکٹ۔ آرکی ٹیکٹ جب شانوں پر ہاتھ رکھتا ہے تو وہ مسکرا کر سمندر میں کود جاتا ہے۔ کنارے پر وہی خالی بریف کیس رہ جاتا ہے۔

گاؤں سے چلتے وقت ماں اسے تاکید کرتی ہے کہ جلدی آنا۔ وہ اسے چاچی کی چھتری، پھتری ٹوپی اور بلا بھگوت گیتا اور پھلکاری دیتی ہے۔ کھیتی ہوتے رہنے کی تاکید کرتی ہے تاکہ وہ اپنی دھرتی اور پرکرتی سے جڑا رہے۔

جب وہ دلی واپس لوٹتا ہے تو اس اپارٹمنٹ میں نہیں جاتا بلکہ یہاں ٹرلیس پر آرام کرسی پر پڑا اس اپارٹمنٹ کو دیکھتے ہوئے اس شخص کا منتظر رہتا ہے کہ جب وہ بریف کیس کا سامان لینے آئے تو پوچھے کہ اس نے خودکشی کیوں کی۔

یہ ایسا افسانہ ہے کہ جس میں پلاٹ کو مختصر کر دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ افسانہ معدوم ہو جائے۔ بہت کوشش کر کے ایک دو جملے کم کیے جا سکتے ہیں۔ پورے پلاٹ کی حیثیت استعاراتی ہے جس میں ایک عجیب طرح کا درد یا محرومی ہے۔ اس میں صدیوں کی فطری ثقافت کے خلاف عہد حاضر کا برعکس صداقت تصادم پیش کیا گیا ہے جو اضطراب اور انتشار پیدا کرتا ہے۔ اس شخص کی خودکشی کی وجہ شاید یہی ہے۔ یہ فطرت انسانی اور قدرت الٰہی کی میکانزم کے بالتقابل مشینی میکانزم کا صدمہ ہے۔ آدمی کے درد کے رشتے کے خلاف ایک جبر ہے۔ ایک طرف ماں کی ممتا ہے گاؤں اور کھیت میں۔ کھیتی کی فطری ناگزیر ہے تو دوسری طرف اپارٹمنٹ، کمرشل پلازا، الیویٹرز، ہائی رائز بلڈنگ کے پیچھے سے نمودار ہوتا ہوا پیلا اور زرد چاند ہے۔ یہ کلچرل اور نیچرل صدمہ آرکی ٹیکٹ کے دل پر آ پڑا ہے۔

فنکاری کے اعتبار سے قمر نے افسانے کی تہہ داری بڑھائی ہے۔ واقعے کو مرکز میں رکھا ہے۔ بزنس والے شخص کے گرد سے واقعے کا صدمانی اثر چاروں طرف پھیلنے لگتا ہے اور افسانے کے اس میں کو جکڑ کر بدل ڈالتا ہے جو آرکی ٹیکٹ ہے۔ آرکی ٹیکٹ اپنے بیانیہ ماحول اور احساس کی رو یا شعور کے بہاؤ سے اس صدمے کو اس شخص میں منتقل کر دیتا ہے جو اس سے قصہ سنانے کی غرض سے ملا ہے۔ یہ دوسرا اصل، ہے دوسرا اصل، پہلے میں، کی بیانیہ راوی سے اپنے دوست کو اس واقعے کا صدمہ پہنچاتا ہے۔ یہ دوست تیسرا اصل، ہے۔ اب اگر راوی کی حیثیت سے افسانہ دیکھا جائے اور آغاز سے شمار کیا جائے تو گنتی پلٹ جائے گی۔ لہٰذا پہلا راوی وہ ہوگا جو کہانی کی ابتدا کرتا ہے۔ دوسرا راوی اس کا دوست ہے (جس کا نام رام سرن دوبے ہے) اور تیسرا راوی متکلم بزرگ یعنی آرکی ٹیکٹ ہے، جو واقعے کا اول راوی یا چشم دید راوی ہے، جو واقعے میں جسم و جسمانیت کے علاوہ روحانی قوت کے ساتھ شامل ہے، جو طویل جملوں کے پیرائے میں اپنا درد منتقل کرتا ہے اور جو ایک طرح کی ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہے۔ گویا بزنس والے شخص کی بابر راوی در راوی سفر کرتی ہے اور کہانی سے باہر آ کر ایک چوتھے میں، کو گرفتار کرتی ہے جو اس کہانی کا قاری ہے۔ مرکزی واقعہ ایک خاموش حقیقت ہے جس کی اثر خیزی آرکی ٹیکٹ کے طویل بیانیہ مکالموں میں بدلتی ہے۔ احساس اندر سے چھن کر ابھرتا ہے تو افسانے کے آغاز تک جھلکتا ہے۔ شروع میں یہ خوبصورت نرغشت دوست کا نمیں، کہتے رہنا یا خاموش رہنا ایک بار یاں کہتا ہے۔ ایک طرف طویل مکالموں کی ہذیانی کیفیت دکھاؤ منعکس کرتی ہے تو دوسری طرف خاموشی اور یک لفظی مکالموں سے درد کی گھٹن نمایاں ہوتی ہے جس سے پہلا راوی متاثر ہو جاتا ہے۔ مختلف راویوں میں صدمے کی منتقلی افسانے کے اختتام پر فنی تکرار کی صورت کرافٹ کی گئی ہے۔

"جب وہ آئے گا تو پوچھوں گا..... آخر تم نے خودکشی کیوں کی؟"

"لیکن وہ تو مر چکا ہے" میں نے کہا۔

"ہاں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ ایک روز وہ ضرور اپنے اپارٹمنٹ میں واپس آئے گا اپنے بریف کیس کا سامان لینے" وہ خاموش ہو گیا اور پھر کچھ نہیں بولا۔

میں نے اسے شب بخیر کہا اور دھیرے دھیرے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ رات گہری ہو چکی تھی اور نہیں بھی۔ کالی تھی اور نہیں بھی۔ میرا گھر بہت دور تھا اور نہیں بھی۔ یہ کہہ کر میرا دوست خاموش ہو گیا۔

"چائے پئیں گے؟" میرے دوست نے اچانک پوچھا۔

"نہیں بس اب چلتا ہوں" میں نے کہا۔

میں نے اسے شب بخیر کہا اور دھیرے دھیرے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ رات گہری ہو چکی تھی اور نہیں بھی۔ کالی تھی اور نہیں بھی۔ میرا گھر بہت دور تھا اور نہیں بھی۔

یہ کرافٹ تہہ داری پیدا کرتا ہے۔ افسانے کا زیادہ حصہ واقعیت اور حقیقت پر مبنی ہے۔ صرف آخری حصے میں مرنے والے شخص (مرد مظلوم) کی کا ذکر مانی ہے۔ یہاں فنکاری میں اڑان نہیں ہے۔ یہ جگ دکھ مظلوم ہے۔ قمر کا کرب عہد حاضر کا کرب ہے۔

مستقبل کی ممکنہ تخلیق

شمیم حنفی

"بیسویں صدی بیت گئی لیکن مستقبل کے چہرے پر کچھ ایسے مسائل کی چھاپ چھوڑ گئی کہ جب تک ہم ان سے نبرد آزما نہیں ہوتے ہم مستقبل کا اصل چہرہ نہیں دیکھ سکتے .... کوئی بھی معاشرہ، کلچر، ادب، فن اور فلسفہ ماضی کی زندہ روایات کو نظر انداز کر کے مستقبل کی ممکنہ تخلیق نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمیں اس امر کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ محض ماضی کی بنیاد پر ہی مستقبل کی تعمیر نو نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے فیوچرسٹک فکر کا ہونا لازمی ہے جو کہ اب باقاعدہ سائنس اور علم کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ اس کے لیے روایت کا پاس اور جدت (Innovation) کا جذبہ دونوں درکار ہیں۔"
(دیویندر اسر .... نئی صدی اور ادب، ۲۰۰۰ء ص ۷)

اسر صاحب کا مکالمہ اپنے ماضی سے بھی ہے اور مستقبل سے بھی اور یہ عمل پچھلے تقریباً ساٹھ برسوں سے جاری ہے۔ (پہلی کہانی کی اشاعت ۱۹۴۲ء لاہور)۔ ادب، نفسیات اور ماس میڈیا ان کی ذہنی اور تخلیقی سرگرمی کے تین خاص دائرے ہیں۔ انہوں نے تعلیمی اعتبار سے خصوصی تربیت معاشیات کے میدان میں حاصل کی۔ لیکن انہوں نے اپنے آپ کو زندگی کی تفہیم و تعبیر کے کسی ایک منطقے تک محدود نہیں رکھا۔ ان کا رویہ اس معاملے میں بین العلومی ہے۔ ادب، آرٹ، سماجی اور سائنسی علوم، فلسفہ اور نفسیات، اسی طرح اساطیر اور تاریخ، مارکسزم اور انتھروپولوجی، روایات اور انفارمیشن ٹیکنالوجی .... ان سب کے ساتھ وہ کم و بیش ایک سا ربط رکھتے ہیں۔ ادبی رسائل اور اخبارات کا مطالعہ ایک سی دلجمعی کے ساتھ کرتے ہیں۔ مہانگری کی بے چہرہ بھیڑ سے ہراساں نہیں ہوتے لیکن تنہا رہتے ہیں اور خود اپنے ساتھ زندہ رہنے کا گر جانتے ہیں۔

اسر صاحب غیر منقسم ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے (۱۴ اگست ۱۹۲۸ء کیمبل پور مغربی پنجاب)۔ مرزا حامد بیگ نے اٹک میں اپنے قیام کے دوران ایک دستاویزی حیثیت رکھنے والا جریدہ ترتیب دیا تھا اور اس میں اسر صاحب سے متعلق ایک خصوصی گوشہ رکھا تھا۔ تقسیم کے بعد اسر صاحب ہندوستان چلے آئے۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے انہوں نے الٰہ آباد کا انتخاب کیا جو کئی اعتبارات سے پورے برصغیر میں نہیں، پورے مشرق میں ممتاز تھی۔ ایک زمانے میں یہاں عالمگیر شہرت رکھنے والے علما اور اساتذہ پائے جاتے تھے۔ ان میں سوئیڈش اکیڈمی کے چند اراکین بھی تھے۔ روایت ہے کہ یہودیوں پر منصوبہ بند مظالم کے دور میں ایک بار آئن سٹائن نے بھی الٰہ آباد یونیورسٹی کے طبیعیات کے شعبے کو اپنی علمی سرگرمی کا مرکز بنانے کا ارادہ باندھا تھا۔ معلوم وجوہ کی بنا پر یہ تو ممکن نہ ہوا البتہ اسی شہرۂ آفاق شعبے سے ہمارے زمانے میں آر ایس ایس کے سربراہ پروفیسر راجندر سنگھ اور بابری مسجد انہدام کے المیے سے منسوب و معروف این ڈی اے وزیر ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی جیسے نخبات روزگار بر آمد ہوئے۔

عجیب تضادوں سے بھرا ہوا ماحول تھا الٰہ آباد شہر اور یونیورسٹی دونوں کا۔ ایک طرف جن سنگھی اور مسلم لیگی مزاج رکھنے والے اصحاب تھے جن کا حلقہ کبھی وسیع نہ ہو سکا۔ دوسری طرف لبرل فکر کے مالک روشن خیال اور ترقی پسند دانشور۔ ہائی کورٹ کے کئی جج، کلاسیکی ادیب، یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ، سماجی کارکن یونیورسٹی اور شہر کے ماحول پر چھائے ہوئے تھے۔ اسر صاحب کے شعور نے اسی ماحول میں سانس لی۔ معاشیات کا شعبہ جس سے وہ بطور طالب علم وابستہ ہوئے الٰہ آباد یونیورسٹی کے سب سے اچھے شعبوں میں تھا۔ پروفیسر جی کے مہتہ، پروفیسر پی سی جین کی شہرت دور دور تک تھی۔ مہتہ صاحب انتہائی نازک اور دلآویز خط و خال والے، دراز قامت، دبلے، اپنی زردی رخسار کے سبب بہت غیر معمولی، بہت ذہین اور حساس دکھائی دیتے تھے۔ معلوم نہیں کون سی رنج دلی انہوں نے کھینچا تھا، جب بھی دیکھا، بے سکون اور اداس نظر آئے۔ ہمیشہ مغربی لباس میں لیکن ایک عجیب شانِ قلندری اور درویشانہ آنچ ان کے وجود کا حصہ تھی۔ اس بے مثال یونیورسٹی اور اس شہر خوبی سے ہمارا تعلق اسر صاحب کے وہاں سے نکلنے کے چند برس بعد قائم ہوا مگر وہ روشنی اور اضطراب جس سے اسر صاحب الٰہ آباد کے دوران قیام میں دوچار ہوئے تھے اس کے آثار ہم نے بھی دیکھے ہیں۔ نئی رتوں میں پرانے موسموں کی مہک باقی تھی۔

الٰہ آباد یونیورسٹی اور الٰہ آباد شہر، دونوں کا نشانِ امتیاز اس کی رواداری اور وسیع المشربی تھی۔ مختلف شعبوں اور فیکلٹیز کے لوگ آپس میں ملتے رہتے تھے اور علوم و افکار کی دنیا کسی کے لیے یک رخی، بندھی ٹکی اور محدود نہ تھی۔ ادبی نشستوں اور جلسوں میں سماجی علوم، قانون اور سائنس کے اساتذہ بھی شریک ہوتے تھے۔ نہرو خاندان کا آبائی گھر آنند بھون یونیورسٹی کے پہلو میں تھا۔ اسی کمپاؤنڈ میں سوراج بھون۔ یونیورسٹی میں انگریزی کے اساتذہ پروفیسر ستیش چندر دیب (جن کے نام عسکری صاحب نے

تجزیے کا انتساب کیا ہے)' دستور صاحب' فراق صاحب' پروفیسر پرکاش چندر گپت (ہندی کے معروف نقاد اور ادیب جو کبھی یونگ کرسچین کالج آگرہ میں سرور صاحب کے استاد بھی رہے تھے) اردو میں ڈاکٹر اعجاز حسین اور ڈاکٹر حفیظ سید' ہندی میں پروفیسر رام کمار ورما' سنسکرت میں پروفیسر دھریندر ورما' فارسی' عربی' قانون' تاریخ' سیاست اور ریاضی' اطلاقی طبیعیات' کیمیا' جغرافیہ میں کئی نامور اساتذہ موجود تھے۔ شہر کی رونق ہندی اردو کے متعدد ممتاز ادیبوں' دانشوروں اور صحافیوں کے دم قدم سے تھی۔ مہاکوی نرالا' سمترا نندن پنت' ہری ونش رائے بچن' مہادیوی ورما' نری کرشن داس' الاچند جوشی' رام چندر ٹنڈن' ڈاکٹر عبدالستار صدیقی' اوپیندرا ناتھ اشک' بلونت سنگھ جو افسانہ نگار رہے تھے' محمود احمد ہنر (شاعر' نکار کے مدیر کی حیثیت سے معروف) بھیرو پرساد گپت' "کہانی" کے مدیر اور معروف ہندی کہانی کار' ان کے علاوہ منشی پریم چند کی وراثت کے امین ان کے بیٹے سری پت رائے اور امرت رائے جو بنارس سے "ہنس" نکال رہے تھے مگر بہ ہر الہ آباد آتے رہتے تھے..... غرض کہ ایک جگمگ جگمگ کرتی کہکشاں تھی۔ 'لیڈر' اور 'امرت بازار پتریکا' کی وجہ سے الہ آباد کو اس دور میں انگریزی صحافت کے ایک مرکز کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ ہندی اردو کے مشہور اداروں میں کتابستان' انڈین پریس' ہندوستانی اکیڈمی' لاہور پرکاشن اور لوک بھارتی تھے۔ 'نیا ساتھی' کے ترجمان نرگس آگرے تھے' پہاڑی تھے' ترلوچن شاستری تھے۔ دھرم ویر بھارتی اور ان گئے تھے۔ پھر ہندی کتھا کاروں کا ایک حلقہ..... ہندی والوں کا پرمل گروپ بھی جسے ہندی کا حلقہ ارباب ذوق کہنا چاہیے' دوسری طرف اعجاز صاحب کی سربراہی میں ان کی کوٹھی 'حسن پر تیرتھ' سے کلب کے ہفتہ وار اجلاس جن میں ممتاز حسین' بلونت سنگھ' رضیہ سجاد ظہیر' (ڈاکٹر) نور الحسن' سجاد ظہیر اور باہر سے آنے والوں میں وامق' راہی' مسعود اختر جمال کی وجہ سے خاص چہل پہل رہتی تھی۔

یہ قصہ اس دور کا ہے جب وقت آج کی جیسی تیزی سے گزرتا نہیں تھا۔ سرور صاحب کے لیے یہ دور ایک بھرپور تجربہ تھا۔ ہمارے حصے میں اس کی آخری بہار آئی۔ لیکن ہم دونوں میں مشترک وہ مذاق اور مزاج ہے جسے دراصل اسی ماحول نے ایک رنگا رنگ اور وسیع پس منظر مہیا کیا تھا۔ سرور صاحب جب بھی اس گزرے ہوئے موسم کی باتیں دہراتے ہیں تو ہمارے لیے بھی دور افتادہ یادوں کی ایک کھڑکی کھل جاتی ہے اور ایک جیتا جاگتا' ہرا بھرا' شاداب کل پس منظر سامنے آجاتا ہے۔ وہ اساتذہ اور معلمین جن سے ہم دونوں نے فیض اٹھایا' مذاکروں' مباحثوں' مجلسوں' سلسلہ در سلسلہ پھیلی ہوئی باتوں کے کتانے بانے سے مرتب ہونے والی وہ زندہ' توانا اور گرم فضا جس میں ہم نے سانسیں لیں' ان سب کا خیال آتا ہے تو ذہن میں گزشتہ اور موجودہ کی آویزش کا ایک عجیب تماشا سا رونما ہونے لگتا ہے۔ الہ آباد گنگا' جمنا' سرسوتی کے سنگم پر واقع ہے۔ پانچ سو سال پہلے اس جغرافیائی تجربے کی برکت سے یہاں دیومالاؤں کے پریاگ سے آج کے عہد وسطیٰ کے الہ آباد کی تاریخ کا جادو کہ اس شہر میں نظریاتی اور اصولی بحثوں اور جھگڑوں کے باوجود دنیا کو اور اپنے آپ کو خانوں میں بانٹنے کی روش کبھی مقبول نہ ہوئی۔ نہرو جی نے "ڈسکوری آف انڈیا" کا پورا خاکہ یہی دیکھی اور ان دیکھی روایت کے سائے میں تیار کیا تھا۔ سرور صاحب کی حیثیت کو اپنی اساس اور پہچان اسی ماحول کے واسطے سے ملی۔ یونیورسٹی کیمپس سے متصل یونیورسٹی روڈ پر کسی زمانے میں صرف چائے خانے تھے اور دنیا جہان کے موضوعات پر کتابوں کے اسٹور۔ سول لائنس میں یونیورسل بک ڈپو جہاں طلبہ' اساتذہ' سماجی کارکن' ادیب' صحافی' وکیل' سیاست داں ہر شام ایک ساتھ دکھائی دیتے تھے اور سامنے کافی ہاؤس میں سجائی جاتی تھیں۔ اسے اینگلو وینلر کے مرکزی دفاتر اور بک اسٹالس کے علاوہ نہرو روڈ کے فٹ پاتھوں پر جابجا پرانی کتابوں کے ڈھیر۔ اس کاروباری اور کثیر پیر معاشرے میں بھی ایک الگ اور مختلف دنیا کے ہونے کی خبر دیتے تھے۔ یونیورسٹی روڈ کے نکڑ پر میور ہاسٹل جس نے ہندوستان کو شاید سب سے بڑی اور سب سے زیادہ آئی اے ایس افسروں کی کھیپ دی' اس کے سامنے چچا حکیم اللہ کی الفت وگنگ لٹریچر کی چھوٹی سی دوکان تھی جہاں نئیں ادھار اور کبھی کبھی مفت کتابیں اور رسالے بھی مل جاتے تھے۔ سرور صاحب بے تحاشا پڑھتے ہیں اور صرف ادب نہیں پڑھتے۔ ان کے گیان دھیان کا مرکز وہ بڑی تخلیقی وحدت ہے جس کی تشکیل میں انسانی تجربوں اور تصورات کے تمام ممکنہ وسائل ایک ساتھ سرگرم ہوتے ہیں۔ اس ہمہ گیر اور مختلف النوع احساسات کو ایک ساتھ جذب کر لینے کی صلاحیت سے مالا مال رویے نے سرور صاحب کو صحیفات' تاریخ اور تجربات سے لے کر علوم حاضرہ تک مطالعے اور تعبیر و تفہیم کے ایک ہزار شیوہ تجربے کا راستہ دکھلایا ہے۔ اپنے مطالعے کی وسعت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے سرور صاحب کا معاملہ اردو کے تقریباً تمام ادیبوں اور نقادوں سے مختلف ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ باقر مہدی سے اور زاہد ڈار سے کچھ مماثلت ٹھہرائی جا سکتی ہے۔ ایک بین العلومی رویہ جو سرور صاحب کی کتابوں مثلاً (۱) جنگل اور ساحل (۲) ساحل اور سمندر (۳) ساحل اور اڑتے پتے بدھ (۴) ساحل اور کہکشاں (۵) بھیڑیے سے سوار (۶) آگ آدمی کا (۷) نئی صدی

اور سائنس (۸) کوئی آواز گم نہیں ہوتی (۹) ادب اور نفسیات (۱۰) ادب اور جدید ذہن (۱۱) مستقبل کے روبرو (۱۲) ادب کی آبرو (۱۳) نئی صدی اور ادب وغیرہ میں صاف جھلکتا ہے۔ اُن کے اسی سوانحی پس منظر کی دین ہے۔ اَمر صاحب اردو، ہندی، پنجابی، انگریزی چاروں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ ان کی تصانیف، تالیفات اور ترجموں کی مجموعی تعداد پچاس سے زیادہ ہے اور یہ سارا کام خود اَمر صاحب کا کیا ہوا ہے، مستعار یا کسی اور کی محنت کا پھل نہیں۔ کبھی کبھی تو واقعی حیرانی ہوتی ہے کہ اَمر صاحب لکھنے پڑھنے کا اتنا بوجھ اٹھاتے کس طرح ہیں۔ انہوں نے یہ ریاضت سترہ برس کی عمر میں شروع کر دی تھی۔ اس وقت وہ پچھتر کے لپیٹے میں ہیں اور ہمیشہ کی طرح پُرتجسس، مصروف اور منہمک۔ اُن کے طالب علمانہ جوش میں ابھی تک کمی نہیں آئی۔

اتنے وسیع پیمانے پر ثقافتی مکالمہ قائم کرنے کی کوشش بھی اَمر صاحب سے آگے ایک باقر مہدی کو چھوڑ کر، کم سے کم اردو کی حد تک تو کہیں اور نظر نہیں آتی۔ اپنا حال غالباً آخری تصنیف 'نئی صدی اور ادب' میں 'مستقبل سے مکالمے' کے تحت اَمر صاحب نے لکھا ہے:

"..... بیسویں) صدی کے ختم ہوتے ہوئے فکری انتشار، تہذیبی پیکار، تخلیقی خلفشار اور میڈیا کی یلغار نے ایسی صورتِ حال پیدا کر دی کہ احساسِ مرگ نے انسانی اقدار پر از سر نو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اگر بات صرف 'موت' پر ختم ہو جاتی تو غنیمت تھا لیکن اسے Binary Oppositions کے نام پر کچھ اس طرح سے عمل میں لایا جانے لگا کہ تفریقات تفرقات میں اور شناختیں معاندانہ اضداد میں منظر ہونے لگیں۔ لامرکزیت کے باعث دنیا اور ملکوں کے مختلف خطوں، فرقوں اور اعتقادوں کو قریب لانے والا محور ٹوٹ کر خلا میں بکھر گیا۔ مہابیانیہ سے انحراف نے نہ صرف تخلیق کاروں بلکہ قارئین کو بھی منقسم کر دیا۔ لیکن ہمیں اس خطرے سے بھی آگاہ رہنے کی ضرورت ہے کہ کہیں ہم ان سے خائف ہو کر کلیت پرستی، مرکز کے نام پر آمرانہ رویے، فکری بنیاد پرستی اور اور جارحیت کی جانب راغب نہ ہو جائیں۔"

اس اندیشناک تناظر کا اختتامیہ اس طرح ہے کہ:

"..... ہمیں دونوں اطراف دیکھنا ہوگا۔ ماضی کی Reflection اور مستقبل کی Projection، زمانۂ حال کی تصویر کشی اس کے بغیر ایک مسخ اور بھرم پیدا کرنے والا عمل ہوگا۔ چنانچہ نئی صدی میں ہمیں اس پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ فرد اور فطرت کے تعامل میں اور کائناتی تصور کے تحت فکر اور سائنس کے ایسے رویے رائج ہوں جو بالآخر فرد کے ارتقا اور فطرت کی بقا کے ضامن ثابت ہوں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی فطرت کو فنا کرنے اور انسان کو اپنے مقام سے سرکا کر 'سائبورگ' بنانے کی کوشش کے بجائے انسان کے تخلیقی ارتقا، فطرت کے رنگ رنگ حیات بخش حسن اور کائنات کے اسرار سے پردہ اٹھانے میں جاری کوششوں میں 'دوست، فلسفی اور راہ نما' کا رول ادا کریں۔ اس طرح ہم مستقبل میں نئی اخلاقی اقدار اور تہذیب اور معاشرے میں تقدس اور ادب اور فن میں حسن اور صداقت کی بحالی کر سکتے ہیں اور دوزم خیر و شر میں شر کو شکست دے سکتے ہیں اور نئی صدی کے طلوع ہوتے سورج کو خوش آمدید کہتے ہوئے بآوازِ بلند کہہ سکتے ہیں 'No Apocalypse' آمین!"

اَمر صاحب جس ذہنی کلچر کی پیداوار ہیں، اُس میں گہرائی، وقار اور تمکنت بہت تھی۔ مجال ہے جو کہیں بازاری پن کا شائبہ تک پیدا ہو۔ اُس دور کے عام روشن خیال نوجوانوں کی طرح اَمر صاحب نے بھی کمیونسٹ تحریک سے ناتا جوڑا۔ دو دفعہ گرفتار ہوئے، ایک بار فیض آباد میں، دوسری بار کانپور میں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکریٹری رہے، ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ایک کلچرل فورم قائم کیا، طلبہ کی تحریک میں شامل رہے اور جی بھر کے خواب دیکھے۔ تعبیر کچھ اور نکلی تو اپنا محاسبہ کیا اور تحریک سے تائب ہو گئے۔ کارنل یونیورسٹی، امریکہ سے پروفیشنل اسٹڈیز ان کیمونیکیشن میں پوسٹ گریجویشن کیا اور سرکاری نوکری کر لی۔ لیکن ایک عنصر فن کے باطن میں عافیت کوشی سے اکتاہٹ اور انحراف کا ایسا تھا جس نے اَمر صاحب کو کہیں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ نہ گھر میں، نہ باہر۔ کبھی نوکری کی، کبھی چھوڑ دی۔ فری لانسنگ کے غیر یقینی اور صبر آزما مراحل فن کے لیے اتنے ہی سہل اور فطری تھے جتنے کہ حقیقی اور محفوظ زندگی کے طور طریقے۔ چنانچہ اَمر صاحب نے اسی وضع کے ساتھ زندگی گزار دی اور آج بھی اسی گلے شکوے سے عاری اور بے شور و صدا آن بان اور خود نگری کے ساتھ سفر میں ہیں۔ دلّی شہر میں بھانت بھانت کے حقیر ذہن، گروہی مفادات اور مقاصد سے پریشان اور داغ دار ادبی معاشرے سے اَمر صاحب کا تعلق اگر کچھ ہے تو بے تعلقی کا۔

اَمر صاحب اکیلے رہتے ہیں۔ پرائیویٹ طور پر کچھ درس و تدریس کا مشغلہ، ورنہ اپنے آپ میں مگن رہنا اور بس۔ نوکری سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ رابطہ ایک دنیا سے ہے اور مختلف زبانوں کے ادب اور ادیبوں سے، وہ بھی صرف ذہنی سطح پر اور تبادلۂ خیالات کی حد تک۔ ادبی انجمنوں،

"دیو" جیسے لوگ بھول گئے

نند کشور وکرم

ہر شہر۔ ہر نگر کی ایک پہچان ہوتی ہے جیسے لاہور کی انارکلی۔ دہلی کی چاندنی چوک۔ کلکتہ کی چورنگی بازار اور بمبئی کی میرین ڈرائیو اسی طرح راولپنڈی کی پہچان ہے راجہ بازار۔ آج کے دور میں معلوم نہیں اب اس کی کیا حیثیت و اہمیت ہے مگر ہمارے زمانے میں تو یہ شہر کا سب سے بڑا بارونق اور مرکزی بازار تھا جو روز سینما کے چوک سے شروع ہو کر راجہ بازار کے چوک تک وسعت رکھتا تھا۔ روز سینما سے آتے ہوئے اس چوک سے سامنے کی سڑک پرکاش ٹاکیز کے پاس سے ہوتی ہوئی سرداروں کے باغ سے ہوتی ہوئی شمشان گھاٹ اور لئی کی طرف نکل جاتی تھی۔ اور بائیں طرف کی سڑک بازار صرافہ اور بھابڑا بازار کی جانب۔ اور چوتھی سڑک اس علاقے کی طرف نکلتی تھی جو شریف آدمیوں کے لئے ممنوعہ علاقے کی حیثیت رکھتا تھا اور جسے عرف عام میں چکلہ یا بازار حسن کہا جاتا ہے لیکن چونکہ یہ علاقہ شہر سے باہر نالہ لئی کے اُس پار واقع تھا اس لئے اہل پنڈی اسے "پار" کے نام سے موسوم کرتے تھے اور تانگے والے بھی اس سڑک کے سرے پر کھڑے ہو کر آواز لگاتے تھے اور کہتے تھے۔ پار چلو۔ پار چلو لیکن شریف آدمی تو ان کے پاس پھٹکنے کی بھی ہمت نہیں کرتے تھے۔ اس سڑک کی شروعات میں دونوں طرف زیادہ تر کھانے پینے کی دکانیں تھیں۔ اور چونکہ ان میں زیادہ تر شراب و کباب کی دکانیں تھیں اس لئے وہاں بدبو کے فوارے چھوٹتے تھے لہٰذا عام آدمی یہاں سے گزرتے ہوئے ناک پر رومال رکھ لیتا تھا۔ اسی بازار میں داخل ہوتے ہی دو تین ہٹیوں کے بعد دائیں جانب "ڈنگی کھوئی" یعنی "ٹیڑھا کنواں" واقع تھا حالانکہ یہ ٹیڑھا نہیں تھا معلوم نہیں پھر اس کا یہ نام کیوں پڑ گیا بہر حال اسی مشہور ڈنگی کھوئی کے بغل میں ایک بڑا سا گیٹ تھا جس پر ہندی زبان میں بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔

"شری بیج موتی ناتھ جی سنسکرت پاٹھشالہ"

ان دنوں یہ پاٹھشالہ یوگی رام ناتھ شاستری جی کی سرپرستی میں چل رہی تھی جو شہر کے سربرآوردہ شخص ہونے کے علاوہ کانگریس کے بھی جانے مانے رہنما تھے اور ان کی وجہ سے اس پاٹھشالہ میں مجاہدین آزادی اور انقلابی لوگ اکثر آیا جایا کرتے تھے جس سے اسے شہر کی تحریک آزادی میں بھی مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں ایک سنسکرت تعلیمی ادارے کی حیثیت سے بھی اس پاٹھشالہ کا گردونواح کے اضلاع میں بڑا شہرہ تھا اور وہاں کے برہمن لڑکے سنسکرت کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یہاں آیا کرتے تھے جہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ رہائش اور کھانے کا مفت اہتمام تھا۔

اسی پاٹھشالہ کے ایک کمرے میں غالباً ۱۹۴۴ء میں میری دیویندر اسر سے پہلی ملاقات ہوئی تھی جہاں ان کے بڑے بھائی مہندر ناتھ اسر اور میرے ماموں بھگت جیوتی پرکاش اکٹھے رہا کرتے تھے۔ اس وقت دیویندر اسر پندرہ سولہ سال کے تھے اور وہ ادبی دنیا میں وارد نہیں ہوئے تھے اور گھر کے افراد اور یار دوست انہیں دیویندر اسر کے نام سے نہیں بلکہ "دیو" کے نام سے پکارتے تھے۔

میرے ماموں اور مہندر جی اس پاٹھشالہ میں کیوں رہتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۴۲ء کے قریب دیویندر اسر کے بڑے بھائی مہندر ناتھ اسر بی اے کرنے کے لئے اور اس کے بعد کوئی کام شروع کرنے کی غرض سے راولپنڈی آگئے تھے اور چونکہ ان کے والد کے یوگی رام ناتھ جی سے بہت پرانے تعلقات تھے لہٰذا وہ یہاں آ کر اس پاٹھشالہ کے اس کمرے میں قیام پذیر ہو گئے جہاں میرے ماموں مقیم تھے جو کئی برس پہلے سنسکرت کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اپنے گاؤں کے مدرسے سے تیسری چوتھی جماعت پاس کرنے کے بعد یہاں آگئے تھے کیونکہ گھر والوں نے محسوس کیا تھا کہ اردو ان کے کس کام کی؟ انہیں سنسکرت میں تعلیم دلوائی جائے جو بعد ازیں ان کے کام آئے لیکن وہیں رہ کر انہوں نے آیوروید آچاریہ تک کی تعلیم کی تکمیل کی اور اس دوران وہ یوگی رام ناتھ جی کے اتنے قریب آگئے کہ وہ انہیں بچوں کی طرح پیار کرنے لگے لہٰذا تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی وہ وہیں ان کی پاٹھشالہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے۔ حتیٰ کہ وہ یوگی رام ناتھ جی سے متاثر ہو کر تحریک آزادی میں شامل ہو گئے اور یوگی جی کے ساتھ انہوں نے بھی ستیہ گرہ میں حصہ لیا اور ڈیڑھ سال تک راولپنڈی سنٹرل جیل میں قید بھی رہے تھے۔

لیکن دیویندر اسر سے مذکورہ بالا ملاقات سے بہت پہلے مہندر ناتھ جی میرا ان سے غائبانہ تعارف کرا چکے تھے۔ ان دنوں میں غالباً آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور جب بھی میں پاٹھشالہ میں ماموں صاحب سے ملنے جاتا تو مہندر ناتھ جی اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میرا بھائی "دیو" بھی تمہاری عمر کا ہی ہے۔ جب وہ یہاں آئے گا تو میں اس سے تمہاری ملاقات کراؤں گا۔ تمہاری اور اس کی اچھی پٹے گی۔ تمہاری طرح

اسے بھی پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق اور وہ ایک بڑا ذہین طالب علم ہونے کے علاوہ ادب وسیاست پر بھی اچھا خاصا بحث ومباحثہ کر لیتا ہے اور وہ کمیونسٹ نظریات رکھتا ہے۔

اُس وقت مجھے کمیونسٹ پارٹی اور اُس کے نظریات کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں تھی۔ پھر جب ۱۹۴۲ء کے قریب دیو سے ملاقات ہوئی تو اُس کی باتوں اور خیالات سے میں بھی بڑا متاثر ہوا۔ ہم دونوں کچھ دنوں تک اکٹھے گھومتے پھرتے رہے اور اس واقعہ کے بعد وہ جب بھی تعطیلات میں پنڈی آتے جہاں ان کے ننھیال تھے تو ہماری ملاقات ضروری ہوتی اور ہم اکٹھے شہر میں گھومتے حتیٰ کہ اگر وہ اپنے کسی رشتہ دار سے بھی ملنے جاتے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے اور یوں میں ایک طرح سے ان کا ہمراز بن کر رہ گیا اور اس ساٹھ سال کی دوستی میں ان کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے واقعہ میں ان کا شریک رہا ہوں اور اسی لئے میں کبھی کبھار امر صاحب سے کہا بھی کرتا ہوں کہ آپ کے بارے میں آپ سے زیادہ میں جانتا ہوں اور اس میں شاید شک کی گنجائش بھی نہیں۔

اگرچہ جب میں انہیں پہلی بار ملا تو اُس وقت تک میں ان کے بارے کچھ زیادہ تفصیلات سے آگاہ نہیں تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہت سی باتیں جو انہیں بھی اپنے بارے میں معلوم نہیں تھیں بعد ازاں میں نے ہی انہیں بتائی تھیں۔ اور مجھے یہ باتیں ان کے ان رشتہ داروں سے معلوم ہوئی تھیں جن سے میرا ابھی تھوڑا بہت تعلق تھا جیسے کہ میرے بتانے سے پیشتر انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے نانا جی نے دو شادیاں کی تھیں اور ان کی والدہ ان کی پہلی بیوی سے تھیں اور باقی بچے ان کے ماموں وغیرہ دوسری بیوی سے۔ اسی طرح ان کی جائے پیدائش کے بارے میں بھی۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ دیویندر اسر کی ولادت ۱۹۲۸ء میں ۱۴ اگست کے دن ہوئی تھی جو ۱۹ سال بعد برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم ترین دن بن گیا اور جسے برصغیر کے عوام کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ۱۹۴۷ء میں یہ دن پاکستان کی ولادت اور اُس کی آزادی کا دن بننے کے ساتھ ساتھ برصغیر کی تقسیم اور برطانوی سامراج کی غلامی سے آزادی کا دن بھی بن گیا مگر جہاں تک ان کی جائے پیدائش کا سوال ہے نہ جانے کس غلط فہمی کی بنا پر انہوں نے خود اسے متنازعہ فیہ بنا دیا کیونکہ انہوں نے اپنی شروع کی اکثر کتابوں میں جائے پیدائش کیملپور (حال اٹک) لکھوائی تھی بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی پیدائش کیملپور میں نہیں بلکہ حسن ابدال میں ہوئی تھی جسے پنجہ صاحب کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا تھا۔ غالباً جائے ولادت کیملپور وہ اس بنا پر لکھتے رہے کہ وہاں بچپن اور لڑکپن گزارنے کی وجہ سے انہوں نے فرض کر لیا تھا کہ وہ وہیں پیدا ہوئے ہیں لیکن بعد میں ان کے کسی رشتہ دار سے میں نے سنا کہ وہ کیملپور میں نہیں بلکہ حسن ابدال میں پیدا ہوئے ہیں جہاں ان کی پھوپھی سکونت پذیر تھیں اور اس کی تصدیق بعد میں ان دنوں کے تحریر کردہ ایک پوسٹ کارڈ اور جنم پتری سے بھی ہوگئی جو بعد میں امر صاحب کو پرانے کاغذات میں اتفاق سے مل گیا تھا۔

یوں تو امر صاحب کے کنبے کے بارے میں میں بہت سی باتیں ان سے ملاقات سے پہلے ہی جانتا تھا جیسے یہ کہ ان کے والد شری ناتھ امر کیملپور کے اور ان کے نانا پنڈت لچھمی نارائن راولپنڈی کے نامی وکیل ہیں جن کی ایک بڑی سی کوٹھی کمپنی باغ کے بالمقابل واقع ہے۔ لیکن بہت سی باتیں ان سے ملاقات کے بعد معلوم ہوئیں۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ ان کے کیملپور میں دو قریبی دوست افضل اور یدھشٹر ہیں۔ افضل سے پاکستان بن جانے کے بعد ان کا زیادہ رابطہ نہ رہا لیکن یدھشٹر سے ان کے دہلی آنے کے بعد بھی تعلقات رہے مگر افسوس کہ مانسرور کے سفر کے دوران برفانی طوفان میں پھنسی ایک عورت کی جان بچاتے ہوئے وہ اپنی جان بھی گنوا بیٹھا اور ٹنوں برف کے نیچے دفن ہو کر رہ گیا۔

امر صاحب پر بھگت سنگھ راج گورو، سکھ دیو اور ہیمو کالانی کی شہادت اور ۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑو تحریک کا گہرا اثر تھا۔ جب وہ دسویں جماعت کے طالب علم تھے تو ان دنوں انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے ریڈ آرمی منظم کی تھی۔ پھر جب وہ کالج میں داخل ہوئے تو ان کی ذہنی اور ادبی تربیت میں ان کے اُردو کے اُستاد ڈاکٹر غلام جیلانی برق، انگریزی کے اُستاد صدیق کلیم اور نفسیات وفلسفہ کے اُستاد ڈاکٹر محمد اجمل نے بڑا اہم کردار نبھایا تھا خصوصاً موخر الذکر نے ان پر اپنی گہری چھاپ چھوڑی تھی اور ان ہی کی ایما اور مشورے پر انہوں نے پہلا افسانہ تحریر کیا تھا۔ ان ہی حضرات کی صحبت اور تربیت ہی سے ان میں لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور انہوں نے اپنے کالج کی میگزین "مشعل" میں مضامین لکھ کر اپنی ادبی زندگی کی ابتدا کی۔

غالباً ۱۹۴۳ء میں پنڈت جی کیملپور سے کام دھندے کی غرض سے پنڈی آئے تھے اور ان ہی دنوں شاید اپریل۔ مئی میں میرے ماموں سنٹرل جیل سے رہا ہو کر باہر آئے تھے اور وہ کوئی کام کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے چنانچہ یوگی رام ناتھ جی نے ان دونوں کو آیورویدک دوائیاں بنانے کا مشورہ دیا اور فرم کا نام رکھا۔ "ویلو آیورویدک فارمیسی"۔ اس فرم میں ان دونوں کے علاوہ یوگی رام ناتھ جی کے چھوٹے گرو بھائی یوگی ودیا ناتھ جی بھی پارٹنر تھے جو پالصنالہ کے احاطے میں تیار کی جانے والی دوائیوں کی تیاری کی نگرانی کرتے تھے اور اس فارمیسی کے بوہڑ بازار میں واقع شوروم میں جہاں دوائیاں بیچی جاتی تھیں زیادہ تر پنڈت جی بیٹھتے تھے اور ماموں صاحب بھی شوروم میں بیٹھتے تھے تو بھی دوائیوں کی تیاری کی نگرانی کرتے

تھے۔ اس پارٹنرشپ سے ان دونوں کے رشتے اتنے گہرے ہو گئے کہ تقسیم سے کچھ پہلے جب دنگوں کے بعد انہیں احساس ہو گیا کہ اب راولپنڈی میں رہنا مشکل ہو گیا ہے تو انہوں نے کانپور میں چمڑے کے بیچے لگائے اور راولپنڈی سے نقل مکانی کر کے وہاں منتقل ہو گئے۔

کیمبلپور سے ہجرت کرنے کے بعد امر اپنے والد، چھوٹی بہن کملیش اور کچھ دیگر رشتہ داروں کے ساتھ کانپور پہنچے جہاں جیندر جی اور میرے ماموں پہلے ہی آ چکے تھے اور انہوں نے درشن پورہ میں ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ کچھ دن تو سبھی لوگ اسی مکان میں رہتے رہے پھر دھیرے دھیرے سب نے اپنی رہائش کا الگ اہتمام کر لیا۔ امر صاحب کے والد صاحب نے بھی اس مکان سے ایک دو فرلانگ کی دوری پر ایک مکان کرائے پر لے لیا اور وہاں منتقل ہو گئے اور ساتھ ہی کیمبلپور کی طرح یہاں بھی پریکٹس شروع کر دی اور اپنا زیادہ تر وقت کچہری میں کاٹنے لگے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب امر صاحب کی تخلیقات متعدد رسائل و جرائد میں شائع ہونے لگی تھیں اور وہ اکثر شام کو چھت پر بیٹھ کر مجھے اپنے مضامین اور کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد امر صاحب جو کیمبلپور سے بی اے کا امتحان دے کر آئے تھے اکنامکس میں ایم اے کرنے کی غرض سے الہ آباد چلے گئے اور میں کانپور سے انبالے آ گیا جہاں تقسیم کے بعد میرے والد سکونت پذیر تھے۔ یہاں آتے ہی میں نے ڈی اے وی کالج میں داخلہ لے لیا۔

اور یہاں اگرچہ مجھے لکھنے کا چسکا تقسیم سے بہت پہلے لگ چکا تھا مگر میری کوئی تحریر ابھی تک اشاعت کا مرحلہ طے نہیں کر پائی تھی۔ انبالہ میں دو تین مہینے فرصت کے ملے تو سوائے گھومنے اور کتابیں پڑھنے کے کوئی کام نہیں تھا لہٰذا ان ہی دنوں میں نے ایک کہانی لکھی ”ادیب“ اور اسے اشاعت کے لئے نئی دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ نرالا میں بھیج دیا جو دسمبر ۱۹۴۷ء میں شائع ہونے والی میری پہلی تخلیق تھی۔ اور اسی دوران انبالہ میں ہی مجھے کمیونسٹ پارٹی، ترقی پسند تحریک اور اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے قریب آنے کا موقع ملا۔ حالانکہ انبالہ آنے سے پیشتر مجھ پر کمیونسٹ پارٹی کا ذرا بھی اثر نہ تھا اور نہ میں نے کبھی اس میں دلچسپی لی تھی۔

ہوا یوں کہ ایک دن جب کالج میں تاریخ کے لیکچرر پروفیسر بلراج مدھوک (جن سنگھ کے مشہور نیتا) کی کلاس میں بیٹھا ان کا لیکچر سن رہا تھا کہ دو نوجوان کالج میں مجھ سے ملنے آئے اور انہوں نے کلاس میں میرے نام کی اندر سلپ بھیج کر مجھے باہر بلوایا۔ باہر آنے پر ان میں سے ایک نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں پربودھ ساہنی ہوں اور ایم بی این کالج انبالہ چھاؤنی میں پڑھتا ہوں۔ دویندر اسر میرے کیمبلپور کے دوست ہیں اور انہوں نے ہی مجھے آپ سے ملنے کے لئے کہا ہے۔ پھر انہوں نے میرا تعارف میرے ایک ہم جماعت بھگت سنگھ سے کرایا جو وہاں اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا نیتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے انبالہ چھاؤنی میں ہونے والے انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں انجمن کے اجلاس میں باقاعدگی سے شرکت کرنے لگا جس میں ان دنوں بھیشم ساہنی، پروفیسر کنول، نریندر پوری، بھاگ سنگھ عاجز، اور رام سنگھ اسیر وغیرہ شرکت کیا کرتے تھے۔ یہاں نریندر پوری سے اچھی دوستی ہو گئی اور آہستہ آہستہ میں بھی اسٹوڈنٹ فیڈریشن اور پارٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگا۔ حتیٰ کہ جب تحصیل کھرڑ کے ایک سکول میں ایک استاد کے تھپڑ مارنے سے ایک لڑکے کی موت ہو گئی تو تحقیقات کے لئے جو تین رکنی وفد بھیجا گیا اس میں مجھے بھی شامل کیا گیا۔

الہ آباد سے امر صاحب کے خطوط اکثر آتے رہتے تھے اور ان کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ وہاں ان کا ادبی دائرہ اور بھی وسیع ہو گیا کیونکہ ان دنوں وہاں فراق گورکھپوری، مہادیوی ورما، سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا، مدھوشالا والے بچن، اوپندر ناتھ اشک، رام کمار ورما، اگیے، ایلاچندر جوشی، ممتاز حسین، پہاڑی ایسے بڑے بڑے ہندی اردو کے ادبا و شعرا کا اجتماع تھا۔ جن میں پر ان کی ساحر لدھیانوی سے اتنی اچھی قربت ہو گئی تھی کہ وہ اکثر ان سے ملنے ان کے ہاں آیا کرتے تھے۔ ان دنوں الہ آباد انجمن ترقی پسند مصنفین کا بھی ایک بہت بڑا گڑھ تھا اور امر صاحب اس کے سکریٹری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ (بعد ازاں کانپور) میں بھی سکریٹری رہے) یہیں سے وہ انجمن کی بھیونڈی میں منعقدہ کل ہند کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ اور وہاں بھی انہوں نے اپنی ذہانت و قابلیت کا سکہ جمایا تھا۔ اس دور کا ذکر کرتے ہوئے معروف نقاد وارث علوی نے نئی دہلی کے ماہی جریدے ”ذہن جدید“ کے ایک شمارے میں ان کے بارے میں لکھا تھا کہ ”جب ترقی پسندی پر شباب کا عالم تھا تو خاکسار بمبئی کی جگمگاتی سڑکوں پر آوارہ پھرتا تھا۔ بھیونڈی کانفرنس میں جب دویندر اسر سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو ہماری عمر بیس بائیس کے پھیر میں ہوں گی۔ اور امر جب مارکس اور کامیو اور وجودیت پر بات کرتا تو میرے لئے یہ باتیں الہام اور القا تھیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہم عصر منظر میں جینا ایک قاری کی ذہنی تربیت کے لئے بہت ضروری ہے۔ یہ تربیت درسگاہوں میں نہیں، تخلیقات، میلانات، رجحانات اور تحریکات کی آندھیوں کے درمیان ہوتی ہے۔“

انٹر کا امتحان دینے کے بعد میں پھر کانپور آ گیا اور اسی دوران امر صاحب بھی ایم اے کا امتحان دے کر وہیں پہنچ گئے۔ یہ غالباً ۱۹۴۹ء اپریل مئی کی بات ہے۔ اب ہم لوگ پوری طرح انجمن ترقی پسند مصنفین اور

پارٹی کی سرگرمیوں میں منہمک ہو گئے۔ ان دنوں ہمارے پاس صرف ایک ہی سائیکل ہوتی تھی جسے اسر صاحب شاید الٰہ آباد سے لائے تھے۔ ہم دونوں اسی سائیکل پر حسبِ معمول سول گنج اور چمن گنج کی طرف جاتے تھے جو ہماری سرگرمیوں کا خاص مرکز تھا۔ لیکن سائیکل چلانے کے بارے میں ہم میں پوری طرح understanding تھی چنانچہ اگر جاتے ہوئے سائیکل وہ چلاتے تھے تو واپسی پر یہ کام مجھے کرنا ہوتا تھا اور اس میں کسی بحث کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

کانپور میں انجمن کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ہم پارٹی کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ مجھے خواتین اور بچوں کو بھی کچھ ساتھیوں تک پہنچانے کا کام سونپا گیا تھا اور کئی کام تو ہم دونوں مل کر کرتے تھے۔ ایک بار اسر صاحب کو کہا گیا کہ آج رات کو نو بجے ایک انڈر گراؤنڈ کامریڈ کو حلیم مسلم کالج سے کسی جگہ پہنچانا ہے چنانچہ ان میں ایک شخص نے ہمیں ساتھ لے جا کر وہ مکان دکھا دیا جہاں اُسے پہنچانا تھا۔ پھر رات کو ہم دونوں حلیم مسلم کالج پہنچے اور وہاں ایک اسٹوڈنٹ کے پاس قیام پذیر اُس کامریڈ کو ساتھ لیا جس کے بال منتشر تھے اور چہرے سے پریشانی اور تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ ہم تینوں بالکل خاموشی کی حالت میں تنگ و تاریک گلیوں سے ہوتے ہوئے اُس مکان پر پہنچے اور اُس نوجوان کو وہاں پہنچا کر گھر واپس آ گئے۔ جانتے ہیں وہ پریشان حال کامریڈ کون تھا؟ کامریڈ مونس رضا جو بعد ازاں دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔

ان ہی دنوں اسر صاحب کو دانتوں میں کچھ تکلیف شروع ہوئی اور وہ دوسرے تیسرے دن گنج نمبر ۵ کے ایک ڈینٹسٹ سے مشورے کے لیے جایا کرتے تھے اس لئے وہ شام کو سول لائنز جانے کے لئے مجھ سے آدھ گھنٹہ پہلے گھر سے نکلتے تھے اور میں بعد میں جا کر انہیں ڈینٹسٹ کی دکان پر مل جاتا تھا اور پھر ہم آگے گھومنے کے لئے نکل جاتے تھے لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ سی آئی ڈی ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے چنانچہ ایک دن جب شام کو مجھے ڈینٹسٹ کی دکان پر ملنے کے لئے کہہ کر وہ چل دیے تو میں کوئی آدھ گھنٹے بعد ڈینٹسٹ کی دکان کی جانب جانے کے لئے روانہ ہوا۔ اچانک اپنا کین سینما سے کچھ آگے سڑک پر مجھے ایک سردار جی مل گئے اور مجھے یک لخت روک کر پوچھنے لگے "کیوں بھائی صاحب اس سڑک کا کیا نام ہے" سردار جی کی بات سن کر ایک منٹ کے لئے تو میں بھونچکا سا رہ گیا اور کچھ نہیں آیا کہ انہیں کیا جواب دوں کیونکہ مجھے واقعی سڑک کا نام معلوم نہیں تھا۔ پھر کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم نہیں۔" یہ جواب دے کر میں آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ انہوں نے ایک اور بے ہودہ سوال داغ دیا۔ "آپ کا کیا نام ہے؟" یہ سوال سنتے ہی فوراً مجھے خیال آیا ہو نہ ہو یہ ضرور کوئی سی آئی ڈی کا آدمی ہے اس لئے میں نے فوراً جواب دیا۔ "گوبند رام" اس پر وہ نادم سا ہو کر بولا۔ "او معاف کرنا بھائی صاحب غلطی ہو گئی۔" میں نے پوچھا "آپ کو کس کی تلاش ہے؟" اس نے اپنی کاپی میں درج مجھے میرا نام دکھایا اور کہا "مجھے تو اس آدمی سے ملنا تھا۔" اس پر میں نے کہا "میرا تو نام گوبند رام ہے" اور اتنا کہہ کر میں آگے بڑھ گیا اور پھر جا کر سارا واقعہ اسر صاحب کو سنایا۔

ایک دن چمن گنج میں کچھ ادیب دوست بیٹھے ہوئے تھے کہ اسر صاحب نے ایک ترقی پسند ماہنامہ "ارتقا" نکالنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن سوال پیدا ہوا کہ اس کے دفتر کے لئے جگہ کون سی لکھوائی جائے کیونکہ ہم دونوں اپنی سرگرمیاں گھر والوں سے پوشیدہ رکھتے تھے اور گھر کا ایڈریس دینے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ اس پر وہاں بیٹھے ایک کامریڈ نے کہا کہ ایڈریس کا کیا مسئلہ ہے انہوں نے فوراً ایک ایڈریس لکھوا دیا۔ جس پر ہم ڈیکلیریشن لینے فوراً کچہری چلے گئے کیونکہ ان دنوں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ہی ڈیکلیریشن دینے کا اختیار تھا۔ وہاں ہم نے فارم لیا اور اس پر میں نے بحیثیت ایڈیٹر پرنٹر پبلشر دستخط کئے اور واقف کشتر پال کرشن بترہ سے جو اردو شعر و ادب میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے ڈیکلیریشن میں درج تفاصیل کی تصدیق کرا کے اسے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے پیش کی اور آدھ گھنٹے کے اندر ہی اندر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے اجازت نامہ بھی مل گیا۔

دو تین بعد ہم نے سوچا کہ اس نام نہاد دفتر کو تو دیکھ لیں جہاں ڈیکلیریشن کے مطابق ہمارا دفتر واقع ہے تا کہ کل کلاں کوئی پوچھے تو ہم بتا سکیں کہ دفتر کہاں ہے؟ چنانچہ دفتر کا ایڈریس دینے والے کامریڈ سے اسر صاحب نے کہا کامریڈ کم از کم وہ جگہ تو دکھا دو جہاں ارتقا کا دفتر واقع ہے۔ اس پر وہ ہمیں کئی گلیاں گھماتے ہوئے ایک نامانوس سی جگہ لے گیا اور وہاں برسوں سے مقفل ایک دکان کے سامنے کھڑا کر کے کہنے لگا "یہ آپ کا دفتر ہے۔" میں اور اسر صاحب حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگے۔

اب آیا اس رسالے کی کتابت کا سوال۔ ان دنوں کانپور میں ایک مشہور کاتب رفیق صہبائی ہوا کرتے تھے جو خود بھی ایک اخبار کے ایڈیٹر رہ چکے تھے اور جن کا کتابت میں کوئی جواب نہ تھا۔ ان سے ہم نے درخواست کی کہ صہبائی صاحب ہمیں اس رسالے کی کتابت کر دیجئے۔ گو صہبائی صاحب بہت بڑے خوش نویس تھے اور وہ چھوٹا موٹا کام کبھی ہاتھ میں نہ لیتے تھے مگر انہوں نے نہ صرف وعدہ کیا اُس کی کتابت کی حامی ہی نہیں بھری بلکہ ایک ہفتے میں اُس کی کتابت بھی کر دی اور اُس پر طرہ یہ کہ انہوں نے اُس کی ایک پیسہ بھی اُجرت نہیں لی۔ پھر خواجہ برقی پریس سے چھپوا کر اسے سلائی اور ٹرمنگ کے لئے ہم گھر لائے اور رات کے بارہ بجے تک بیٹھ کر

پہلے تو ہم نے اس کی شیپلر سے چھپنگ کی ہمارا ان پر ادبا و شعرا کے پتے وغیرہ لکھ کر انہیں ڈاک سے بھیجنے کے لئے تیار کرتے۔ دراصل یہ پرچہ امر صاحب کی محنت کا ہی نتیجہ تھا اور اسے بہت پسند بھی کیا گیا حالانکہ یہ فل سکیپ سولہ صفحات پر مشتمل تھا اور اس میں ایک افسانہ، ایک نظم، ایک غزل، ایک ادبی مضمون اور ایک غیر سیاسی غیر ادبی مضمون اور ایک اداریہ شامل تھا تاہم اس پرچے کی اشاعت پر کئی شعرا و ادبا نے اس کی تعریف میں انہیں خطوط بھی لکھے مگر افسوس کہ اس کا دوسرا شمارہ نکلنے کی نوبت نہ آئی اور امر صاحب کی گرفتاری کے ساتھ ہی اس رسالے کی موت واقع ہو گئی۔

ہوا یوں کہ پولیس کئی ہفتوں سے ہماری سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ ان ہی دنوں لکھنؤ میں پارٹی کی کوئی کانفرنس تھی۔ ہم صبح روزمرہ کی طرح گھر سے نکلتے اور سائیکل ریلوے اسٹیشن پر رکھ کر کانفرنس میں شریک ہو کر رات کو گھر واپس آ جاتے جس سے گھر والوں کو پتا ہی نہ چلا کہ ہم لکھنؤ کانفرنس میں شرکت کرنے جاتے تھے۔ اور گھر والوں کو یہ راز تب کھلا جب امر صاحب کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔

یکم جنوری ۱۹۵۰ء کی صبح کا ذکر ہے میں کوئی آٹھ نو بجے کے قریب سال نو کی مبارک دینے کے لئے امر صاحب کے گھر گیا۔ اور پھر ان کے گھر کے سبھی افراد کو مبارکباد کہہ کر ابھی گھر واپس پہنچا ہی تھا کہ دس پندرہ منٹ بعد امر صاحب کی چھوٹی بہن کملیش روتی ہوئی آئی اور اس نے بتایا کہ پولیس "دیو بھائی صاحب" کو پکڑ کر لے گئی ہے۔ ان کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی ماموں تو فوراً ان کے گھر کی طرف چلے گئے اور میں جلدی سے تیار ہو کر گھر سے رفو چکر ہو کر پھول باغ کے پاس اپنے ایک دوست گوبند مولس کے گھر چلا گیا جو ارتقا کے تیسرے ایڈیٹر تھے اور جو ہماری طرح پارٹی سے وابستہ تھے۔ میں نے ان کے گھر جا کر اطلاع دی کہ امر صاحب کو گرفتار کر لیا گیا ہے اس لئے فوراً گھر سے نکل چلو تا کہ کہیں پولیس آ کر تمہیں گرفتار نہ کر لے۔ اس کے بعد میں اور گوبند مولس شام کا اندھیرا ہونے تک پھول باغ میں بیٹھے رہے اور جب اندھیرا چھا گیا تو ہم اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑے۔ گوبند مولس سے اس کے بعد کبھی ملاقات نہ ہو پائی کیونکہ انہیں ڈراموں میں حصہ لینے کا شوق تھا اور وہ 'اپٹا' سے بھی وابستہ تھے۔ جلد ہی وہ کانپور چھوڑ کر بمبئی چلے گئے اور وہاں انہوں نے اچھے قدم جما لئے۔ ایک بار اخبار میں ان کے بارے میں یہ بھی پڑھا تھا کہ انہوں نے دیکشت کو فلمی دنیا میں انہوں نے ہی متعارف کرایا تھا۔ (غالباً وہ بھی دیکشت تھے)

امر صاحب کوئی پندرہ پچیس دن جیل میں بند رہے اور اس کے بعد میرے ماموں نے جن کی کانگریسی ہونے کی وجہ سے کئی لوگوں سے واقفیت تھی اثر و رسوخ استعمال کر کے انہیں رہا کرا دیا۔ اور اس رہائی کے کچھ دنوں بعد وہ کانپور کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر دہلی آ گئے۔

اور کانپور میں قیام کا ایک اہم واقعہ تو رہ ہی گیا۔ کانپور میں ہم دونوں نے کچھ مدت پنجاب کے مشہور صحافی اور شاعر میلا رام وفا صاحب کی ادارت میں نکلنے والے اخبارات میں بھی کام کیا تھا۔ جنہیں وہ غیر جی اور پنجاب آزادی ہونے کی وجہ سے "قومی اخبار" کا پریس الاٹ کر دیا گیا تھا۔ تب قومی اخبار اخلاق علی صاحب کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا۔ جب پریس میلا رام وفا صاحب کو الاٹ ہوا تو انہوں نے ایک شخص اخلاق علی کو اپنا منیجر بنا کر اس کا نام بحیثیت ایڈیٹر دینا شروع کر دیا۔ لیکن بعد میں لوگوں کو پتا چل گیا کہ ایڈیٹر اخلاق علی نہیں بلکہ اخلاق علی ہے تو ان کا پرچہ بکنا بند ہو گیا۔ تب انہوں نے نیا ڈیکلریشن لے کر روزنامہ "امرت" نکالنا شروع کر دیا۔ ہم نے ان کے ہاں کچھ مدت کام کیا لیکن پھر اس کام کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ تنخواہ دینے سے آنا کانی کرتے تھے۔ بہر حال یہاں کام کرنے کا ایک فائدہ تو ہوا کہ ہم نے تھوڑا بہت صحافتی تجربہ تو حاصل کر لیا۔

دہلی آنے کے بعد امر صاحب کو تھوڑی سی تگ و دو کے بعد دو تین پرائیویٹ کالجوں میں پڑھانے کی ملازمت مل گئی اور یہاں پڑھانے کے دوران بہت سی لڑکیاں ان کی شخصیت اور علمیت سے بے حد متاثر ہوئیں اور کئی رومانس بھی چلے۔ ان ہی لڑکیوں میں سے ایک سے ان کے معاشقے کا مجھے تب پتا چلا جب ایک دن وہ میرا لاشعور کے پاس اس کے ساتھ آئے تھے جہاں وہ ان دنوں جرنلزم کی کلاسیں اٹینڈ کیا کرتی تھی اور وہیں پہلی بار میرا اس سے تعارف ہوا۔ امر صاحب کی دوستی اس سے روز بروز بڑھتی گئی اور پھر جلد ہی یہ دوستی شادی کے بندھن کی صورت میں عملی شکل اختیار کر گئی حالانکہ گھر کے افراد اور ان کے کئی احباب بوجوہ اس شادی کے مخالف تھے مگر ایک تو امر صاحب بڑے آزاد خیال شخص تھے اور دوسرے ان پر عشق کا بھوت سوار تھا چنانچہ ان کے ارادے کو کوئی متزلزل نہ کر سکا اور بالآخر جولائی ۱۹۶۱ میں دونوں کی شادی ہو گئی جس کے نتیجے میں وہ دو بیٹوں کے باپ بھی بن گئے مگر افسوس کہ کچھ کارنوں سے میاں بیوی میں آپس میں زیادہ دیر نبھ نہ سکی اور شادی کے لگ بھگ ۱۵ سال بعد ان میں طلاق ہو گئی اور وہ الگ الگ رہنے لگے۔

اسی دوران ان کے بڑے بھائی مہندر جی اور والد صاحب بھی کانپور سے منتقل ہو کر دہلی آ گئے تھے اور چونکہ امر صاحب کے ازدواجی حالات خوشگوار نہ تھے لہٰذا ان کے والد اپنے پرانے کرم فرما یوگی رام ماتھر جی کے پاس پٹیل نگر میں واقع ان کے تعمیر کردہ مکان میں قیام پذیر ہو گئے۔ یہاں آنے کے کچھ مدت بعد مہندر جی سخت بیمار ہو گئے اور جب حالت زیادہ بگڑ گئی تو انہیں ارون ہسپتال میں داخل کرایا گیا لیکن انہیں بچایا نہ

جا سکا اور وہیں اُن کی وفات ہو گئی۔ اس کے بعد امر صاحب کے والد بیگل جی کا بیشن نگر کا استھان چھوڑ کر جنک پوری آ گئے جہاں امر صاحب نے اپنا نجی مکان بنوا لیا تھا۔

شادی سے کچھ مدت پہلے امر صاحب نے پرائیویٹ کالجوں میں پڑھانا بند کر دیا تھا کیونکہ انہیں مرکزی سرکار کی وزارت صحت میں ملازمت مل گئی تھی اور وہ اس کے تحت شائع ہونے والے انگریزی رسالے کی ادارت سے وابستہ ہو گئے اور پھر یہیں سے وہ ۳۱ اگست ۱۹۸۲ء کو ملازمت سے سبکدوش ہو کر زور و شور سے تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔

دہلی آنے کے بعد امر صاحب کی سیاسی سرگرمیاں تو بند ہو گئیں مگر ادبی سرگرمیاں مزید بڑھ گئیں۔ ان ہی دنوں انہوں نے کچھ ساتھیوں کے تعاون سے قرول باغ میں ایک ادبی انجمن 'کلچرل فورم' کی بنیاد رکھی جس میں بہت سی اہم شخصیات شرکت کیا کرتی تھیں جیسے مختشم ساقی، پریم ناتھ درد، ترل ورما، رام کمار ورما، گوپی چند نارنگ، سریندر پرکاش، راج اچھے، پروفیسر فقیر چند جین، پروفیسر اہلووالیہ وغیرہ اور بعض نے تو اسی انجمن کے ذریعے ہی اپنے آپ کو ادبی دنیا سے متعارف کرایا تھا۔ اس فورم کا مقصد ترقی پسند اور جدید نظریات پر مبنی ادب کی تخلیق کرنا اور ادیب کو مارکسزم سے روشناس کرا کر پسماندہ طبقوں، غریبوں اور کسان مزدوروں کی زندگی پر قلم اٹھانے کی طرف متوجہ کرنا تھا۔

لیکن بعد ازاں وہ دھیرے دھیرے ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ پارٹی اور انقلابی روش سے دور ہوتے گئے۔ حالانکہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب وہ پارٹی کے بہت بڑے مبلغ تھے اور وہ اس کی حمایت میں ہر کسی سے بحث و مباحثے میں اتنے جوش میں آ جاتے تھے کہ ان کی آواز بہت بلند ہو جاتی تھی مگر دہلی آنے کے بعد اس میں بتدریج کمی آتی گئی اور پھر ایک وقت ایسا آیا جب وہ پارٹی سے بہت دور ہو گئے۔ جب لوگ اس تبدیلی کے بارے میں پوچھتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ پارٹی نے بہت سی غلطیاں کی ہیں اور اس کی مفاد پرستی اور موقع پرستی نے تحریک کو نقصان پہنچایا ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے کہ مکمل طور پر پارٹی سے الگ تھلگ ہونے کی اہم وجہ سرکاری ملازمت اختیار کرنا ہو اور اسی لئے انہوں نے اپنی سوچ کا راستہ بدل لیا ہو۔

تاہم اس بارے میں انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ وہ اشتراکیت سے نہیں بلکہ سیاست سے ہی بیزار ہو گئے ہیں۔ اور وہ ہر قسم کے بند نظریات اور اقتدار کی سیاست کی مخالفت کرتے ہیں کیونکہ یہ فرد کو مالی پولٹ اور مسخ کرتے ہیں اور وہ انسان کی نئی پہچان خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی مذہبی ہو یا سماجی یا ذات برادری کی اُس کی تائید نہیں کر سکتے۔

ایک وقت تھا جب ہم دونوں ہفتے میں ایک آدھ بار ضرور مل لیتے تھے مگر اب امر صاحب نے گھر سے نکلنا بہت کم کر دیا ہے۔ اب تو وہ اشد ضروری کام کسی سیمینار یا جلسے کی صدارت کرنے یا اس میں مقالہ پڑھنے کے لئے ہی زیادہ تر نکلتے ہیں۔ اور اب کم ملنے کی ایک وجہ ٹیلی فون کی سہولت کا فراہم ہونا بھی ہے۔ کیونکہ پہلے تو ہر بات کے لئے ملنا ضروری ہوتا تھا لیکن اب ٹیلیفون لگ جانے سے گھر بیٹھے ہی بہت سے مسائل حل کر لئے جاتے ہیں اور اگر کچھ بھیجنا ہو تو کوریئر سروس موجود ہے جس سے خود جا کر پہنچانے کی ضرورت نہیں رہتی۔

آج امر صاحب ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں اور انہیں بڑی قدر و اہمیت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی تعریف میں اخبارات و رسائل میں اکثر مضامین بھی دکھائی دیتے ہیں اور ان کی شہرت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ہر کوئی ان کی عظمت اور ذہانت کی تعریف کرتا ہے جیسا کہ مشہور نقاد پروفیسر شمیم حنفی نے ایک جگہ تحریر کیا ہے:

”امر صاحب بے تحاشہ پڑھتے ہیں۔ اور صرف ادب ہی نہیں پڑھتے، ان کے گیان دھیان کا مرکز بڑی حد تک تخلیقی وحدت ہے۔ اپنے مطالعہ کی وسعت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے امر صاحب کا معاملہ اُردو کے تقریباً تمام ادیبوں سے مختلف ہے۔ باقر مہدی اور وزیر آغا (پاکستان) سے کچھ مماثلت ٹھہرائی جا سکتی ہے..... اتنے وسیع پیمانے پر ثقافتی مکالمہ قائم کرنے کی کوشش بھی امر صاحب سے آگے ایک باقر مہدی کو چھوڑ کر کم سے کم اردو کی حد تک کہیں اور نظر نہیں آتی۔“

اب کچھ برسوں سے امر صاحب گھر میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بغیر ضرورت کے گھر سے نہیں نکلتے اور زیادہ تر پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتے ہیں اور آج بھی اتنا پڑھتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس عمر میں وہ اتنا کام کیسے کر لیتے ہیں جب کہ وہ دن میں سوتے بھی کم ہیں۔ ہاں زیادہ پڑھنے لکھنے کے بعد جب وہ تھک جاتے ہیں تو آنکھیں موند کر بستر پر دراز ضرور ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں دیکھ کر بعض اوقات خیال گزرتا ہے کہ وہ سو رہے ہیں مگر یہ ہمارا وہم ہے وہ تو اس وقت مہاتما بدھ کی طرح عالم تنہائی میں کسی گہری سوچ میں ڈوبے نہ جانے عالم تخیل میں کس جہاں کی سیر کر رہے ہوتے ہیں اور معلوم یوں ہوتا ہے کہ وہ گہری نیند میں ڈوبے خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔ انہیں ایسی حالت میں دیکھ کر مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ وہ ماضی کے اس نوجوان ”دیو“ کے تصور میں گم ہو جاتے ہیں جسے ساٹھ برس پیشتر زندگی کے کسی انجانے موڑ پر وہ بہت پیچھے چھوڑ آئے ہوں۔

خوشبو بن کے لوٹیں گے

ناول سے ایک باب

دیویندر اسّر

شاید تمہیں کینسر ہے

(خاموشی)

یہ پتا کب سے ہے؟

قریب ۱۵ برسوں سے۔

پہلے بھی ایسا ہوا تھا۔

نہیں۔

اور اس کا رنگ

معلوم نہیں

ابھی تو یہ باہر کی طرف بڑھ رہا ہے، اس کی جڑیں اندر بھی گہری ہوتی جائیں گی۔ اور...... پھر

(خاموشی)

موت بھی ہو سکتی ہے...... آپریشن ضروری ہو جائے گا۔

بائیوپسی بھی کرا لو۔ اسی مہینے

میں چلا آیا۔ اگر یہ کینسر ہی ہے تو مجھے موت کے دہانے تک لے جانے کے لیے اسے ابھی پانچ سات برس اور لگیں گے اور تب تک میں ۵۵ سے ۵۷ سال کا ہو جاؤں اور اس سے زیادہ زندہ رہنے کی نہ تو میری خواہش ہے اور نہ ہی مجھے پسند ہے۔ اگر علاج ہو بھی گیا تو کتنی عمر بڑھے گی۔ یہی ۵ سے ۷ برس اور موت شاید پھر بھی کینسر سے ہو گی۔ اگر اس دوران کوئی حادثہ نہ ہو گیا تو...... اتنے سال تو ہسپتالوں کے چکر کاٹنے اور مرض کی تشخیص اور علاج ہی میں کٹ جائیں گے۔ کیوں نہ میں یہ برس کچھ ہوش میں اور کچھ جنون میں گزار دوں۔

فکر ہے تو مجھے اس کینسر کی جس کی جڑیں تو باہر ہیں لیکن جو پھیل رہا ہے میری روح کے اندر کتنے برسوں سے۔ اس کینسر سے ہر روز مجھے چھوٹی چھوٹی موتیں ملتی ہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ اس سے بڑی اور آخری موت نہیں ہو گی۔ زیادہ سے زیادہ تمہاری روح گھٹا جائے گی۔ میں ان چھوٹی چھوٹی موتوں سے ڈرتا ہوں۔ اس لیے اس لیے اگر بڑی اور آخری موت ہو بھی جائے تو مجھے کوئی غم نہیں ہوگا۔ میں نے موت کو کئی بار کئی طرح سے کئی زاویوں سے سوچا ہے کہ اب وہ جسم کے فنا ہونے کا نہیں روح کی نجات کا مسئلہ بن گئی ہے۔ میں اپنے احساس کو بچانا چاہتا ہوں۔ جسم اپنی راہ خود ڈھونڈ لے گا۔

☆

جب میں پانچ برس کا تھا تو ایک دن نوکر آیا۔ میں سو رہا تھا۔

ماں بلا رہی ہے اس نے کہا۔

سونے دو۔ بڑی نیند آ رہی ہے۔ میں نے کروٹ بدل لی۔

نہیں، ماں جلدی بلا رہی ہے۔

صبح مل لوں گا۔

اس نے مجھے زبردستی گود میں اٹھایا اور نیچے لے آیا۔ میں روتا جاتا اور اس کے کندھے پر مکے مارتا جاتا تھا۔ ماں کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ نیچے فرش پر چارپائی سے لگ کر پتا جی ماں کا ہاتھ پکڑے بیٹھے تھے۔ موسی، نانا، ماما، بھائی اور کئی لوگ کمرے میں موجود تھے۔ ماں نے مجھے قریب بلایا۔ میں اس کی چھاتی پر سر رکھ کر سو گیا۔ شاید اس نے میرے گال چومے تھے۔ شاید اس نے میرے بال سہلائے تھے۔ شاید اس نے میری پیٹھ تھپتھپائی تھی۔ دعائیں دی تھیں۔ کچھ یاد نہیں۔ سب خواب تھا۔ جو ٹوٹا تو سب رو رہے تھے۔

ماں نہیں رہی تھی۔

مجھے ماں کے بارے میں کچھ یاد نہیں۔ بس ایک چہرہ کچھ سہما سہما سا۔ جب ہم مکان میں داخل ہوئے تھے، گھر کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ کمروں میں سب صندوق، الماریاں، دراز کھلے ہوئے تھے۔ ان کا سامان باہر بکھرا پڑا تھا۔ فرش پر ریشمی، مخمل، کمخواب، رنگ برنگ کے کپڑے۔ ساڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ چور آئے تھے۔ ماں کہہ رہی تھی۔ تمہارے پاس اتنے خوبصورت کپڑے ہیں۔ تم پہنتی کیوں نہیں؟ میں کہہ رہا تھا۔ یہ سفید گاڑھا کیوں پہنتی ہو؟

ماں مسکرا دی تھی۔ خوف کی کالی چھایا اڑ گئی تھی۔

جب تو بڑا ہو جائے گا تو سب سمجھ جائے گا۔

میں بڑا کب ہوں گا!

میرا جنم ۱۲ اگست کو ہوا تھا۔ ۱۵/۱۴ کی رات دیش آزاد ہوا تھا۔ میری پیدائش کے ۱۹ برس بعد۔ اس لحاظ سے میں بھی اپنے کو ان بچوں میں سمجھتا ہوں جن کا ذکر سلمان رشدی نے اپنی کتاب 'مڈنائٹ چلڈرن' میں کیا ہے۔

ماں شاید میٹرک پاس تھی یا مڈل پاس۔ ۱۹۳۳ء کی بات ہے اور مجھے یاد آیا وہ چہرہ، جس نے میری پانچ سال کی عمر میں ہی مجھے ہندی، اردو، پنجابی اور انگریزی پڑھانا شروع کر دیا تھا اور دیا لمس کا احساس اور دیا پیار کا شعور۔

مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا تھا۔ دو پترکار بات چیت کر رہے تھے:

ایک نے دوسرے سے کہا کہ اگر تمہارے سامنے کوئی ظالم ڈکٹیٹر بیٹھا ہو اور میں

تمہیں بندوق دے دوں تو تم کیا کرو گے؟ دوسرے نے جواب دیا کہ وہ بندوق میں عیدی امین کو دے دوں گا اور کہوں گا۔ لو یہ تمہارا ہتھیار ہے...... میرا نہیں۔

نفرت کا صرف ایک رنگ ہوتا ہے سیاہ اور پیار کے رنگ ہزار۔

میں نے لکھا...... "ہر آدمی جب کسی دوسرے آدمی کے قریب آتا ہے تو اس سے کچھ لیتا ہے اور کچھ دیتا ہے۔ مجھے تمہاری زندگی سے کچھ ادھار لینا پڑا ہے اور یہ ادھار ہے جیسے پرانی کرنسی اور کھوٹے سکے۔ لیکن میری یہی کوشش رہی ہے کہ اگر میں بیاج نہیں دے سکتا تو کم از کم اصل زر کو ہی نئی کرنسی اور چمکتے کھنکتے سکوں میں لوٹا دوں۔ میری زندگی اور تخلیق کے بیچ لین دین کا یہی چلن رہا ہے اور تمہارے اور میرے درمیان بھی یہی طریقہ چلتا رہے گا۔"

میرے ذہن میں یہ سب کچھ کیوں گڈمڈ ہو رہا ہے۔

کچھ گڑبڑ نہیں برخوردار' تم ایڈی پس کامپلکس کا شکار ہو مدر فکسیشن Mother Fixation انفینٹ سیکس کی گتھی (Infant sexuality) یعنی ان فنٹائل سیکسوئل ازم (infantile sexualism) کو دور کرو علاج

بالکل سادہ اور آسان۔ ماں کو بھول جاؤ۔ اس کی یاد کو' عکس کو مٹا دو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن میں ماں کو نہیں بھول سکا۔

میں تیزی سے باہر کی جانب بھاگا۔ اس کا علاج ہے اپنے اندر زندہ ماں کی ہتیا کر دو۔ ایک بچے سے بڑھ کر بالغ ہو جاؤ' اس بچے کو بھی قتل کر دو ہر اس چیز کو جس کا تعلق تمہاری ماں سے ہے' تمہارے بچپن سے ہے۔ اسے فنا کر دو۔

میں نے فرائیڈ کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا۔ کیا میں اب کسی بھی عورت سے نارمل رشتہ قائم نہیں کر سکتا۔

نہیں فرائیڈ کی موت ہو چکی ہے۔

کتنا سے بچ گیا...... میں نہ اپنی ماں سے الگ ہو سکا اور نہ ہی اپنے اندر کے بچے کو ہی پیچھے چھوڑ سکا۔ اپنی ماں کی یا بھی ڈور سے بندھا اور اپنے بچے کو گود میں اٹھائے کوئی کتنا لمبا سفر طے کر سکتا ہے۔ لیکن سوال تو اس بچے کا ہے

اس بچے کا کیا ہو گا؟

اس کیو مین Cave Man کا کیا ہو گا؟

کیا کوئی تہذیب اپنے آدم پرش کی لاش پر پرورش پا سکتی ہے۔

جب ہمارا آدم پرش مر جاتا ہے تو دوسرے تمام انسانوں سے ہمارے سب رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔

میں نے اپنی ڈائری میں لکھا

"میں کب سے سفر میں ہوں' ایک بے منزل سفر میں' میں جنگل میں پیدا ہوا' جوان خوبرو اور باشعور اور باحس ہو گیا میری موت ہو گئی۔ جب میں نے دوبارہ جنم لیا' بالغ ہوا تو میں نے ایک جنگل بنایا۔ لیکن یہ وہ جنگل نہیں تھا جس میں' میں جوان' خوبرو اور باشعور' باحس ہوا تھا۔ بلکہ وہ جنگل تھا جس میں' میں جواں مرگ' بے چہرہ اور بے حس ہو گیا......"

تم جہاں پیدا ہوئے ہو' اس دھرتی سے' اس گھر سے' اس گاؤں سے' اس جنگل سے ہجرت کر سکتے ہو۔ لیکن اپنے اندر سے اس دھرتی کو' اس گھر کو' اس گاؤں کو' اس جنگل کو باہر نہیں کر سکتے۔ لیکن میری تہذیب' میرا سماج' میری حکومت' میرا مذہب' میری تعلیم' میری معیشت' روزگار' رشتے داریاں' بچے مجھے ایک پنجرے میں بند کر کے میرے اندر کے اس بھوت کو نکالنے کے لیے مجھے ہر روز تعویذ دیتے رہتے ہیں لیکن یہ بھوت یا پرچھائیں میرے اندر سے نہیں نکلتی۔ وہ لوہے کے گرم گرم چمٹوں سے میرے سارے جسم کو داغ دیتے ہیں۔ بھوت چھپا کر رہ جاتا ہے لیکن نکلتا نہیں۔ میں اسے مار نہیں سکتا۔ وہ اسے قتل نہیں کر سکتے۔ میں اسے مار نہیں سکتا۔ وہ اسے قتل نہیں کر سکتے۔ اور کوئی اپنا نہیں سکتا یہ میری قسمت ہے یا میری ٹریجڈی' کہہ نہیں سکتا۔ اسی پانچ اور پچاس برس کے دوران ۱۵ سال کی عمر میں مجھے کسی نے اپنے جسم سے میرے جسم کا شعور دیا۔ بات کتنی سادہ تھی۔

میں نہانے جا رہی ہوں۔ میرے کپڑوں کا دھیان رکھنا۔ چیلاٹ ندی کے کنارے اس نے دھیرے دھیرے ایک مخصوص انداز میں اپنے کپڑے اتارنا شروع کیے۔ ہر کپڑے کی ہر حرکت پر اس کا جسم تھرکتا' وہ سسکتی' پایلوں کو جھنکارتی۔ دوپٹہ' شلوار' قمیض' انگیا اور کچھ بھی نہیں۔ شاید ان دنوں کچھ بھی نہیں کا رواج تھا۔ میں محو حیرت اس بدن کو دیکھ رہا تھا۔ خوبصورت' سڈول' تھرکتا ہوا' سرزور گھوڑے کی طرح بے قابو ہوتا ہوا۔

تم بھی نہا لو' پانی بہت ٹھنڈا ہے' اس نے اچانک کہا اور ایک چھینٹا پانی کا میرے منہ پر پھینک دیا۔

لیکن تمہارے کپڑے۔

اپنے کپڑوں کے نیچے رکھ دو۔ اس نے بڑی سادگی سے کہا۔ وہ پانی میں تھی۔ میں پانی میں تھا۔ سورج دھیرے دھیرے ڈوب رہا تھا۔ دور پہاڑیوں کے پیچھے سے اس کی سرخ سنہری کرنیں' اس کے سنولائے گورے بدن سے پھسل کر پانی کی لہروں پر تیر رہی تھیں۔ پانی کی آئینہ لہریں' سورج کی سترنگی کرنیں' بدن پر بدلتی دھنک جیسی لہریں تھرکتے قدموں کے رقص کے پس منظر میں بجتا پانی کا گیت۔

میری چوٹی کو ذرا کھول دو...... کہیں چھوٹ جائے گی۔ میرے ہاتھ نہیں پہنچتے۔ اس نے کہا تھا۔

اور میری انگلیوں نے پہلی بار آنچ محسوس کی تھی آنچ اتنی شیتل اتنی

راحت بخش ہو سکتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔

یہ خواب تھا یا مدہوشی۔

کتنے برس بیت گئے...... اس منظر اور جسم کی بیداری کو۔ حسن کی ایک حیرت کن تصویر پھول پھول کے دوپن کے پیچھے سات رنگ تھے اور دھنک کے بدن کے لمس اور گداز اور رنگ اور حرکت کا احساس۔ اف۔ آج بھی جب کوئی خوبصورت بدن دیکھتا ہوں تو انگلیوں میں بجلی بجلی آنچ اٹھنے لگتی ہے اور اس بدن کے پرے ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر بہتے پانی کا گیت دیکھتا سنتا ہوں، تو روشنی پانی میں بدل جاتی ہے اور پھر وہی مدہوشی۔

اور ایک بار پھر میں جسم کے مادی رشتے سے الگ ہو جاتا ہوں۔ بدن برف کی سل بن جاتا ہے اور سلگتی آنچ ٹھنڈی راکھ۔

بے شعور...... کیوں تم بدن کے سورج کو اگنے اور گرتے ہوئے پانی کے گیت کو بہنے سے روک نہیں دیتے۔

بچپن کے پانچ برس تو ہوش آنے سے قبل ہی نیم بیہوشی میں گزر گئے۔ قریب نصف صدی تک میں نے زندگی کو شعوری طور پر جیا۔ ایک دو سالوں میں میں ۵۵ برس کا ہو جاؤں گا۔ اور پھر میں زندگی کے پورے جسم کو اپنی انگلیوں سے چھوؤں گا اس کے ہر ایک ایروجینک زون (Erogenic Zone) کا لمس محسوس کروں گا کہ مجھ میں وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے یا نہیں جو چالیس سال پہلے پیدا ہوئی تھی۔

لیکن میرے اور دوسرے جسم کے بیچ یہ فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے، بڑھتا جائے گا۔ جب تک کسی جسم کے پیچھے سورج نہیں اُگتا۔ جب تک کوئی بدن ندی کی لہروں میں نہیں ڈوبتا۔

پانچ ستاروں والے ہوٹل کے بند کمروں میں سجے بیش بستروں پر لیٹے جسموں اور کھلے نیلے آکاش کے کناروں کی چھاؤں میں بکھری ریت پر مچلتے جسموں میں شاید یہی فرق ہے۔ ایک دوسرے سے ہم آغوش جسموں میں کتنا فاصلہ ہوتا ہے اس کی پیمائش نہیں ہو سکتی۔

کچھ سال پہلے میں ایک اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہاں سے دوسری گاڑی پکڑنی تھی۔ میں جس بنچ پر بیٹھا تھا۔ اس پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ سیدھی سادی۔ کتاب پڑھنے میں مگن۔ وہ کتاب تھی۔ ہیٹا ووسٹل اور جان ووسٹل کی شفٹنگ گیرز (shifting gears) کچھ عرصہ پہلے اس کتاب کو پڑھنے کا مجھے موقع ملا تھا۔ میں نے پوچھ لیا۔ کیسی لگی یہ کتاب، اچھی ہے۔ جواب ملا پھر چند ایک باتوں کے بعد بولی۔

میں نے اس کتاب کو پڑھنے سے پہلے ہی زندگی کا گیئر بدل لیا تھا۔

لیکن جب دوبارہ گیئر بدلنے کی کوشش کی تو گاڑی پٹری سے اتر چکی تھی۔

مطلب

میں اپنے شوہر سے الگ رہتی ہوں۔

اوہ۔ میں نے ہمدردی ظاہر کی۔

اس میں افسوس کی کوئی بات نہیں۔ وہ مسکرائی۔

لیکن۔

دراصل میں دوسری طرح کا شکار ہو گئی تھی۔

آپ کو افسوس ہے کیا آپ مردوں سے آزادی حاصل کرنا نہیں چاہتیں۔ آپ کے ہندوستانی سنسکار...... میں تحریر کے موڈ میں تھا۔

سوال مردوں سے آزادی یا عورتوں سے آزادی کا نہیں۔ سوال ان سنسکاروں اور تشخص سے آزادی کا ہے۔ جو آزادی کے نام پر باہمی رشتوں کو توڑ دیتے ہیں۔

اب وہ بول رہی تھی۔

شادی کرنا، بچے ہونا ہی کافی نہیں۔ یہ صحیح ہے لیکن آزاد کا رہنا یا نوکری بھی تمہیں نجات نہیں دے سکتی۔ سماج میں سٹیٹس یا رتبہ سب بے سود ہے اگر تم دوسرے انسانوں سے الگ ہو جاتے ہو تو تمہاری زندگی کے بھی کوئی معنی نہیں رہ جاتے

لیکن آزاد ہونے کا احساس آپ کو تسکین نہیں دے سکتا۔ آپ کے پاس اتنا پیسہ ہے چاہے جیسے خرچ کریں۔ سوشل سرکل ہے۔ جسم اور من آزاد ہے۔ پیسہ، سٹیٹس، آزادی، کچھ بھی تمہارے من کی تنہائی کو بھر نہیں سکتا۔ ہر چیز کی اہمیت دوسری چیزوں سے اس کے رشتے میں ہے۔

پھر اس نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا۔

ہر آدمی اپنے گہرے جذبے اور تخیل کی بلندی پر ذہن میں تنہا ہوتا ہے۔ صحیح ہے لیکن انسان کا دوسرے انسان سے ایک رشتہ ہوتا ہے۔ وہ رشتہ اور یہ رشتہ این کاؤنٹر (Encounter) اکیلے انسان کا نہیں، دو انسانوں کا باہمی تجربہ ہے۔ لوگ برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے ہوتے ہیں۔ جسم کا کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی یہ این کاؤنٹر نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اپنی حفاظت کے لیے پہنے زرہ بکتر اور ہیلمٹ اتار پھینکنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔ انہیں یہ ڈر رہتا ہے کہ ننگے من کے ساتھ وہ محفوظ نہیں۔ اگر کوئی انسان کسی دوسرے کو یہ بھروسہ دے سکتا ہے کہ وہ اس کے تخیل اور جذبے میں داخل ہونے کا جوکھم اٹھانے کو تیار ہے۔ تو این کاؤنٹر پیدا ہوتا ہے۔ اور ہم تشویش اور خوف اور دہشت سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ سیکس یا ٹونکس یا جسم کا کوئی سوال نہیں۔ یہ بنیادی پیرا سیکچول (Para Sexual) (ماورائے جنس) ہے۔ مکمل انسان کے تجربے کا۔ جسم کا عریاں ہونا یا کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ہم ایک دوسرے سے اپنا جسم شیئر (share) کر سکتے ہیں۔ لیکن فینٹسی نہیں۔ خواب، خوف، جنون، کا سامنا ہم ڈرتے جسم سے نہیں دل سے ڈرتے ہیں۔

لیکن اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔
یعنی......
آپ کا رشتہ ہے دل کا لیکن جسم کا رشتہ نہیں...... کیونکہ آپ سمجھتے ہیں کہ دوستی یا ذاتی سی میں عورت کو عورت کے روپ میں اور پرش کو پرش کے روپ میں لینا ایک طرح کا سستا پن ہے۔
وہ کھلکھلا کر ہنسی۔
ہاں۔ عورت اور مرد کا رشتہ جنس سے عاری بھی ہو سکتا ہے اور جنس پر مبنی بھی۔ لیکن میرے خیال میں عورت اور مرد کی دوستی میں بھی جنس کا کچھ نہ کچھ عنصر کسی نہ کسی روپ میں ضرور شامل رہتا ہے۔ شاید یہ پرسنل ہوتا ہے۔ ہر انسان کی دنیا میں کتنا کچھ ہے۔ شاید وہ اپنے ہم راز دوستوں کے سوا کسی سے شیئر نہیں کر سکتا۔ پھر بھی ایسا کچھ رہ جاتا ہے جو وہ ان سے بھی شیئر نہیں کر سکتا۔ ماسوائے اپنے۔ لیکن حالت تب اور بھی پراسرار اور پیچیدہ ہو جاتی ہے جب وہ یہ جانتا رہتا ہے اپنے سے بھی شیئر کرنے سے ڈرتا ہے۔
برسوں بعد میں نے محسوس کیا کہ جسم سے پرے بھی کئی رنگ ہوتے ہیں۔ کئی آوازیں ہوتی ہیں۔ میں جسم سے پرے ہو پایا الگ نہیں ہوں۔ لیکن جسم محض بستر نہیں۔ جسم ایک چھوٹا سا گاؤں بھی ہے اور وسیع شہر بھی۔ جسم ہمالیہ بھی ہے اور گرم لو اڑاتا ریگستان بھی۔ جسم ہمالیہ بھی ہے اور خواہشوں کا آباد نگر بھی۔ جسم جسم بھی ہے اور نہیں بھی۔
جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس میں تضاد ہے۔
لیکن جب تک یہ تضاد ہے تب تک میں زندہ ہوں۔ جس دن یہ تضاد مٹ جائے گا میں بھی نہیں رہوں گا۔
بھری محفل میں ایک راز کی بات کہہ رہا ہوں۔ میں نے کئی بار یہ کیفیت محسوس کی ہے۔ سردیوں کی دوپہر کو ایک گھماؤ دار چھوٹی سی گلی سے گزرتے ہوئے ننھے ننھے گھروندوں کی نرم مہک، لیے بکھرے بالوں کی مہک ہوا میں اڑتی ہوئی جسم کی تھرکن ہر بڑھتے قدم کے ساتھ ایک نغمہ۔ جسم کا ہر مسام بیدار ہو کر کھل جاتا ہے اور ہاتھ بڑھتے ہیں اس کی کمر کے گرد ڈھلا کر اس کو لپٹانے کے لئے اور رک جاتا ہوں۔ اور گلی گزر جاتی ہے یا ایک شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں کسی پارک کی روش پر چلتے ہوئے درختوں میں سے چھن چھن کر آتی ہوئی روشنی اور جنتر منتر کی دیواروں سے جھانکتے ہوئے چاند میں چلتے ہوئے سائے میں خاموشی کے ساتھ...... اس کے چہرے اور بالوں پر روشنی اور اندھیرے کا چھلاوا ترتیب اور پارک پار ہو جاتا ہے کتنے ہی منظر ہیں۔ سگریٹ کے دھوئیں کے پیچھے ابھرا تصویر سا چہرہ سڑک پار کرتے ہوئے لوگوں اور ٹریفک کے ہجوم میں۔
کیا تم سیکسوئلی ریسپانڈ (sexually respond) نہیں کرتے۔
کرتا ہوں۔ جسم کی زبان ہوتی ہے وہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے ہیں۔ لیکن جس ماحول میں ہمارا پالن ہوا ہے اس میں ہر وقت یہی احساس ہوتا ہے پھول توڑنا منع ہے گھاس پر چلنا منع ہے یہ عام راستہ نہیں۔ خطرہ...... ہائی وولٹیج (high voltage)۔
میری دلچسپی پودے میں کم اڑان میں زیادہ رہی ہے۔ پھول میں کم خوشبو میں زیادہ دل میں کم دھڑکن میں زیادہ' جسم میں کم روح میں زیادہ' لیکن مسئلہ یہ ہے کہ روح کا راستہ جسم سے ہو کر گزرتا ہے۔ جسم اور روح کے اس لمبے سفر میں کیا ملا۔ "شبد"...... شاید نہیں۔ بس کچھ نقش ہیں' کچھ آوازیں' کچھ لمس' کچھ خوشبوئیں' کچھ کہانیاں اور کچھ بے خواب راتیں جو جسم سے دل کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں وہ وحشی بن جاتے ہیں اور جو دل کو نظر انداز کرتے بستر بہ بستر چلتے ہیں وہ بے حس۔ اس کشمکش میں کبھی دل ٹوٹتا ہے اور کبھی جسم شکست ہوتا ہے۔
کبھی آپ نے کسی عورت کو صبح کی پہلی کرن کی پہلی روشنی میں رات کے بستر کی شکنیں درست کرتے گنگناتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ آسودگی ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ ہمارے چہرے اور دل پر ہر روز کتنی شکنیں پڑتی ہیں۔ لیکن ہم انہیں درست نہیں کرتے یا کر نہیں پاتے۔ وہ گہری ہوتی جاتی ہیں' مستقل بن جاتی ہیں۔ ان میں دھول اور میل جمع ہو جاتی ہے اور ایک دن وہ ہمارے جسم' دل اور دماغ پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ اس کا رنگ اور اس کی بو ہر کسی کو جو ہمارے قریب سے ہو کر گزرتا ہے' اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں کاش ہم کچھ اور پیش کر سکتے۔ پھول کی ایک پتی۔ اوس کی ایک بوند' تتلی کا پنکھ' دھنک کا رنگ' لمس' شکن درست کرتی عورت کی گنگناہٹ لیکن میلے شیشے سے دیکھتے دیکھتے دوسرے کے چہرے تو میلے نظر آتے ہیں۔ اپنا چہرہ بھی میلا ہو جاتا ہے۔ دھول اور میل چہرہ بن جاتے ہیں۔
تو سوال درد کے رشتے کا ہے اور میں اس رشتے کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہوں بغیر کسی گہری سطح کو چھوئے ہم زندگی کی باہری سطح کو محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن سوال اس درد کا ہے جو روح کی گہرائیوں تک سرایت کر چکا ہے جس کے بغیر زندگی کے کوئی معنی نہیں۔ اس کے لئے درد کی کس کس گلی سے گزرنا پڑتا ہے اور اگر ہم حوصلے' شوق اور جذبے سے اس گلی سے گزر جاتے ہیں تو ہماری کمزوریاں الجھنیں اور اضطراب ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن یار اس کا یہ مطلب نہیں کبھی کبھی ان جانی راہوں پر بھٹک جانا۔ تجربوں کے بھنور میں نکل پڑنا زندگی کی پراسرار دنیا میں سفر کرنے کے لئے بہت ضروری ہے۔
کچھ سال پہلے میں بنگلور سے دلی آ رہا تھا۔ گاڑی میں میرے سامنے والی برتھ پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ بات برلن سے اب تک آ پہنچی۔

کمرشل اسٹریٹ میں دستکاری کی چیزوں کی اس کی دکان تھی۔ وہ سارتر، نطشے اور دوستوفسکی کی تحریروں کا ذکر کر رہا تھا۔ ان کی کتابوں کے پیراگراف کے پیراگراف سنا رہا تھا۔ وجودیت سے لے کر زین بدھزم میڈیٹیشن کی تشریح کر رہا تھا۔ میرا تجسس بڑھ رہا تھا۔ راجستھان کے مارواڑی خاندان کا لڑکا اور وجودیت! اس نے بتایا کہ اس کی دکان پر ایک بدیسی عورت آئی۔ اس کے ہاتھ میں چند کتابیں تھیں۔ اس نے کچھ خریدا اور دکان کے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ وہ کتابیں وہیں بھول گئی ہے۔ اس نے باہر جا کر چاروں طرف دیکھا لیکن وہ جا چکی تھی۔ اس نے کتابیں اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں۔ شاید وہ کبھی آئے گی اور لے جائے گی۔ کتابیں اس کے کس کام کی تھیں۔ وہ پھر نہیں آئی۔ دکان میں نئی اشیاء رکھنے کے لئے جگہ چاہئے تھی۔ وہ کتابیں اٹھا کر گھر لے آیا۔ اور ڈرائنگ روم میں رکھ دیں۔ ڈرائنگ روم میں سجاوٹ کی کچھ چیزیں آ گئیں۔ کتابیں وہ اپنے کمرے میں لے آیا۔ اور ایک کونے میں رکھ دیں۔ ایک دن بارش زوروں سے ہو رہی تھی۔ دکان کی چھٹی تھی۔ بیکار وقت نہیں کٹ رہا تھا، سوچا دیکھوں ان کتابوں میں کیا ہے؟ ان پر دھول جم گئی تھی، صاف کی۔ ایک کتاب پڑھنے کے لئے اٹھائی، کچھ سمجھ میں نہیں آیا لیکن کچھ اچھا لگا۔ کتاب تھی سارتر کی نو ایگزٹ (No Exit) اور پھر پڑھتا چلا گیا۔ پڑھتا چلا گیا۔ بارش تھم گئی تھی۔ لیکن میں اپنے کمرے سے نہیں نکلا جب تک کہ کتاب ختم نہیں کر لی۔ دوسرے دن میں دکان پر نہیں گیا۔ ایک دوسری کتاب پڑھنا شروع کیا۔ کافکا کی ٹرائل (The Trial) اور اسی طرح تیسری کتاب دوستوفسکی کی "نوٹس فرام دا انڈر گراؤنڈ" (notes from the underground) بھی پڑھ ڈالی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی کال کوٹھری میں بند ہوں، جس کے نہ دروازے ہیں اور نہ کھڑکیاں، شاید کافکا نے کہا تھا اپنے خطوں یا ڈائری میں۔ اور اس دن سے میں اس کال کوٹھری سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ کال کوٹھری چاہے سماج کی ہو، اپنے جسم کی یا اپنے حق کی۔ ہم سب سزائے موت بھگتنے کے لئے اس کال کوٹھری میں بند ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ہمیں لگتا ہے۔ شاید خدا کی موت ہو چکی ہے۔ ہم نے اس کو قتل کر دیا ہے۔ شاید نطشے نے یہ کہا تھا۔ انسان مر چکا ہے اور ہم اس کے گواہ ہیں۔ بیکٹ نے کہا تھا۔ کوئی مسیحا نہیں آ رہا ہے۔ ہم گودو کے انتظار میں کب سے کھڑے ہیں اور اس نے کہا کہ ہر انسان کو اپنی نجات کے لئے اپنی صلیب خود اٹھانی ہے۔

سنسکار کس طرح چھوٹتے ہیں۔ زندگی کو نئی بصیرت کس طرح ملتی ہے۔ کتنے تجربے ہوئے ایک زندگی میں۔ جب میں کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا اور آزادی کی تحریک کے سلسلے میں شمال مغربی سرحدی صوبے میں، ہم کچھ طلباء گئے تھے۔ دن بھر جنگلی علاقے میں گھومتے گھومتے بہت تھک گئے تھے۔ کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ شام کو ایک گاؤں میں پڑاؤ تھا۔ جب ہم اس گاؤں میں پہنچے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ قبائلی پٹھانوں اور ان کے سرداروں سے بات چیت شروع ہو گئی۔ خیالی پتھریلی پہاڑوں کے پیچھے سورج دھیرے دھیرے پگھل رہا تھا۔ نیچے کھلا آسمان پر سرخ رنگ بکھر رہا تھا۔ بھوری بھوری پہاڑیوں اور لمبے گھنے چناروں کے سائے پھیل رہے تھے۔ آہستہ آہستہ سائے سمٹنے لگے بہت جلد تاریکی نے نگل لیا۔ اور پھر جل اٹھیں مشعلیں، وسیع میدان کے بیچ میں الاؤ جل رہا تھا۔ اور اس پر لوہے کی ایک لمبی چھڑ میں بندھا مینڈھا بھنا جا رہا تھا ہوا میں کچھ کچھ خنکی تھی۔ پھر شروع ہوا ان کا ناچ اور گانے۔ کالی بھوری واسکٹیں کالی نیلی پگڑیاں، لمبی لمبی گھیرے دار شلواریں اور کاڑھے کے کرتے۔ چمکتی جڑی لاٹھیاں اور دونالی بندوقیں فضا میں ایک پر زور حرکت تھی ایک لے، ایک حرکت، ایک سنگیت، ایک بھونچال جیسا احساس جو فرنگی ڈرم بیٹ کو زیر کرتا ہے۔ نان کی خوشبو بھونے ہوئے گوشت کی گرم مہک۔ ایک عجیب سا سماں تھا، اور بھوک بڑی ستا رہی تھی۔ سامنے چینی کی رکابیوں میں نان اور گوشت، مٹی کے مٹکوں میں پانی اور گھریلو کشید کی ہوئی شراب۔ مجھے نان اور پانی کے سوا کچھ راس نہیں تھا۔ نہ گوشت، نہ شراب۔ بڑا سنکٹ تھا۔ بھوک اور سنسکار کا تصادم۔ دونوں طرف بیٹھے دوست بھی تذبذب میں تھے۔ کسی ترکاری کا بندوبست ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ پنڈت جی شوربے سے کام چلے گا۔ ہماری کھسر پھسر سن کر ایک دو پٹھان ہمارے قریب آئے۔ وہ سمجھے شاید مہمان نوازی میں کوئی کسر رہ گئی ہے۔ اور انہوں نے پوچھا نہیں سب ٹھیک ہے۔ میں نے کہا لیکن ایک دوست کے منہ سے نکل ہی گیا۔ یہ گوشت نہیں کھاتے۔ ان کے چہروں کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ بس تھوڑی دیر میں آلو تیار ہو جاتے ہیں۔ بس تھوڑی دیر میں۔ ایک کھلبلی سی مچ گئی ان کی پریشانی، الاؤ کے شعلے پیلے لپکتے شعلے۔ ان کا زمین کی چھاتی پر زور زور ناچ پہاڑوں سے گونج کر لوٹتی ڈھولوں کی آواز۔ دیکھتے ہوئے چہرے کسی کا دل بجھ جانے کا احساس میرے سامنے ایک جذبے کا قتل ہو رہا تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ بالکل غلط۔ میں نے سوچا۔ محبت کی توہین۔ میں نے دونوں طرف بیٹھے ہوئے دوستوں کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا اور ہلکا سا دبا دیا۔ وہ مسکرا دیے۔ میں نے نان کا ٹکڑا توڑا۔ اور شوربے میں ڈبو کر کھانا شروع کر دیا۔ ایک لمحے کے لئے میرے اندر بچپن سے جو کچھ تھا، ایک دم کلبلا کر حرکت میں آ گیا۔ اور پھر سب کچھ شانت ہو گیا۔

آج جب میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ ایک دم کیسے ہو گیا۔ بھوک یا جادوئی منظر، سنگیت یا رقص یا دونالی بندوقیں یا جذبۂ قتل جذبہ۔ میں نے بھوک سے کبھی شکست نہیں کھائی۔ جسم کی حدود کو توڑ دینے والا پیشن (Passion) زندگی بھر اس نے میرے سنسکاروں، وچاروں اور قدروں کو چیلنج کیا ہے اور اس کے سامنے میں خود سپردگی کرتا آیا ہوں۔ ہماری بھوگی ہوئی حقیقت تو دو جسموں کا فاصلہ بھی دور نہیں کر سکی انسانوں کے بیچ کیا پاٹے گی۔ سنسکار بوجھ

ہیں اگر جکڑ میں لے لیں۔ علم کی کوئی حد نہیں۔ ہم عمل کرتے ہیں اس علم سے جو اس علم کا محض ایک جزو ہے جو موجود ہے اور جو کچھ موجود ہے وہ تو اس کا بہت ہی کم حصہ ہے جسے ابھی ہم نے جانا ہے تو پھر کیا شراپ پائی ہوئی اہلیا کی طرح پتھر بنے صدیوں سے ایک مقام پر بے حرکت، بے حس کھڑے رہیں کہ کوئی آئے اور اپنی ٹھوکر سے ہمیں پھر زندہ کر دے۔

ہر بار زندگی سے ہمارا سامنا ایسے ہوتا ہے جیسے پہلی بار اس سے ملاقات ہوئی ہو۔ ایسے جزیرے میں داخل ہوئے ہیں جہاں کسی کے قدم نہیں پڑے۔ ایسے جنگلوں میں آ گئے ہیں جہاں کوئی پگڈنڈی نہیں اور جو بھی اس میں ایک بار داخل ہوتا ہے نکل نہیں آتا۔ یہ خلا سے بھی روبرو ہوتا ہے جسے صرف آپ کا وجود ہی پار کر سکتا ہے۔

مشہور ناول 'آل کوائیٹ آن دی ویسٹرن فرنٹ' (All Quiet on the western front) پر بنی فلم میں ایک فوجی سپاہی خندق میں پڑا ہے اس کے ہاتھ میں بندوق ہے اس کے سر کے قریب ایک تتلی اڑتی ہے وہ اسے پکڑنا چاہتا ہے وہ جانتا ہے کہ اگر وہ اپنا ہاتھ خندق سے نکالے گا تو دشمن کی گولی اس کو چیر سکتی ہے لیکن تتلی کو پکڑنے کی خواہش میں وہ اپنا ہاتھ خندق سے باہر نکالتا ہے دشمن سے ایک گولی اس کے ہاتھ کو چیرتی ہوئی نکل جاتی ہے کیا ہے انسان کے اندر جو اسے خوشبو، رنگ اور آواز کو پکڑنے کے لیے جنون کی حد تک لے جاتا ہے۔ جہاں موت زندگی بن جاتی ہے اس کی قوت بن جاتی ہے اس کا خوف مٹ جاتا ہے۔ اڑتی تتلی کو پکڑنے کی اڑتے پرندے کو پیار کرنے کی جس کی خواہش مر جاتی ہے وہ کب کا مر چکا ہوتا ہے یہی زندگی ہے۔ ہمارے ایک ہاتھ میں بندوق ہے۔ زندگی کی حفاظت کے لئے دشمنوں سے لڑنے کے لئے جوان کٹ رہے ہیں۔ مہلک ہتھیاروں سے لیس گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ ان سے اپنی جان بچانے کے لئے ہم سالہا سال خندقوں میں پڑے رہتے ہیں۔ لیکن ہم کہکشاں پر کمند پھینکنا چاہتے ہیں آسمان کو مٹھی میں بند کرنا چاہتے ہیں۔ پرندے کی طرح آزاد فضاؤں میں اڑنا چاہتے ہیں۔ اور ایک دھنک رنگ تتلی کو پکڑنے کے لئے اپنی جان دے دیتے ہیں۔ یہ جنون ہی ہے Passion ہے۔ اور میں نے محسوس کیا کہ میں بھی کچھ لکھ سکتا ہوں۔

لیکن کچھ ایسا لکھوں کہ آنے والی نسلیں یاد رکھیں۔

یہ میرا کام نہیں۔

تو!

یہ کام عظیم ادیبوں کا ہے۔

کیا تم عظیم ادیب نہیں بننا چاہتے۔

میں اپنے کمرے میں سانس لیتا ہوں۔ میرا مخاطب ان سے ہے جو میرے ساتھ سفر میں ہیں۔ ہومر، کالی داس، شیکسپیئر، فردوسی، غالب۔

میں نے قلم رکھ دیا اور ادب کی بیرونی حد میں آ گیا۔ کیونکہ میں عظیم ادیب نہیں بن سکتا میں ادیب ہی نہیں بن سکتا جس کی ساری تہذیب ادب، سیکس ہر چیز حاشیے پر آ گئی ہو وہ کیا لکھے گا۔

ادب کی حد سے باہر ہو جانے کی کئی وجہیں تھیں۔ میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ میں حقیقت پرست نہیں ہوں۔ جو موجودہ ادب کے لئے بڑی ضروری ہے۔ میں چیزوں اور فرد کو ایسا نہیں دیکھتا جیسا کہ وہ ہوتے ہیں بلکہ ہمیشہ ان سے پرے دیکھتا ہوں۔ دوسرے میں بنیادی طور پر جذباتی اور رومانی ہوں۔ جذبات میں بہہ جانا اگر ادب کی تخلیق کے لئے مہلک ہے تو میں ادب سے دور ہو جاتا ہوں۔ میں نہ خارجی حقیقت پر لکھ سکتا ہوں، نہ ہی اپنی ذات پر کیونکہ میں خود پسندی کا نہیں اپنی کاوش کا قائل ہوں۔

ایک بنجارہ یا خانہ بدوش ہی حدوں کو توڑ سکتا ہے۔ وہ ایک طرح سے ازلی انسان ہے سماج، اخلاق، ریاست، قاعدے قانون سے پرے اس پار جانے کی تمنا ام ہے زندگی کا ہر اس حد کے پار جس کا گزر یہ ہو دائمی تسلیم کر لیا گیا ہے کسی دوسرے کی زندگی جینا زندگی سے وشواس گھات ہے۔ میں ادیب بھی بننا چاہتا ہوں اور ایک متوسط طبقے کا نوکری پیشہ فرد ہوں۔ شادی شدہ، گھر بار، خاندان، مکان، بینک بیلنس، آرام و آسائش، فنکار بھی بننا چاہتا ہوں اور تخلیق کا خالق اور ایک بھلا پرش بھی۔ یہ قریب ۳۰ برسوں تک چلتا رہا۔ میں ایک خانہ بدوش ہوں جو تلاش کرتا ہے جمع نہیں کرتا۔ میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے کیونکہ میں حدوں اور رسموں رواجوں کے پرے نہیں جانا چاہتا۔ ہرمن ہیس نے لکھا تھا۔

"میرے پاس بھی گھر تھا۔ میں نے بھی ایک مکان بنوایا پلان کے مطابق دیواریں اور چھت باغیچوں میں پگڈنڈیاں بنائیں۔ اپنی ہی دیواروں پر اپنی تصویریں آویزاں کیں۔ ہر آدمی یہی کرتا ہے۔ میں خوش ہوں کہ ایک بار میں نے ایسی ہی زندگی بسر کی تھی۔ زندگی میں میری کئی خواہشیں پوری ہو گئیں۔ میں شاعر بننا چاہتا تھا۔ میں شاعر بن گیا۔ میں مکان چاہتا تھا۔ میں نے مکان بنا لیا۔ میں ایک بیوی چاہتا تھا اور بچے وہ بھی مل گئے۔ میں لوگوں کو متاثر کرنا چاہتا تھا وہ بھی ہو گیا، لیکن خواہشوں کی تکمیل کو میں برداشت نہیں کر سکا۔ شاعری میرے لئے مشکوک ہو گئی۔ مکان میرے لئے تنگ ہو گیا۔ جو میں نے حاصل کیا وہ میرا مقصد نہیں تھا۔"

مجھے یاد آتا ہے کہ کس طرح میرے چھوٹے بچے نے ایک دم توڑتی چڑیا کو پانی پلا کر زندہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔

مجھے یاد آتا ہے ایک فلم کا وہ منظر جب ایک سپاہی ایک تتلی کو پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ خندق سے باہر نکالتا ہے تو دشمن کی گولی اس کے ہاتھ میں لگتی ہے۔

اور پھر ایک فلم کا منظر جب پولیس میگافون پر اعلان کرتی ہے کہ اگر کوئی اور نکسلائٹ بچا ہو تو سامنے آجائے تو ایک چھوٹا سا بچہ اپنے ہاتھ اٹھا کر سامنے آجاتا ہے۔

مجھے یاد آتا ہے ایک اور منظر جب سارا گاؤں فلم کا خاموش تماشائی بن جاتا ہے تو ایک بچہ مہندر کے گھر کی کھڑکی پر غلیل سے پتھر پھینک کر بھاگ جاتا ہے۔

اور مجھے یاد آتا ہے طلوع آفتاب میں پانی میں رنگ بدلتے بدن کا لمس۔

اور مجھے بستر مرگ پر پڑی ماں کا مسکراتا چہرہ یاد آتا ہے۔

بے شعور...... یہ سب کچھ مجھے کیوں یاد آتا ہے۔ میں اتنا بے بس، بے سہارا اور کمزور کیوں ہو گیا ہوں۔ وہ بلی کا "گاڈ" مجھ سے میرا شعور، میرا احساس چھین لے یا مجھے موت دیدے لیکن مجھے خودکشی پسند نہیں۔ حالانکہ میری زندگی میں کئی بار ایسے موڑ آئے جب یہ احساس ہوا کہ یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں۔ دوستوں نے کہا کہ جس آگ کے دریا سے تم تیر کر ڈوب کر نکلے ہو۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو کب کا خودکشی کر چکا ہوتا۔ میری رگوں میں خون گرم لاوے کی طرح بہنے لگا۔ شعلے کی طرح چلکتا ہوا...... اُف اگر خون کی رفتار مدھم پڑنے لگے گی یا وہ ٹھنڈا ہونے لگے گا یا اس کا رنگ بدل کر سرخ سے سفید ہونے لگے گا تو ضرور کر لوں گا۔ ورنہ میں گھاس پھوس بن کر زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ "ہوز لائف از دس اینی وے" (whose life is this any way) کا ہیرو جب فالج کا شکار ہو کر بے حرکت ہو جاتا ہے تو اسے زندہ رکھنے کے لئے مقوی انجکشن دیئے جاتے ہیں۔ وہ انکار کر دیتا ہے وہ کہتا ہے میں مٹی دنیا کا ایک مجرہ بن کر زندہ رہنے کے بجائے ایک انسان کی موت مرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

میں نیند کی گولیاں کھا کر شانتی سے مرنا نہیں چاہتا۔ نہ آگ میں جل کر۔ نہ پانی میں ڈوب کر۔ نہ ہی پھانسی کا پھندہ گلے میں ڈال کر۔ اگر ایسا ہو سکا تو میں شہید بھگت سنگھ کے نقش قدم پر چلتا۔

زندگی بھر تمنا رہی کہ ایک کار خریدوں لیکن یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ کبھی اتنی رقم نصیب نہ ہوئی۔ ایک بیچارہ اسکوٹر تھا، سو وہ بھی بک گیا۔

لیکن جب مجھے مرنا ہوگا تو میں ایک رینٹل کار لوں گا۔ اس کی ٹنکی میں لبالب پٹرول بھر لوں گا اور نیشنل ہائی وے پر نکل پڑوں گا۔ ہیڈ لائٹ کی چندھیائی روشنی میں کسی ایک بھول کا نام لے کر کسی چٹان سے ٹکرا جاؤں گا۔ میرا جسم، میرا چہرہ سب کچھ کٹ پھٹ جائے گا۔ گرم اور سرخ خون کار کے چمکتے شیشوں، سخت چٹانوں اور بھوری مٹی پر بہنے لگے گا۔ اور میں اپنی زبان کی نوک سے چکھوں گا کہ اس میں وہ حرارت ہے کہ نہیں جس کی تمنا میں نے زندگی بھر کی ہے۔

آخر ہم ادب کیوں پڑھیں!

دیویندر اسر

"لوگوں کی حماقت ہر چیز کا جواب پا لینے سے عیاں ہوتی ہے اور ان کی عقلمندی ہر چیز کے آگے سوال لگانے میں عیاں ہے سوال ہمیں دنیا کو الگ سوال کی شکل میں دیکھنے کے باعث خود کو بنا دیتا ہے جب کہ اس کے برعکس آمریت پرستوں کی دنیا...... چاہے مارکسی مذہب یا کسی دھرمی بنیاد پر کھڑی کیوں نہ ہو ...... سوال کے بجائے بنے بنائے جوابات کی دنیا ہوتی ہے جہاں سوال کے لئے کوئی جگہ نہیں"

...... میلان کنڈیرا (فلپ روتھ سے ایک گفتگو)

"کچھ کہتا ہے ان لوگوں پر غور کرو اور پھر ان کے طرز زندگی پر ان کی عادات پر ان کے اطوار پر ان کی آواز کے لہجے پر انہیں غور سے دیکھو جو ادب پڑھتے ہیں جو جتنے بھی انہیں میسر رہتے ہیں الفاظ جو ان کے منہ سے نکلتے ہیں خیالات جو ان کے ذہن کا سامان مہیا کرتے ہیں کیا دولت کا کوئی بھی ذخیرہ اس قابل ہے جس کی شرط یہ ہو کہ اسے حاصل کرنے کے لئے ان کی طرح ہی چلا جائے"...... میتھیو آرنلڈ کلچر اینڈ انارکی (۱۸۶۹ء)

قریب نصف صدی تک (ادب) لکھنے پڑھنے کے بعد اس سوال کا پیدا ہونا کہ آخر ہم ادب کیوں پڑھیں اگر باعث حیرت نہیں تو باعث تشویش ضرور ہے ہمارے عہد میں ادب کی کیا اہمیت یا معنویت ہے؟ شاید اس سوال نے پہلے کبھی اتنا بے چین نہیں کیا تھا جتنا کہ آج کر رہا ہے اس کا کیا باعث ہے؟ کیا یہ ہاری ہوئی لڑائی ہے یا ہاری جانے والی لڑائی ہے؟ ہوا یوں کہ میں نے اپنے ایک دوست (جو وقتاً پڑھتے لکھتے تھے اور وضع کھو رہے تھے) سے کہا کہ آپ اتنا کچھ پڑھتے ہیں ادب کیوں نہیں پڑھتے؟ بولے مجھے کوئی ایک وجہ بتاؤ کہ ادب پڑھوں۔ میں نے ایک نہیں کئی وجوہ بتائیں۔

☆ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ بجا ارشاد۔ ادب تنقید حیات ہے۔

☆ ادب حقیقت/سماج کی عکاسی کرتا ہے۔ بجا ارشاد۔ حقیقت/سماج کی ترجمانی کرتا ہے۔

☆ ادب سماجی تبدیلی لاتا ہے۔ بجا ارشاد۔ ادب سماجی شعور/آگہی پیدا کرتا ہے۔

☆ ادب روحانی اخلاق ہے۔ بجا ارشاد۔ ادب تہذیب اخلاق ہے وغیرہ وغیرہ۔

میرے دوست نے ہر وجہ کا جواب دیا کہ یہ سب کچھ اخبار رسالے تاریخ نفسیات سماجیات و فلسفہ کی کتابوں سے حاصل ہو جاتا ہے جس دور میں ہم زندہ ہیں اس میں حقائق کے علم کی کوئی کمی نہیں۔ بلکہ فراوانی اور انفارمیشن ایکسپلوژن ہے ماس میڈیا ہر قسم کے علم...... سائنس ٹیکنالوجی نفسیات سماجیات وغیرہ ہی سے نئی اطلاعات اور تحقیقات کو انسان کی فہم و آگہی کے دائرے میں لے آیا ہے انسانی زندگی کے ہر گوشے اس کی نفسیات جنسی حرکات ذہنی ساخت شخصیت کے پیچ و خم شعوری تحت الشعوری اور لاشعوری سماجی عوامل فکر احساس اور عمل غرضیکہ سماج کے ہر پہلو کی آگاہی دوسرے علوم سے حاصل کی جا سکتی ہے تو پھر ہماری زندگی میں ادب کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟ ادب اگر زندگی کا آئینہ ہے تو پھر عکس ہی کیوں دیکھا جائے براہ راست مشاہدہ کیوں نہ کر لیا جائے اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس کے بارے میں دستاویز پڑھ لی جائیں۔ اصل نقل سے زیادہ بہتر ہے اور پھر جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ یہ تو نقل کی نقل ہے آخر نقل یا عکس میں کون سی انوکھی تخلیقیت ہے؟ ادب دوسرے درجے کی چیز ہے اور دوسرے درجے کی چیز پر کیوں وقت ضائع کیا جائے؟ اگر ادب زندگی کی ہو بہو عکاسی کرتا ہے تو پھر ادب اور زندگی میں فرق ہی کیا رہ گیا؟

میں نے کہا کہ صرف نقل نہیں بلکہ انتخاب ترتیب اور دوبارہ تشکیل ہے اس طرح حقیقت کی جو شکل بنتی ہے وہ فن پارہ ہے انہوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا پھر میں نے کہا کہ ادب سماج کے بارے میں نیا شعور عطا کرتا ہے اسے بدلنے میں مدد دیتا ہے بولے سماج کو ادب نہیں پیغمبر لیڈر مفکر انقلابی اور سیاستدان جیسے آمر اور جمہوری نظام والے جیسے سوشل ریفارمر بدلتے ہیں۔ سچ پوچھو تو جس سماجی شعور کی تم بات کرتے ہو وہ دوسرے لوگ پیدا کرتے ہیں۔ ادیب تو اس کو اپنی تحریروں میں پیش کرتا ہے کیا آپ وہ ادبی تحریریں بتا سکتے ہیں جنہوں نے وہ نیا سماجی شعور پیدا کیا ہو جو اس وقت اس عہد میں موجود نہ ہو۔ میں نے کہا چلو اور کچھ نہ سہی تفریح طبع کے لئے ہی ادب پڑھ لیں۔ یہ کہتے ہوئے مجھے خود یہ احساس ہوا کہ آخر ادب کی یہ حیثیت رہ گئی ہے۔ بولے اس کے لئے ادب سے زیادہ دلچسپ اور بہتر ذرائع موجود ہیں۔ میں نے کہا کہ ادب بہتر اور برتر قسم کی تفریح مہیا کرتا ہے یا ایسی تفریح ہے جو آرٹ کا مقام حاصل کر لیتی ہے اور میں نے سند کے لئے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا قول دہرایا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی شاعری تفریح نہیں تشویش پیدا کرتی ہے: Poetry is a super form of amusement اور میں نے مزید کہا کہ دراصل ادب نشاط و خوشی کا موجب بنتا ہے ادبی مطالعہ حسن مطلق کی تسکین کا ذریعہ ہے زندگی کو آرٹ کی طرح ہونا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ بولے یہ معاملہ کچھ پیچیدہ ہے موضوعی بھی ہے حسن کے بارے میں ہر آدمی کی اپنی پسند ہوتی ہے اور پھر جیسا کہ کہا گیا ہے کہ حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے مجھے بھی یہ جمالیاتی وکل فن برائے فن والا معاملہ نظر آتا ہے پھر بولے بہت عرصہ پہلے میں نے جارج آرویل کی "۱۹۸۴ء" اور فرانز کافکا کی "دی ٹرائل" پڑھی تھی آپ بتا سکتے ہیں کہ اس میں جمالیاتی حظ نشاط یا حسن والی کون سی بات ہے اور پھر جاتے جاتے بولے اچھا اگر کوئی اچھی کتاب ہو تو مجھے بھی بتائیں (وہ اچھی کتاب کون سی ہے جسے وہ پڑھنا پسند کریں اور جو ادب ہو؟) لے

میں یہاں اس مسئلہ پر بحث نہیں کروں گا کہ کیا موجودہ دور میں ادب

زندگی کے لئے ایک غیر متعلق مسئلہ ہے یا ادب پڑھنے کی کیسے فرصت اور ضرورت ہے؟ (اس موضوع پر میں ..... ربع صدی پہلے لکھ چکا ہوں۔ لذت پرست، جسم اور تفریح پسند کلچر۔ (ادب اور جدید ذہن ۱۹۶۸ء)۔ وہاں سے یہ بات کروں گا کہ قاری کی پسند کیسے بنتی ہے یا کیسے اس کی پرورش کی جا سکتی ہے؟ کیونکہ مختلف لوگ جب ادب پڑھتے ہیں تو ان کے محرکات الگ الگ ہو سکتے ہیں اور اکثر ہوتے ہیں۔ اور جو وجوہ اوپر بیان کی گئی ہیں ان میں سے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ وجوہ ہو سکتی ہیں۔ اس پر کوئی رائے دینا مناسب نہیں کیونکہ اس کے لئے بڑے پیمانے پر ریسرچ کی ضرورت ہے۔ دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ ادب اور غیر ادب میں کیسے فرق کیا جائے؟ معاملہ پھر گھوم پھر کے وہیں آ جاتا ہے کہ ادب کیا ہے؟

اب میرے سامنے ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ میں بتاؤں کہ میں ادب کیوں پڑھتا ہوں؟ زیادہ صحیح تو یہ ہوگا کہ یہ بتاؤں کہ میں اب (اور اب بھی) ادب کیوں پڑھتا ہوں؟ اب وہ مسئلہ نہیں اہم ہے کہ جب میں نے ادب پڑھنا شروع کیا تھا تو مختلف ادوار میں اس کے اسباب بھی وہی تھے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ ہڈسن کی کتاب An Introduction to the Study of Literature سے لے کر ژاں پال سارتر کی What is Literature? اور Stein Haugom Olsen کی The Structure of Literary Understanding تک پڑھنے کے بعد بھی یہ مسئلہ تسلی بخش طور پر حل نہیں ہو سکا کہ ادب کیا ہے؟ اور کوئی ادب کیوں پڑھتا ہے؟ بہت ممکن ہے کہ میرا مسئلہ ہر قاری کا مسئلہ ہو۔

کیا میں ادبی تخلیق کا مطالعہ حقیقت کا ادراک حاصل کرنے کے لئے کرتا ہوں؟ یا اس لئے کہ میرے علم میں اضافہ ہو؟ ادب اور دوسرا کا مجموعۂ واقعات کی تاریخ یا روداد حصول علم کا ذریعہ یا کسی دیگر چیز کا متبادل نہیں۔ بلکہ زندگی کی اصلیت اور فرد کی حقیقت کے سمجھنے کے لئے مثل احتراقی پیٹرن کی تشکیل ہے۔ اب میرے سامنے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کیونکہ ادب جس سچ کا انکشاف کرتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے عام طور پر ممکن نہیں۔ حقیقت اور اس کی فنی عکاسی کے بیچ ایک ناگزیر تناقض ہوتا ہے۔ فن کار کے لئے حقیقت کا احساس محض خارجی مظہر تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ بنیادی طور پر اس کی مستور ماہیت اور موجود کے بجائے امکان سے یعنی Super abundance سے متحرک ہوتا ہے کیا سچ کا جوہر نہیں کہ وہ ممکن سے ہی اپنے کو ظاہر کرے۔ اسی تضاد کو کیسے مٹایا جا سکتا ہے کہ پردہ ہی سچ کو عیاں کرتا ہے۔ حقیقت کو بھی سچ تک پہنچنے کے لئے تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ 'سچ' کو حقیقت کا تنگ لباس راس نہیں آتا۔ وہ تخیل اور کہانی میں ہی سچ جیسے ہونے کے ساتھ چل پھر سکتا ہے۔" (رابندرا ناتھ ٹیگور) گیان مارگ بھی انسان کے لئے کافی ثابت نہیں ہوا۔ لہٰذا کرم اور بھکتی مارگ بھی اپنایا گیا۔ ادب ان کے علاوہ لیکن ان سے مختلف اور الگ ایک اور مارگ ہے۔ روز مرہ کی زندگی اور فنا نوعی کردہ میں ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے جو اسے خارج سے فن کی عمل داری میں لے آتی ہے۔ جس کے باعث اس کی شخصیت، اس کا طرز زندگی اور حقوق شہریت، اخلاقی رویے، فکری پہلو، احساسات سب بدل جاتے ہیں۔ اصل میں سارا مسئلہ اس لئے پیدا ہوا ہے کہ ان دونوں کے خود مختار اور بیدار انکار آزادی عمل کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ نرمل ورما نے انا کیرینا کے بارے میں لکھا ہے "اگر کوئی عورت اپنے خاوند کو چھوڑ کر اپنے گھر بیوی کی مریادوں کو نشٹ کر کے کسی دوسرے مرد کے ساتھ بھاگ جاتی ہے تو ہمیں یہ عمل کتنا غیر اخلاقی اور ناقابل معافی جان پڑتا ہے لیکن انا کیرینا کی زندگی میں جھانک کر لگتا ہے۔ پیار کا تجربہ اتنا مکمل، اتنا اگزیر ہو سکتا ہے کہ وہ ان اخلاقی مریادوں کو چھوٹا اور کھوکھلا بنا دیتا ہے اور جب اسی پیار میں باؤلی ہو کر وہ ٹرین کے پہیوں کے نیچے اپنے کو کچل دیتی ہے تو پھر نئے سرے سے شک پیدا ہوتا ہے کیا پیار اچانک بے چارہ شک اپنے میں حیات سوز نہیں ہے؟ لیکن زندگی؟ پیار کے بغیر کتنی کھوکھلی، کتنی بے معنی ہے؟ کیا موت کا انتخاب ایسی خالی، بنجر زندگی سے بہتر نہیں ہے؟ کتاب پڑھنے کے بعد کوئی بھی ایسا جواب نہیں ہے جو آخری اور فیصلہ کن سچائی بن کر ہمارے ساتھ آ سکے لیکن کتاب کی دنیا میں داخل ہونے سے پہلے ہم جو پیار، اخلاقی مریادا، حیات اور موت کی قدریں اپنے ساتھ لائے تھے کیا صاف دل کی دنیا میں اچانک اپنے میں کچھ تھوڑا سا حقیر، کچھ اوچھا ہمارے جذباتی عادات اور اخلاقی بزدلی کی ایک ہی مثال نہیں جان پڑتے؟ خودکشی سے پہلے انا کیرینا جو کچھ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی ہے اپنی ذات کے شعور کی اسے گہری ذہنیت اور اس ذہنیت کی بے رحم روشنی میں ہمیں جو اپنی زندگی کا سچ ملا ہے وہ کیا ہم کسی فلسفے کی کتابوں، سماجیات کے اصولوں، نیتی شاستر کے رسالے میں بھی کہیں پا سکتے ہیں۔" (بھارت اور یورپ۔ پرتی شروتی کے کشیتر)

سعادت حسن منٹو جیسا بے باک اور بے رحم حقیقت پرست افسانہ نگار اخلاق اور صداقت کی اس روحانی کشمکش سے نہیں بچ سکا۔ منٹو اس لئے بڑا افسانہ نگار نہیں کہ وہ حقیقت نگار ہے بلکہ اس لئے کہ وہ انسان کی خارجی اور باطنی کشمکش میں صداقت کا متلاشی ہے جس کی سب سے عمدہ مثال 'بابو گوپی ناتھ' ہے۔ بابو گوپی ناتھ کسی خارجی اخلاق کا پابند نہیں جس سے قاری کا ذہن الجھتا ہے۔ بلکہ وہ اس باطنی سچائی کا متلاشی ہے جو ایک عام فرد کی اصلی شخصیت ہے۔ اب ایک مکالمہ ملاحظہ ہو۔

Cecily: Do you realy Miss Prism? How wonderfully clever you are! I hope it (novel) did not end happily. I don't like novels that end happily. That depressed me so much.

Miss P.: The good ended happily, and the bad unhappily. That is what fiction means.

(Oscar Wilde: The Point of Being Earnest)

آسکر وائلڈ اس خاص نکتے کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ فکشن برے اور اچھے میں روایتی اخلاق کا قائل مناسب نہیں سمجھتا جیسا کہ مس پرزم کا خیال ہے کیونکہ یہ نظریہ اس اصول پر مبنی ہے کہ انسان کی اخلاقی نشوونما کا ایک اہم ذریعہ فکشن ہے۔ حقیقت کو اخلاق پر جہت عطا کرتا ہے۔ درحقیقت ادب آدمی کی ہر شخص اور جذبات انسان کے بیچ جھولتا رہتا ہے اور وہ اس کے کسی پہلو کو بھی ناقابل التفات نہیں سمجھتا۔ تعقل آمیز کار

سوائی۔

"We are archetypal inwardly and phenomenal outwardly. Man is not called upon to deny any part of his nature, but to bring higher and lower, essence and nature into harmony".

انسان نہ مکمل طور پر فرشتہ سیرت ہوتا ہے اور نہ ہی مکمل طور پر شیطان خصلت۔

فلسفہ اور سماجیات میں انسان کے مخصوص تصورات ہوتے ہیں۔ لیکن ادب میں انسان کے ہزار چہرے ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے مختلف، کبھی الجھے ہوئے کبھی ہم آغوش ہوتے ہوئے۔ اس لئے کوئی ایک کردار مکمل، آفاقی یا آخری نہیں ہو سکتا۔ اس رُو سے ادب کی صداقت دوسرے علوم سے مختلف ہے۔ جب ادب نفسیات، سماجیات یا سائنس یا فلسفے کے ساتھ کسی مقابلے میں آتا ہے کہ کون دوسرے سے زیادہ حقیقت یا صداقت کو پیش کرتا ہے تو وہ اپنے ہونے کے جواز سے تنگ آ کر دوسرے وسیلوں کے ساتھ کبھی سیدھے کبھی بالواسطہ رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے مزاج کے خلاف ہے۔ جب کوئی نقاد اپنے بنے بنائے سانچے میں کسی تخلیق کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ دو حقیقت دوسرے علوم سے رشتہ جوڑنے کے باعث تخلیق کے سچ کو کھو دیتا ہے۔ بڑی تخلیق کسی چوکھٹ میں فٹ نہیں ہوتی بلکہ ہر چوکھٹے کو توڑ کر باہر نکل جاتی ہے۔ وہ ہر قسم کی تحلیلیت (Reductionism) کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے۔ نظریہ ساز اور سیاستدان اور آمر ادب کی صداقت کو برابر جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں اور سچ پر احتساب کے دروازے سے داخل ہو جاتا ہے۔ ہم صداقت کو برداشت نہ کر سکنے کے باعث مذہب، سیاست، نظریے اور [illegible] میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ ادب سے گریزاں میں جاتے ہیں اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس عمل کو الٹ دیں۔

ہم محض خارج کی آگہی کے لئے ادب میں داخل نہیں ہوتے۔ ادب خارج کی عکاسی تک محدود نہیں۔ اس لئے کسی تخلیق میں کوئی ایک سچ حتمی نہیں ہوتا۔ بلکہ سچ کے کئی امکانات ہوتے ہیں۔ ہر قاری اپنے انفرادی تجربے کو تخلیق میں شامل کر کے اسے مختلف معنی دیتا ہے۔ کسی تخلیق کا سچ اس کے مکمل بیان کی وسعت اور پیٹرن اور اس کے متن میں مضمر رہتا ہے۔ اس کے ختم ہونے پر جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ بتلایا گیا سچ نہیں ہوتا۔ ہر تخلیق کا خاتمہ ایک نئی شروعات ہوتی ہے۔ اس معنی میں کوئی متن آخری اور مکمل نہیں ہوتا۔ تخلیق اور قاری کے بیچ سچ بھولتا رہتا ہے۔ اس لئے سچ کی آگہی ایک مخصوص لمحے میں ہی ممکن ہے۔ اگلے لمحے میں سچ کی کوئی نئی جہت سامنے آ سکتی ہے۔ اگر حقیقت منظر لباس میں نظر آ بھی جائے تو کیا وہ کسی بھی حقیقت ہوگی جو ظاہر ہونے سے پہلے تھی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو ادیب کو ہر دور میں پریشان کرتے رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ کردار اور زندگی کے اصلی جوہر اور سچ کے انکشاف میں دلبر سچ کے طرز چہرہ کار اور آلہ جات کی ضرورت نہیں بلکہ مکمل بصیرت اور ہم احساسی کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب روزمرہ کی خارجی اور حواس سے محسوس ہونے والی حقیقت سے ہٹ کے ادیب حقیقت کا نیا روپ، نیا تصور اور نیا شعور پیش کرتا ہے تو وہ زندگی کی اصلیت کی تمثیل بن جاتا ہے۔ یہ تمثیل علم کے اکتسابی مطالعے یا براہ راست شعوری مشاہدے سے عمل میں نہیں آتی۔ ادب میں محض مماثلت ہی کافی نہیں ہم احساسی بھی ضروری ہے جو ادیب اور قاری کے مشترک داخلی تجربے کو وسعت اور نئی جہات دیتی ہے۔ ادب اس صداقت کو پیش کرتا ہے جو اس تخلیق میں سچ ہے جو اس تخلیق میں لاشعوری طور پر وجود میں آتی ہے۔ اس معنی میں تخلیق ہی سچ ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہمارے لئے ادب کا مطالعہ خارج کے علم کا نعم البدل نہیں ہے اور نہ کسی خواب و خیال کو مکمل کرنے یا کسی تحسین کی ضرورت کی تسکین یا دبی ہوئی خواہشات کے اخراج کا راستہ یا کتھارسس کا عمل ہے۔ کسی حد تک یا شاید یہ عمل ضرور ہے۔ لیکن کسی بھی صورت میں خارجی حالات سے فرار یا تحسین کی تحریک کا باعث نہیں۔ فرد کی تشنہ تخیل خواہشات ادب میں تسکین نہیں پاتیں بلکہ جو تو ذہن وہ قائم کرنا چاہتا ہے اس میں مزید تشنگی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اس لیے ممکن ہے کہ زندگی کے حالات کو برداشت نہ کرنے کے باعث جو احساس گناہ یا بے بسی پیدا ہوتی ہے اس سے نجات پانے کے لئے ادب کی ضرورت پڑے کیونکہ جب کوئی دوسرا عمل کامل نہیں ہوتا تو وہ ثانوی عمل کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ عظیم جنگوں، قومی بحرانوں اور کنفیوژن، [illegible]، مذہب، رنگ، نسل، فرقے اور قوم کے نام پر جو خون ریزی اور بربریت روا رکھی گئی ہے کیا وہ اس کا ثبوت نہیں کہ جو صداقت ہے وہ کبھی کبھی کتنی بھیانک، کتنی مکروہ اور بے رحم ہوتی ہے کہ ناقابل برداشت ہو سکتی ہے۔ آدمی اس کے سامنے کتنا بے بس ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لئے نطشے نے کہا تھا کہ ہم فن میں اس لئے جاتے ہیں کہ کہیں سچ ہمیں تباہ نہ کر دے۔

Man possesses art lest he should perish by truth

انسانی ذہن بہت زیادہ حقیقت برداشت نہیں کر سکتا۔

کیا ادب "سچ کی ناقابل برداشت آگہی سے ایک فرار ہے؟" اور اگر وہ فرار یا تحسین میں پناہ نہیں لیتا تو خاموش ہو جاتا ہے۔ اڈورنو نے کہا ہے کہ آشوٹز اذیت گاہ کے بعد جرمن زبان میں شاعری کرنا ممکن نہیں۔ لیکن ادیب خاموش نہیں رہ سکتا۔ ادیب کے لئے ہر گھڑی آزمائش کی گھڑی ہے۔ "وہ (ولیم بلیک) دیوانے کو اس وقت تک بیٹھنا رہا جب تک کہ سچ خود باہر آ کر اس کے سامنے نہیں آ گیا۔" جب کافکا نے اپنے دوستوں کے سامنے اپنا ناول "دی ٹرائل" پڑھ کر سنایا تو انہوں نے اسے ہنسی میں اڑا دیا۔ لیکن آمریت پرست سماج کی بربریت دیکھتے ہوئے آج کون نہیں کہہ سکتا ہے کہ کافکا کی تحریر پیش صداقت کا یا شعوری نہیں مستقبل کی پیش آگہی بھی تھی۔

روزمرہ کی زندگی دیکھتے دیکھتے ہم اس زندگی کے اتنے عادی ہو چکے ہوتے ہیں کہ ہمارے احساس اپنی قوت کھو دیتے ہیں۔ اس معنی میں ادب جانی پہچانی دنیا کی عکاسی یا زندگی کی تصویر کشی نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس وہ ہمیں روزمرہ کے معمول سے اس طرح غیر مانوس یا اجنبی Defamiliaries بنا دیتا ہے کہ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ دوسری دنیا ہے یا دنیا تو وہی ہے لیکن جسے ہم نے کبھی اس طرح نہیں دیکھا۔

اس طرح ادب احساس کی گم شدہ قوت کو بحال کرتا ہے اُس میں تازگی اور نیا جوش و خروش پیدا کرتا ہے۔ بے حسی کے اثر کو زائل کرتا ہے۔ حالات پہلے جیسے دکھائی نہیں دیتے اور نیا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نئے حالات، نئے تجربے سے روشناس ہو رہے ہیں۔ حالات وہی رہتے ہیں لیکن دیکھنے والی نظر بدل جاتی ہے۔ ادب کا آئینہ کتنا مختلف ہوتا ہے کہ اس میں جانے پہچانے چہرے کا عکس بدل جاتا ہے۔

"وقت کے پیٹرن میں ظلمت جہاں پہنچی تھی وہی ظلمت اُسی پیٹرن میں ایک جگہ اور موجود تھی۔ اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا اور اس فاصلہ پر انسان صرف آگے کی طرف چل سکتا ہے آگے اور آگے پیچھے جانا ممکن نہیں تھا کہ ہزاروں ظلمتیں ان گنت ٹکڑوں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود تھیں جیسے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں ایک ہی چہرے کے مختلف عکس نظر آتے ہیں۔"

"..... قرۃ العین حیدر..... "آگ کا دریا"

ادب اور حقیقی دنیا میں ایک فاصلہ اجنبی پن ہمیشہ سے رہا ہے جس ادب میں یہ فاصلہ مٹ جاتا ہے یہ اجنبی پن دور ہو جاتا ہے۔ ادب اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔ وہ بہ حیثیت ادب کے مشکوک ہو جاتا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ روزمرہ کی دوسری اشیا کی طرح "ٹھوس حقیقت" بن جاتا ہے۔

اب رہا سوال یہ کہ کیا ادب سماجی تبدیلی کا محرک بنتا ہے؟ یہ سوال "ادب برائے ادب" کے دائرۂ فکر سے باہر ہے۔ "ادب برائے زندگی" کے لئے کسی حد تک اہم ہے لیکن "ادب برائے انقلاب" کے پیروکار کہتے ہیں کہ ادب نہ صرف سماجی تبدیلی کو عمل میں لاتا ہے بلکہ سیاسی انقلاب کا محرک بھی ہے۔ یوں کہنے کو تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ میکسم گورکی اور پریم چند کی تحریروں نے سماجی تبدیلی لانے میں اہم رول ادا کیا لیکن اس سلسلے میں کوئی باقاعدہ ریسرچ نہیں ہوئی اور نہ ہی اس مفروضے کے پیچھے سماجی تبدیلی کے عمل کے اُصولوں کا اطلاق ہی ہوا ہے جس سے اس کی تصدیق ہو سکے۔ بغیر کسی سماجی ریسرچ کے اس مفروضے کو حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ (اس سوال پر "ادب اور سماجی تبدیلی کا عمل"..... مستقبل کے روبرو ۱۹۹۸ء میں تفصیلی بحث کی گئی ہے) دراصل ادب اپنے عہد کے پورے فکری لینڈ اسکیپ کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ (ضروری نہیں کہ وہ اہم حصہ ہو) کہ ادب کے علاوہ دوسرے علوم و فنون، سماجی عوامل، نشر و اشاعت اور سماجی مفکرین اور رہنماؤں سے علیحدہ کر کے ان کا مشکل ہے۔ پریم چند کے خیالات ان ہم عصر خیالات سے آگے یا الگ نہیں تھے جو اس دور کے سماجی رہنماؤں کے فکر و عمل کے ذریعہ عوام میں رائج تھے۔ پریم چند نئے خیالات کے موجد یا Innovator نہیں تھے بلکہ ان خیالات کے ادبی پیامبر تھے۔ صرف اس حد تک وہ سماجی تبدیلی یا شعور کے اجتماعی عمل کا حصہ تھے۔ جب میں پریم چند پر لکھی ہوئی تحریریں پڑھتا ہوں تو مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ پریم چند اس لئے بڑے ادیب ہیں کہ وہ ماہر سماجیات اور رہنما رہے ہیں۔ اگر ہم پریم چند کے سماجی عناصر کو لے کر یہ ان کے ادب کی عظمت ثابت کرنے کی کوشش کریں گے تو ہم اس صداقت تک نہیں پہنچ سکیں گے جس کے پریم چند متلاشی تھے۔ اور نہ ہی ان کی

قاریوں اور سامعین کو بھی جان سکیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ادب اور سماجی شعور کے معاملے میں ذات پرست اور فن برائے فن کے رجحانات کے خلاف سب سے زیادہ گہری اور فکری جنگ سماجیات کے میدان میں لڑی گئی ہے جبکہ ادب میں۔ ادب اگر تنقید حیات ہے تو اس میں کسی ایک نظریے کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔ اس میں انحراف و اعتراف، مفاہمت اور بغاوت دونوں طرح کے پہلو ہوں گے۔

جو لوگ ادب میں نظریے کی آمیزش اور ادبی اخلاق کی بات کرتے ہیں در حقیقت مذہبی مبلغین اور سیاست دانوں کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پرچارک ادیبوں کے علاوہ ایسے کئی تخلیق کار ہوئے ہیں جو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ادب ہمیشہ سیاسی ہوتا ہے لیکن ان میں تخلیق کی ایسی بے پناہ قوت ہوتی ہے کہ وہ ادب کو دستاویز کی ایک دائمی قدر بنا دیتے ہیں۔ برٹولٹ بریخت کا ایپک تھیٹر اس کی نمایاں مثال ہے۔ "ایپک تھیٹر کا مقصد یہ نہیں کہ وہ ناظرین میں شدید احساس پیدا کرے بلکہ فعال کرنے کے تنقیدی نقطہ نظر کو محرک کرتا ہے۔ ایپک تھیٹر میں انسانی فطرت اور افعال حیثیت سے متحرک نہیں ہوتے بلکہ سماجی حالات کے پروردہ ہوتے ہیں۔ تھیٹر کا مقصد یہ ہے کہ ناظرین ہال سے باہر جذباتی طور پر خالی ہو کر نہیں بلکہ ذہنی طور پر فعال ہو کر نکلیں تاکہ وہ سماجی تبدیلی میں فعال رول ادا کر سکیں۔ تھیٹر کا منصب وہ جذباتی فاصلہ پیدا کرنا ہے جسے بیگانگی یا (Alienation Effect) کا نام دیا گیا ہے۔

اب مسئلہ ذرا اُلجھ گیا ہے میں نے اوپر ادب میں ہم احساسی کی موجودگی کا ذکر کیا ہے اور اب بیگانگی کے تاثر پر زور دے رہا ہوں۔ حالانکہ ایک دوسرے حوالے سے Defamiliarise کرنے کی بات بھی کر چکا ہوں۔ دراصل ادب کی تخلیق اور تفہیم میں یہ کشمکش ہمیشہ سے جاری رہی ہے۔ ادب میں One Track تنقید کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ ادب پڑھنے کے کئی محرکات ہو سکتے ہیں۔ اور اس کو پرکھنے کے پیمانے بھی ہر تخلیق کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ ادب میں نظریہ مشکوک ہو جاتا ہے نظریہ اور فریب نظر..... میں اس پر مزید بحث کی گئی ہے کہ ادب میں نظریہ فریبی ہوتا ہے لیکن جب یہ حاوی ہو جاتا ہے تو سچ کے انکشاف کی اور اس کی خود مختار حیثیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ کئی ادیبوں نے اسپین کی خانہ جنگی میں انٹرنیشنل بریگیڈ میں شامل ہو کر موت کا انتخاب کیا۔ لیکن جو لوگ پیچھے بچے رہے ان میں سے کئی نے اپنی تخلیقی صلاحیت کو ایسے سیاسی مقاصد کا ذریعہ بنایا جو عارضی اور ہنگامی تھے (اور مشکوک بھی) اور جو بعد میں باطل ثابت ہوئے کہ جنگ ضرورت ایسے شدید جذبے کی تھی جو اس بھیانک دور کو اپنا داخلی تجربہ بنا کر اپنے ذاتی متحرک احساس کے دائرے میں سمیٹ لیتا۔

"ایک تقسیم شدہ نسل کے ادیب پہلے اپنے حالات کے باعث میں بے دار ہوئے اور اس کے بعد اپنی مشکل سے حاصل کی ہوئی بیش قیمت بیداری کو انہوں نے محض سیاسی عمل کی تلاش کا مسئلہ بنا کر اس کی قدر و قیمت کو ختم کر دیا۔ جب کہ اس وقت ضرورت ایک دوستوئیفسکی کی تھی جو اس وقت کی روحانی خون آشامی

میں ادب کو اپنی آواز دینا پا سکا۔ یا دا لنگر کی جو انقلابی نقطۂ نظر رکھتے ہوئے بھی دونوں
طرف کی بربادی کو فاصلے سے دیکھتے ہوئے بے بسی سے پکار سکا..... جیسا ایک بکھر دیا
کے لئے جدوجہد ضروری ہے لیکن اس جدوجہد کے اندر ایک دوسری ذہنی
جدوجہد بھی ناگزیر ہے اور یہ دوسری جدوجہد ان ہوس اقدار کی فکر کرنے والے افراد
اور ان دوسروں کے بیچ ہوتی ہے جو فوری سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے ہر ممکن
ذریعے کو استعمال کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ مقاصد
اپنے آپ میں اچھے ہیں۔ سماجی فرد کا تصور انسانی فرد کو ہی نگل جائے اس کی فکر بھی
ضروری ہے۔"

..... اسٹیفن اسپنڈر سے والڈ ون وانڈ

ادب کے اندر یہ "دوسری جدوجہد" تخلیقی ذہن کی جس سطح پر سرگرم عمل
ہوتی ہے وہ سائنس فلسفہ یا سماجیات کے ذریعے حاصل کئے ہوئے حقیقت کے تصور
سے کہیں زیادہ گہری سطح پر ہے اور زیادہ باطنی اور پیچیدہ ہے.... نظریہ اس
Internalization کے عمل کو روکتا ہے۔

"تخلیقی جذبہ اور ادب کبھی نظریے کی منصوبہ بندی میں جکڑ کر پیدا نہیں
ہوتے۔ وہ کسی فکر یا کسی استدلال یا کسی علم کی اساس پر تعمیر نہیں ہوتے۔
پر نظریہ جو باطنی اور مستقبل کو اپنی لپیٹ میں لائے حقیقت حال سے
فرار کی ایک صورت ہے اس لئے نظریاتی ادب ادب نہیں تخلیقی جذبہ کا اظہار نہیں۔
وہ ہزاروں آوازوں ہزاروں فضاؤں کو حذف کر دیتا ہے وہ ایک خیال کے ذریعے
حقیقت کو دیکھتا ہے اور اگر سچ سویرے جاگ کر اس کے خیال کی وحدت میں نہ
سمائے تو وہ اسے نظرانداز کر دیتا ہے کیا کسی نے کبھی پنچھی کے گیت نہیں گایا تھا
اور درختوں کے پتے کبھی ہوا میں نہیں لہرائے تھے اور کسی ستارہ آنکھوں والی نے کبھی
ادب کو کبھی گہر کے پیارے نہیں دیکھا تھا۔ یہ ایک خیال ہے جو ہماری بنیادی تنہائی
اور ظلمت کے خلا کو پُر کرتا ہے۔" (محمد جمیل)

سب دوسری چیزیں میڈیم ہیں لیکن ادب اور فن میڈیم نہیں۔ جب
ہم ادب کو میڈیم سمجھ کر پڑھتے یا لکھتے ہیں تو ہم انسانی فرد کے بجائے "سماجی فرد" کی
برتری ثابت کرتے ہیں۔ اور اس طرح سیاست، اشتہار اور سماجی انجینئرنگ کے
دائرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہم ادب کی دنیا کو ادب کے باہر کی دنیا میں مدغم کر
دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں اس خطرے سے بھی خبردار رہنے کی ضرورت ہے کہ ہم ادب کی
خودمختاری کے نام پر ادب کو محض بالذات ہی نہ سمجھنے لگیں۔ آخر ادب کا زندگی سے کوئی
رشتہ تو ہوگا ہی۔ وہ نہ تو خلا سے پیدا ہوا ہے اور نہ خلا میں پرورش پاتا ہے۔ اس لئے اگر ہم
ادب کی خودمختار حیثیت پر ہی زور دیتے ہیں تو زندگی سے اس کا رشتہ بے معنی ہو
جاتا ہے اور اگر ہم ادب کی اہمیت صرف اس کی افادیت یا مقصدیت میں ڈھونڈتے
ہیں تو ادب کی جداگانہ حیثیت کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ دونوں کے بیچ وہ کیا رشتہ ہے
جو زندگی کو ادب اور ادب کو زندگی کا فنی تجربہ بناتی ہے۔

"یہ فن دنیا کا وہ فن ہے جیسا کہ آنکھیں اسے دیکھتی ہیں۔ دل اسے
محسوس کرتا ہے۔ ذہن اسے جانتا ہے اور انسان اس کا خواب دیکھتا ہے۔"

..... ایرک سٹیفن فورڈ شو رولڈ

فورڈ کی آخری بات سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ خواب انسان کی
تخلیقی روح میں دبی قوتوں اور امکانات کے پیغمبر ہیں.... پیشن گوئی کے روپ میں ہی
نہیں بلکہ مستقبل کے روبرو ہونے کی صلاحیت کے لئے بھی۔ خواب اور اساطیر اور
ادب کے باہمی مشترک عمل میں لاشعوری محرکات اور کئی آئیڈیل کر جو صورت
اختیار کرتے ہیں وہ فرد کا اثاثہ ہی نہیں فرد کا سچ بھی بن جاتا ہے۔ ادب یادوں
کے جزیروں پر بستیوں کی سرحدوں پر کھڑا ہوتا ہے۔ کلوڈ لیوی اسٹراس نے آدی
واسیوں کی ایک رسم کے بارے میں لکھا ہے۔ "برادری کے کسی رکن کو کوئی جسمانی یا
ذہنی تکلیف ہونے پر ایک خاص فرد کو جو اوجھا اور فن کار ایک ساتھ ہوتا ہے بلوا بھیجا
جاتا ہے۔ یہ اوجھا مہمان بن کر ایک رات مریض کے گھر ٹھہرتا ہے جہاں اس رات وہ
جو خواب دیکھتا ہے اس کی بنا پر وہ مریض کی دیوار پر تصویر بناتا ہے" ادب اور قاری
کے درمیان کچھ اسی طرح کا رشتہ ہے جیسا کہ کسی آدی واسی کا اوجھا فن کار سے ہوتا
ہے۔"

ادب کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے سچ کو کیسے بیان
کرے؟ اور جب وہ اس سچ کو بیان کرتا ہے تو الفاظ میں اس سچ کا کتنا حصہ بیان ہونے
سے رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ ایمرسن نے ۱۸۳۶ء میں Nature میں کہی تھی وہ ادب
میں سچ کے بارے میں بھی سچ ہے۔ "جب ہم خدا کی تعریف یا اس کو بیان کرنے کی
کوشش کرتے ہیں تو زبان اور خیال دونوں ہمارا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور ہم اپنے
آپ کو لاچار پاتے ہیں۔" جب رومن پائلٹ نے یسوع مسیح سے کہا کہ تم اپنے آپ کو
سچ کا مسیحا کہتے ہو تو مجھے بتاؤ کہ سچ کیا ہے؟ تو یسوع مسیح چپ رہے۔ جو آخری لمحے تک
سچ کے لئے جدوجہد کرتے رہے جب اس کے بیان کا وقت آیا تو وہ خاموش رہ گئے۔
کیا ادب میں بھی جب سچ کا سامنا ہوتا ہے تو الفاظ اپنی گویائی کھو بیٹھتے ہیں۔ ہندی کے
نامور شاعر اگیے نے لکھا ہے:

"میں چاروں اور سے گھرا ہوں۔
ذہن سا۔
ذہن سا اپنے میں بند ہوں۔
شبد میں میری سمائی نہیں ہوتی۔
میں سناٹے کا چھند ہوں۔"

مجھے کیا معلوم تھا کہ قریب پچاس برس تک لکھنے پڑھنے کے عمل سے
گزرنے کے بعد جب اس سوال کا سامنا ہوگا تو سوچ کے ٹیڑھے میڑھے زمین دوز
راستوں سے گزرنا پڑے گا۔ اور جب "سچ" کو چھونے کی کوشش کروں گا تو وہ پھسل
کر حقیقت کی حدوں سے باہر سرک جائے گا۔ اس نقطے پر ٹھٹک کر رہ جانا ہوگا جہاں
سے سریت کی سرحد شروع ہوتی ہے اور جہاں سناٹا ہے۔ "شبد میں میری سمائی نہیں
ہوتی / میں سناٹے کا چھند ہوں۔"

نعت رسولؐ

صابرؔ عظیم آبادی

طیبہ میں مجھے روضۂ اطہر نظر آیا
کیا تجھ کو کہوں کیسا وہ منظر نظر آیا

تاریک جزیرے میں جو ابھرا تھا کوئی نور
وہ نور مجھے مہرِ منور نظر آیا

دنیا میں حضورؐ آئے تو پھر ان کے قدم سے
ہر ذرّے کا تابندہ مقدر نظر آیا

قانونِ شریعت جو بتایا تھا نبیؐ نے
وہ عالمِ اسلام کو بہتر نظر آیا

اللہ رے اس حسنِ مجسم کا سراپا
اس عالمِ اسباب میں ہٹ کر نظر آیا

منزل پہ جو پہنچا کے گیا سارے جہاں کو
ایسا نہ کہیں مجھ کو وہ راہبر نظر آیا

ہے کتنی غلاموں پہ تری چشمِ عنایت
لوٹا جو ترے در سے تو نگر نظر آیا

وہ ملکِ عرب ہو کہ کوئی شہرِ عجم کا
منظر تیری تعلیم کا گھر گھر نظر آیا

کہتے ہیں جسے صاحبِ لولاک وہ صابرؔ
ہر دور میں اخلاق کا پیکر نظر آیا

نعتِ رسولؐ

صدیق شاہد

اُلفتِ غیرِ نبیؐ دل سے نکل جائے کہیں
فکر و احساس کا انداز بدل جائے کہیں

وضعِ تحسین و ثنا ہو مری شایانِ نبیؐ
میرا ہر لفظ دُرِ شوق میں ڈھل جائے کہیں

جس گھڑی ذکر نہ اس قبلۂ عالم کا کروں
وہ گھڑی عمرِ گریزاں ہی سے ٹل جائے کہیں!

طبعِ نادم کہ معاصی سے ہے غلطاں پیچاںؔ
آپ کی چشمِ عنایات سے سنبھل جائے کہیں

سخت دل تنگ ہوں تحرّاص جہاں کے ہاتھوں
مدداے سرورِ دیںؐ حول اُل جائے کہیں!

خوف ہے روزِ جزا کا تو بس اتنا شاہدؔ
دستِ شہؐ میں نہ مری فردِ عمل جائے کہیں!

محسن احسان

ملالِ روز و شب پہنا ہوا ہے
یہ پہناوا تو سب پہنا ہوا ہے

خدا ہنس ہنس کے سب کو دیکھتا ہے
خدائی نے غضب پہنا ہوا ہے

بزرگوں سے جو ورثے میں ملا تھا
وہی نام و نسب پہنا ہوا ہے

کبھی جن دھجیوں پر خندہ زن تھے
وہی ملبوس اب پہنا ہوا ہے

اگرچہ بے خبر تعبیر سے ہیں
مگر خوابِ طرب پہنا ہوا ہے

عمل پیرا نہیں احکام پر ہم
دکھاوے کو تو رب پہنا ہوا ہے

ہمارے شہر میں یاروں نے محسن
عجم اوڑھا عرب پہنا ہوا ہے

مشکور حسین یاد

پھولوں میں جس قدر بھی ہیں خوشبو کے پیچ و خم
رنگوں میں آ گئے ہیں تری خُو کے پیچ و خم

اچھا ہوا انہیں ترے آنچل نے لے لیا
دریا کہاں سنبھالتا آنسو کے پیچ و خم

طرزِ خرامِ یار سے پوچھیں تو وہ بتائے
کیا پیچ و خم کے جادو ہیں جادو کے پیچ و خم

درکار عدل ہے تو رہے وزن کا خیال
ہیں سارے وزن ہی میں ترازو کے پیچ و خم

آخر کو مُشک نافہ ہی آئی بروئے کار
نکلے نہ شاخِ آہو سے آہو کے پیچ و خم

آواز میں زمان و مکاں کا ٹھکانہ ہے
اک ہُو میں آ گئے ہیں ہر اک سُو کے پیچ و خم

دیکھو کوئی بھی غیر نہیں بزمِ ناز میں
سب پیچ و خم ہیں یادؔ من و تُو کے پیچ و خم

شبنم شکیل

مجلس بپا ہو، ماتم فریاد ہو گا آج
نوحہ کناں مرا دل ناشاد ہو گا آج

برباد ہی رہے گا کہ آباد ہو گا دل
کچھ اس کا فیصلہ بھی مرے بعد ہو گا آج

پہچانتی ہوں دشمنِ جاں کو میں اپنے خوب
مقتل میں بھی وہی ستم ایجاد ہو گا آج

ایسی اندھیری شب میں تو جنگل میں ہو پڑاؤ
ان بستیوں میں پھر کوئی صیاد ہو گا آج

منصف پہ اعتماد بھلا کس طرح سے ہو
پہلے سے علم ہے کہ جو ارشاد ہو گا آج

دل کے دیے کی تیز ہوئی ہے بھڑک کے لو
یہ خوفِ ابر و باد سے آزاد ہو گا آج

پی ایس جین جوہر

خزاں کی آمد کے ڈر کے مارے لٹی بہاروں کو ڈھونڈتا ہوں
شباب کی منزلوں سے بھٹکا، جواں سہاروں کو ڈھونڈتا ہوں

حسیں مناظر، جواں مسافر، نہ فکرِ منزل، نہ ذکر ساحل!!!
فنا کے سیلاب نے جو گھیرا، تو شاخساروں کو ڈھونڈتا ہوں

حیات کے سنگِ میل گن گن کے جھومتا تھا، مگر اب بجز
اب یونہی مثلِ طفلِ ناداں، میں سنگ پاروں کو ڈھونڈتا ہوں

تلاش کرتا ہوں دوسروں کی خوشی میں تکمیل حسرتوں کی!
میں اپنی خوں گشتہ آرزوؤں کے لالہ زاروں کو ڈھونڈتا ہوں

اُنہیں کے حق میں چھٹے ہوئے ہیں، حریمِ دیر و حرم کے مچلکے
خدا کے بندوں سے باز آیا، خدا کے ماروں کو ڈھونڈتا ہوں

نہ مندروں کو، نہ مسجدوں کو، نہ خانقاہوں نہ بتکدوں کو
غمِ معاش و تلاش جن سے بری اداروں کو ڈھونڈتا ہوں

نگاہوں کے شمع دان لے کر، لٹانے کو نقدِ جان لے کر
ستم ظریفوں کے قافلے میں وفا شعاروں کو ڈھونڈتا ہوں

سنا تھا جن پر یہ یادگارِ غمِ شہیداں لگیں گے میلے!!
میں راہ چلتے پہ بجے مزاروں میں اُن مزاروں کو ڈھونڈتا ہوں

میں چپ رہا جب کہ غاصبوں نے ہزاروں لوگوں پہ ظلم ڈھائے
گناہ میں خود شریک رہ کر گناہ گاروں کو ڈھونڈتا ہوں

خدائے برتر تری زمیں پر، قتل و غارت، یہ خون خنجر!!
جہاں میں انسان کی حفاظت کے ذمہ داروں کو ڈھونڈتا ہوں

جاوید شاہین

نکل کے خواب سے دیکھا جو خواب سے آگے
وہی زمیں وہی گھر تھے خراب سے آگے

کوئی ستارہ تھا حیران کرنے والا تھا
چمک رہا تھا بہت ماہتاب سے آگے

وہ روز و شب وہ مہ و سال آشنائی کے
ابھی وہ آنے ہیں میرے حساب سے آگے

کھلے پڑے تھے ورق لفظ دیکھتے تھے مجھے
مَیں پڑھ رہا تھا کہیں کچھ کتاب سے آگے

وہ اک کہانی مری گمشدہ محبت کی
لکھی گئی نہ کبھی ایک باب سے آگے

وہ مجھ سے خوش نہ تھا اپنی کسی ستائش پر
مَیں اور کہتا اُسے کیا گلاب سے آگے

ابھر کے مٹ گیا مَیں بحرِ زندگی میں کہیں
مری بساط ہی کیا تھی حباب سے آگے

وہ اور پوچھتا کیا حالِ دل ترا شاہیں
کہ دل گرفتہ تھا تیرے جواب سے آگے

سرور انبالوی

جب حصارِ ذات سے باہر نکل آتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے پتھر کے ہو جاتے ہیں لوگ

خواہشیں لے کر عدم سے دہر میں آتے ہیں لوگ
تشنۂ تکمیل اُنہیں لے کر چلے جاتے ہیں لوگ

گھر سے خالی ہاتھ میلہ میں چلے جاتے تو ہیں
جانے اپنے من کو پھر کس طرح بہلاتے ہیں لوگ

عُمر بھر سایوں کا پیچھا کرتے کرتے ایک دن
خود طلوعِ حشر سے آگے نکل جاتے ہیں لوگ

اُونچے ایوانوں میں نفرت کے جو ہو جاتے ہیں بند
ایک دن دم گھُٹ کے آخر خود ہی مر جاتے ہیں لوگ

جانے والے لوٹ کر واپس کبھی آتے نہیں
کچھ پتہ چلتا نہیں ہے کس نگر جاتے ہیں لوگ

مصلحت سے حرفِ حق بھی اب لبوں سے چھن گیا
دن کو دن کہتے ہوئے بھی اب تو گھبراتے ہیں لوگ

آدمی کو روند کر آگے نکل جاتا ہے وقت
اور سرور انبالوی آنکھیں بدل جاتے ہیں لوگ

اکبر حمیدی

ترے ماتھے کا تارا ہو گیا ہوں
زمانے بھر سے نیارا ہو گیا ہوں

ہواں ہوں تجھ سے وابستہ کچھ ایسا
کہ تیرا استعارہ ہو گیا ہوں

کئی ساحل ہیں میرے دامنوں میں
سمندر کا کنارا ہو گیا ہوں

بہت ہی بے سہارا ہو چلا تھا
سو اوروں کا سہارا ہو گیا ہوں

تری آنکھوں میں ہی رہنا ہے لیکن
نہیں آنسو تھا، ستارا ہو گیا ہوں

محبت میں یہاں تک تو ہوا ہے
کہ شعلہ تھا، شرارا ہو گیا ہوں

جو محفل سے اٹھا دیتے تھے اکبر
انہیں بھی اب گوارا ہو گیا ہوں

شاہد واسطی

بچنے کی اس لئے ہر اک تدبیر میں نے کی
بخشے گا کون گر کوئی تقصیر میں نے کی؟

ہر شخص میری ذات کا ہمدرد ہو گیا
اپنے دُکھوں کی جان کے تشہیر میں نے کی

روشن تو یوں ہوا کہ جگنو بدن تھا وہ
مٹھی میں میری آئے یہ تدبیر میں نے کی

چاہت کا میری اس نے یقیں ہی نہیں کیا
اس کو ہر ایک بات تو تحریر میں نے کی

کوئی بھی نقش بن نہ سکا مجھ سے کُسی کا
ہر اک طرح سے آپ کی تصویر میں نے کی

میری بھی کٹ گئی ہے انہی الجھنوں کے بیچ
تخریب میں نے کی کبھی تعمیر میں نے کی

بس اک خیالِ خام میں الجھا رہا سدا
پوروں سے اپنے ہاتھوں کی زنجیر میں نے کی

شاہدؔ بہت لگاؤ مجھے حرف و فن سے تھا
اڑتے ہوئے خیال کی تعمیر میں نے کی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

یہ گل یہ برگ یہ شبنم ترے حوالے سے
مرے خیال کے موسم ترے حوالے سے

مری وفاؤں کے کہسار پہ ہیں رقص کناں
تری جفاؤں کے پرچم ترے حوالے سے

ہر ایک لفظ ہے جادو ہر ایک بات فسوں
ہر ایک شعر میں سرگم ترے حوالے سے

تمام رات اندھیرے اجالتے گزری!
بجھے چراغ، جلے ہم ترے حوالے سے

تری تلاش میں آئینۂ شہرِ سنگ میں ہے
نہیں ہے ہوش کا عالم ترے حوالے سے

بجھے چراغ تو محفل میں روشنی کے لئے
تمام رات جلے ہم ترے حوالے سے

ترے بغیر بھی مجھ پر ترے زمانے کی!
عنایتیں رہیں کم کم ترے حوالے سے

پلک پلک پہ چراغاں تھی زندگی عاشق
گذاری ہم نے شبِ غم ترے حوالے سے

ڈاکٹر عبد الرحمان عبدؔ

عرش کی چیز ہوں گو فرش پہ رہگیر ہوں میں
آسماں جس کا مصور ہے وہ تصویر ہوں میں

بے خبر عام کہ اِک خواب ہے جینا میرا
میں یہ کہتا ہوں کہ اِک خواب کی تعبیر ہوں میں

ناز کی میری مری ذات کی غماز نہیں
جو جگر کاٹ دے ہیرے کا وہ شمشیر ہوں میں

میرے ہونے سے ہے آہنگِ نظامِ فطرت
عالمِ ہست میں تقدیر ہوں تدبیر ہوں میں

عبد اقبال نے کیا خوب کہا ہے حق سے
عشق کا تو ہے صحیفہ تری تفسیر ہوں میں

کرشن کمار طور

مکالمہ جو کیا تو خدا سے عین ہوئے
ہمارے سر بھی یہاں کربلا سے عین ہوئے

تھے وحشی جتنے بھی زنجیر سے نکل آئے
پرندے اور بھی اپنی ہوا سے عین ہوئے

ہمارے خون کی قیمت ہوئی کچھ اور ارزاں
تمہارے ہاتھ جو رنگ حنا سے عین ہوئے

مرے خدا کی نوازش فقط مجھی پہ نہیں
جو رقعے اترے ہیں غار حرا سے عین ہوئے

نہ کوئی رونق حسرت نہ کوئی دست سوال
تھے کیسے لوگ جو تیری رضا سے عین ہوئے

مرے ہوئے ہیں مگر بے شمار زندوں میں
یہاں جو دل کہ غم کربلا سے عین ہوئے

لہو چراغ سے روشن تھی طورِ منزل عشق
اگرچہ راستے گرد انا سے عین ہوئے

غلام مرتضیٰ راہی

(ایک غزل نسلِ نو کے لئے)

جب مصوّر ہو تم اپنے تو ہمہ گیر بنو
جس میں ہر رنگ اجاگر ہو وہ تصویر بنو

لوحِ ہستی پہ تمہیں یوں ہی نہیں ہونا رقم
جس کے کچھ خاص معانی ہوں وہ تحریر بنو

رکھو فولاد کی مانند لچک فطرت میں
جس کے جوہر کھلیں میداں میں وہ شمشیر بنو

رُعب طاقت کا، نہ دولت کا، نہ منصب کا پڑے
میرا مطلب ہے کہ ناقابلِ تسخیر بنو

تم کو جس خاک سے تخلیق کیا قدرت نے
وصف اُس خاک میں یہ ہے کہ تم اکسیر بنو

خواب دُنیا نے خوش آئند بہت دیکھ لیے
بس کہ تم موجبِ شرمندۂ تعبیر بنو

کیوں نہ کڑیوں کی طرح مل کے رہو آپس میں
ٹوٹنا جس کا ہو دشوار وہ زنجیر بنو

ساقیِ وقت سے ملتی نہیں چھلکانے کو
مئے تدبیر سے آسودۂ تقدیر بنو

تم کو شاعر ہی جو بننا ہے تو پھر راہیؔ کیوں
کوئی غالبؔ کوئی اقبالؔ کوئی میرؔ بنو

انوار فیروز

کہہ گئی دل کی داستاں آنکھیں
لاکھ تھیں یوں تو بے زباں آنکھیں

ہم چھپاتے رہے محبت کو
کر گئیں رازِ دل عیاں آنکھیں

کچھ پھوٹی ہیں پھول بن بن کر
کچھ زمیں میں ہوئیں نہاں آنکھیں

جب سے اپنا بنا لیا تم کو
ہو گئیں دل سے بدگماں آنکھیں

کہہ دیا ہے وہیں رہیں دل کو
پائیں ہم نے جہاں جہاں آنکھیں

آج ان پر بھی اعتماد نہیں
تھیں کبھی اپنی ہم زباں آنکھیں

ڈھونڈتی ہے جنھیں نظر انوارؔ
کھو گئیں جانے وہ کہاں آنکھیں

رند ساغری

کواڑوں میں جواب تک جذب تھیں وہ دستکیں سن تے
جو شب بھر جاگتے رہتے تو ہم بھی آہٹیں سن تے

سروں پر دھول اوڑھے خواہشیں آوارہ پھرتی ہیں
تھکن محسوس کرتے یا تھکن کی دھڑکنیں سن تے

مکمل خامشی، سنسان راتیں، اونگھتی گلیاں
پریشاں جگنوؤں کی خوشبوؤں سے چشمکیں سن تے

سلگتی قربتیں، بے ربط سی مانوس سرگوشی
تو ہم اُن حرکتوں کو دیکھتے یا حرکتیں سن تے

اگر خاموشیوں کے دائرے محفل سجا لیتے
تو ہم بھی چھت پہ چڑھ کر جھینگروں کی پائلیں سن تے

جو طوفاں تیز ہو جاتا تو پانی پر سفر کرتے
سفینے سے سمندر کی پرانی رنجشیں سن تے

فضا میں نیم خوابیدہ صدائیں گشت کرتی ہیں
کہاں تک ضبط کرتے ہم کہاں تک منتیں سن تے

مرے سجدوں کی برکت میری پیشانی پہ لکھی ہے
خدا کی ''کھوکھلے لوگوں'' سے کیوں پھر عظمتیں سن تے

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ

ہستی کی گزرگاہ پر خاموش کھڑا ہوں
کرموں کا اپنے ردِ عمل بھوگ رہا ہوں

ہوتا نہیں ہے کسی کے بھی پاؤں میں چکر
محوِ سفر ہوں، راہِ سفر ڈھونڈ رہا ہوں

تجھ سے نہیں ہے شکوہ، نا زمانے سے گلہ ہے
حالات کی ابدوست میں سُولی پہ چڑھا ہوں

نکلا ہوا ہوں قرنوں کا، اب تک نہیں لوٹا
دربدری میں ہوں، گھر کا پتا پوچھ رہا ہوں

بزمِ دہر سے جو بھی ملا، اِکتفا کیا
دیارِ غیر میں ہوں، وفا ڈھونڈ رہا ہوں

تیز و تند وقت کی آندھی میں کہاں اماں
جاؤں تو جاؤں کدھر، تذبذب میں پڑا ہوں

آؤ تشنہؔ! تلاش کریں، بستیاں نئی
مقتلِ انسانیت سے اب گھبرا گیا ہوں

قیصر نجفی

ہم چلے جس پر وہ رستہ اور تھا
راہرو کب کوئی ہم سا اور تھا

کر رہے ہو کس تماشے کا یہ ذکر
ہم نے جو دیکھا تماشا اور تھا

ایک سے اک شہر میں تھا خوبرو
لیکن اس کا ناک نقشہ اور تھا

تھے نشے میں ہم بھی اوروں کی طرح
ہم نہیں بہکے کہ نشہ اور تھا

کس کا سوچا ہو رہا ہے رات دن
کون ہے وہ جس نے سوچا اور تھا

ہر طرف وہ ایک تھا جلوہ نما
رنگ ہر جا لیکن اس کا اور تھا

اور ہی تعبیر ہے کچھ سامنے
خواب قیصرؔ ہم نے دیکھا اور تھا

غالب عرفان

خود اپنی خاک در در چھانتا ہوں
پھر اپنے آپ کو پہچانتا ہوں

کبھی ہوں پاؤں ننگے تو کبھی سر
بدن پر جب بھی چادر تانتا ہوں

بہت پچھتا رہا ہوں اُس سے مل کر
جسے میں غائبانہ مانتا ہوں

مبارک ہو اُسے پتوار اس کی
سمندر کا سفر میں جانتا ہوں

وہ مجھ سے مجتنب ہے تو گلہ کیا
میں خود اُس کو کہاں گردانتا ہوں

عدو کی بھیڑ میں عرفان بھی ہے
جسے میں جانتا پہچانتا ہوں

ملک زادہ جاوید

دیر تک جاگ کر وہ سوتی ہے
کیمرے کی بھی آنکھ ہوتی ہے

اُس کی خواہش کا دائرہ محدود
وہ تو گملے میں خواب بوتی ہے

سوچ کر روز میں اترتا ہوں
تہہ میں ساگر کے آج موتی ہے

ان مکانوں کے پچھلے جنگل میں
میری بچی کہیں پہ روتی ہے

میری ہجرت بہت زمانے سے
اپنے کنبے کا بوجھ ڈھوتی ہے

ڈاکٹر سیفی سرونجی

آنکھوں میں کسی خواب کے منظر سے اُٹھے گا
طوفان یقیناً کوئی اندر سے اٹھے گا

آغوش میں غفلت کی جو مدت سے پڑ رہے
وہ شخص یقیناً کسی ٹھوکر سے اُٹھے گا

منہ پھیر کے جاتا ہے ابھی بھائی سے بھائی
اخلاق ابھی اور زمیں پر سے اُٹھے گا

منزل نہ ملے گی اُسے ڈھونڈے سے کہیں بھی
سورج کے نکلنے پہ جو بستر سے اُٹھے گا

ہر موڑ پہ اس نے مجھے شہرت سے نوازا
پھر میرا یقیں کیسے خدا پر سے اُٹھے گا

سیفی نہ اُڑو اتنی بلندی پہ خدارا
جو نام اٹھے گا وہ مقدر سے اٹھے گا

خیال آفاقی

آ صبر کی منزل میں بنا دل کو رضاکار
اس راہ میں انسان نہ مجبور نہ مختار

کیوں موجِ حوادث سے ہوا جاتا ہے بیزار
طوفان بلاخیز کا ساحل ہے نمک خوار

قدرت کے اشاروں کو سمجھتا ہے جو دانا
ناداں سے کسی بات میں کرتا نہیں تکرار

محروم خرد دہر گزیدہ پہ ہے حیرت
دنیا کا یقیں، خالقِ دنیا سے ہے انکار

کس بات نے روکا ہے تجھے کلمۂ حق سے
کس چیز نے بخشی ہے تجھے جرأت انکار

فطرت کے اصولوں کو نہ سمجھے جو عقیدہ
دستور جہاں ساز، نہ آئینِ جہاں دار

جو معنیٔ انعمت علیہم سے ہیں واقف
وہ لوگ نہ بے زر ہیں، نہ بے زور، نہ بیزار

پہلے سے وہی لوگ بناتے ہیں سفینے
طوفان کی آمد سے جو رہتے ہیں خبردار

رہنے دے خیال اپنی خبر لے تو کہاں ہے
اوروں کا پتا پوچھتا پھرتا ہے سمجھدار

سید اصغر مہدی

ہم بھی دیکھیں گے دعاؤں میں اثر ہونے تک
سانس باقی رہے بس ان کو خبر ہونے تک

بیج تو بو دیا اللہ توکل دیکھیں
کتنے درپیش حوادث ہیں شجر ہونے تک

دیکھنا پڑتے ہیں سو طرح کے دشت و صحرا
چشمۂ کوہ کو بالآخر بحر ہونے تک

کچھ تعجب نہیں اک بات بتنگڑ بن جائے
بات رہتی ہے صحافی کو خبر ہونے تک

ہوا منکر تو عزازیل سے ابلیس بنا
حادثہ یہ ہوا آدم کو بشر ہونے تک

سب کے سب سر پہ کفن باندھ کے نکلے گھر سے
کتنے سر تن سے گرے کوہ کے سر ہونے تک

بدلے جاتے ہیں مکانوں کو اس اُمید کے ساتھ
کوئی بھی لحہ تو آ جائے گا گھر ہونے تک

موت ہے زیست سے کچھ زیادہ ہی شیریں اصغرؔ
موت کا خوف ہے بس خوف کے سر ہونے تک

ماجد سرحدیؔ

لٹ جائے گھر بلا سے تحفظ مگر نہ مانگ
ناموس کے لئے کوئی دیوار و در نہ مانگ

ڈوبا ہوا ہے نغمہ مسند میں میر شہر
انصاف ایسے دور میں اے بے خبر نہ مانگ

شامل میرا لہو بھی ہر اک شاخ گل میں ہے
پر حکم باغباں ہے کہ کوئی ثمر نہ مانگ

خطرے میں جاں پڑی ہے عزیزان مصر کی
اب اپنے بھائیوں سے بھی اذن سفر نہ مانگ

تاریکیوں میں ڈوبے ہیں یہ واعظان وقت
بہتر یہی ہے ان سے ضیائے سحر نہ مانگ

عزت سے بڑھ کے کچھ نہیں راہ حیات میں
غیروں کے سامنے جو ہو خم ایسا سر نہ مانگ

ماجدؔ تیرا قلم کہیں بے آبرو نہ ہو
اس شہر بے ہنر میں متاع ہنر نہ مانگ

صدیق فنکار

(غزل جس کے بعد تازہ ہوا کے آنے پر)

دل میں راحت سی لا رہی ہے ہوا
کیا سہانی سی آ رہی ہے ہوا

بج رہے ہیں شجر کے یوں پتے
جیسے تالی بجا رہی ہے ہوا

رنگ برنگے پتنگ اور آنچل
دیکھو دیکھو اُڑا رہی ہے ہوا

بعد مدت کے موج میں آئی
سرد جھونکے لٹا رہی ہے ہوا

دور تک لہلہا اٹھا سبزا
کیسے منظر بنا رہی ہے ہوا

یہ شمالی علاقوں سے اُتری
دل کو میرے لبھا رہی ہے ہوا

سرحدوں میں نہیں مقید یہ
جس طرف چاہے جا رہی ہے ہوا

چال چلتی چلے عجب فنکارؔ
سُر سریلے سُنا رہی ہے ہوا

سہیلؔ غازی پوری

کتاب ہجر پہ پھیلے ہوئے جالے سے
نہ جانے کب سے زباں پر لگے ہیں تالے سے

بہت دنوں سے چُبھا ہے جو پاؤں میں کانٹا
نکل سکا نہ ابھی تک مرے جیالے سے

فریب اتنے دیئے ہیں ہمارے اپنوں نے
کہ دل سنبھلتا نہیں دوستو سنبھالے سے

عجیب موسم بے کیف ہے کہ گلشن میں!!
زمین سُرخ ہوئی جا رہی ہے چھالے سے

دل و دماغ میں بھر دے جو زہر نفرت کا
شکم کی آگ بجھاؤ نہ اُس نوالے سے

تعلقات پہ وہ ضرب دے کے کہتا ہے
کوئی بھی بات نہ کرنا مرے حوالے سے

میں اس نتیجے پہ پہنچا ہوں اے شبِ ہجراں
تجھے بھی ضد ہے یقیناً مرے اُجالے سے

یہ کہہ کے اُس نے فضا میں اُسے اُچھال دیا
میں اب کبھی نہ پیوں گا ترے پیالے سے

سہیلؔ آپ بھی مل کر تو دیکھئے صاحب
ہمارے یار سے احساں جتانے والے سے

حصیر نوری

صرف اثبات و نفی کے لئے دنیا کیوں ہے
دل کی وادی میں یہ تحریک تمنا کیوں ہے

اس کو کچھ فیصلے کرنے ہی پڑیں گے اک دن
وہ بہرحال ہے مختار تو ڈرنا کیوں ہے

چند لمحے ہی نکل پائے ابھی فرصت کے
درد اوروں کا مرے دل میں یہ رہتا کیوں ہے

رات نے خواب دکھائے ہیں مری آنکھوں کو
اصل جب ہے ہی نہیں ہے تو یہ سایہ کیوں ہے

جس پہ بیتی ہی نہیں وہ بھلا کیسے کہے
اس کو روداد سنانے کی تمنا کیوں ہے

قیدیٔ ذات ہیں جب لوگ تو میں کیا پوچھوں
ہر کوئی شہرِ تمنا میں اکیلا کیوں ہے

کیا زمیں اب کوئی گلشن نہ کرے گی آباد
دُور تک پھیلا ہوا ریت کا صحرا کیوں ہے

شعلہ شعلہ سا ہے کیوں عالمِ احساس حصیر
اپنی ہی تو تپشِ ذات سے جلتا کیوں ہے

کرامت بخاری

ہاتھ میں کاسہ رہ جاتا ہے
خواب ذرا سا رہ جاتا ہے

آ کے موج گزر جاتی ہے
ساحل پیاسا رہ جاتا ہے

جب رسوائی ہو جاتی ہے
کون شناسا رہ جاتا ہے

لُٹ جاتی ہے دولتِ دُنیا
علم اثاثہ رہ جاتا ہے

ہجر کا درد دلوں میں اکثر
اچھا خاصا رہ جاتا ہے۔

بربادی کے بعد ہمیشہ
ایک دلاسہ رہ جاتا ہے۔

خاور خان سرحدی (علی گڑھ بھارت)

غزلوں کے بام پر ہے تری جستجو کا چاند
روشن بہت ہے پلکوں پر رکی آرزو کا چاند

وعدہ کسی کا ٹوٹ کے بکھرا کہاں کہاں
برسا رہا ہے روشنی اک آب جُو کا چاند

مولا بلندیاں میرے بچے کو بخش دے
دن بھر تپا ہے دھوپ میں میرے لہو کا چاند

درپن میں دوستی کے اب چہرہ سنوار یئے
پوشاکِ پیار کی پہنے نکلا عدو کا چاند

الفاظ یوں مہکتے ہیں کاغذ کی گود میں
خط میں لکھا ہے اس نے مجھے آرزو کا چاند

اس نے مری غزل کو ترنم سے پڑھ دیا
روشن ہے اس کے لب پہ مری گفتگو کا چاند

اک دوسرے کو دیکھ کے ہم مسکرا دیئے
اب اپنا ہو گیا ہے وہ جام و سبو کا چاند

پروفیسر زُبیر گنجاہی

ہر چیز رنگ بدلے ہے کیوں موسموں کے ساتھ
ہے حاسدوں کے ساتھ کوئی ظالموں کے ساتھ

جزوِ بدن ہوئی ہیں زمینوں کی لرزشیں
اَب ہم قدم ملا کے چلیں زلزلوں کے ساتھ

اشکوں سے ہم نے چاند ستارے بنا لئے
اچھی گزر بسر ہے تمہارے غموں کے ساتھ

مَیں چین سے ہوں مُجھ سے تو اَب دُور ہی رہو
چلتا رہا مَیں زندگی میں حادثوں کے ساتھ

اچھی ہے اُس کی دوستی عادت بُری نہیں
ہوتے ہیں خار شاخ پہ اکثر گلوں کے ساتھ

کوتہ قلم علوم پہ سایہ فگن ہوئے
شمشاد سے کھڑے ہیں وہ چھوٹے قدوں کے ساتھ

کیوں پیار دِل خریدے بھی ملتا نہیں ہے اَب
کیسے زُبیؔر پھر چلوں میں حاسدوں کے ساتھ

شگفتہ نازلی

کچھ تو کہیے بھلے بُرا کہیے
ماسوا اس کے اور کیا کہیۓ

ایک ہی شرط ہے ساعت کی
جو بھی کہیے مگر بجا کہیۓ

ابتدا تو کہیں سے ہوئی تھی
آپ اب اس کی انتہا کہیے

جب کہ ساری وفائیں جانتے ہیں
ہو گا کچھ تو صلہ ذرا کہیۓ

کوئی گر بات ہی نہیں مانے
ہو گی کیا پھر بھلا سزا کہیۓ

ہو جو خوبی کوئی تو کہتے ہیں
کیا بُرا ہے اگر بھلا کہیۓ

جو کہ دِل دیکھے قُرب شہ رگ کا
اُس کو اور کچھ نہیں خُدا کہیے!

امتیاز دانشؔ

کر کے سولہ سنگار رات گئے
کون آیا ہے یار رات گئے

میرے کمرے میں اس کی آہٹ سے
بج اٹھا دل کا تار رات گئے

میرا صبر و قرار چھین لیا
آئی کیسی بہار رات گئے

میں ہوں حیراں کہ میرے گھر میں کیوں
آئے پتھر دو چار رات گئے

ایسا محسوس میں بھی کرتا ہوں
رات کرتی ہے وار رات گئے

کون سا اس پہ قہر ٹوٹا تھا
چیخ اٹھا کوہسار رات گئے

مشتاق شبنمؔ

میں اپنے ساتھ اک ایسی کتاب رکھتا ہوں
تمام عشق و ہوس کا حساب رکھتا ہوں

گزرتا رہتا ہوں تکلیف دہ مناظر سے
گداز قلب ہوں چشمِ پُرآب رکھتا ہوں

ہمیشہ رہتا ہوں اے دوست میں اجالوں میں
اُفق پہ ذہن کے میں آفتاب رکھتا ہوں

ابھی ہیں قرض بہت واجب الادا مجھ پر
میں ذرہ ذرہ سبھی کا حساب رکھتا ہوں

کسی کی مصلحت! اندیشوں سے کیا لینا
میں اپنی فکر و نظر بے نقاب رکھتا ہوں

کسی کے قول و عمل کا نہیں ہوں میں قائل
میں اپنی سوچ میں اپنا نصاب رکھتا ہوں

زمانے بھر کے عذاب و ثواب کا شبنمؔ
کوئی جو پوچھے تو مسکت جواب رکھتا ہوں

عابد انصاری

چھوڑیئے بھی جگ ہنسائی ہے میاں
دوستی کس نے نبھائی ہے میاں

سرخرو یوں ہی نہیں ہوں آج میں
جان کی بازی لگائی ہے میاں

پوچھتی پھرتی ہے خلقت شہر میں
آج کل کس کی خدائی ہے میاں

بولنے پر سرخروئی لب کی ہے
خامشی میں کیا بھلائی ہے میاں

ہے نشیمن پر نظر اغیار کی
اور گلشن میں لڑائی ہے میاں

کیا غزل کیا نظم ہر صنفِ سخن
زندگی سے آشنائی ہے میاں

لاکھ قدغن لب کشائی پر سہی
بولنے ہی میں بھلائی ہے میاں

دیکھتا ہوں مڑ کر اب عابدؔ جو میں
اک ندامت کل کمائی ہے میاں

راؤ وحید اسدؔ

میں ہوں شیشہ تو نہ سورج خود پہ اتنا مان کر
میں جلا سکتا ہوں سب کچھ روشنی کو چھان کر

معرکہ اک اور سر کرنا پڑا پھر سے مجھے
میں گیا تھا گھر میں اب ترکِ سفر کی ٹھان کر

سب اندھیرے نام میرے چاند کیوں لکھوا دیئے
دو گھڑی آنگن میں میرے چاندنی مہمان کر

روک سکتے ہیں کہاں اہلِ سخن کا راستہ
لاکھ رکھیں شعر کے آگے کمانیں تان کر

توڑ ڈالے خواب سارے مرکزی کردار نے
مر گیا اک شاہزادہ یہ کہانی جان کر

طالب انصاری

مشکل سے خود کو کھینچ کے لایا ہوں اپنے ساتھ
آدھا وہیں پہ رہ گیا آدھا ہوں اپنے ساتھ

دشمن سے نرم لہجے میں کرتا ہوں گفتگو
پھر اس کے بعد خوب جھگڑتا ہوں اپنے ساتھ

منوا لے مجھ سے آ کے جو منوانا ہے تجھے
میں زیادہ تیرے ساتھ ہوں تھوڑا ہوں اپنے ساتھ

اک بار مجھ سے جان مری مانگ تو سہی
چل جائے گا پتہ تجھے کتنا ہوں اپنے ساتھ

پہلے یہ آرزو تھی مرے ساتھ تو بھی ہو
اک عمر سے اب آپ ہی رہتا ہوں اپنے ساتھ

طالب شکست مان کے بیٹھا ہوں اک طرف
قسمت سے میں خفا نہیں روٹھا ہوں اپنے ساتھ

حسن عباسی

سورج کبھی تو میرے نشانے پہ آئے گا
پھر چاند کا دماغ ٹھکانے پہ آئے گا

میں مانتا ہوں کوئی نہیں اُس سا خوش مزاج
میں جانتا ہوں جب وہ رُلانے پہ آئے گا

ہر کام اپنا ہو گا برابر اسی طرح
جھونکا ہوا کا دیپ جلانے پہ آئے گا

تنہا نہیں پھروں گا میں جنگل میں عمر بھر
کوئی پرند تو مرے شانے پہ آئے گا

کل شام جھیل پر نہیں جاؤں گا میں حسنؔ
کل شام میرے گھر کوئی کھانے پہ آئے گا

نازیہ اداؔ

کیا حقیقت ہے کیا فسانہ ہے
کس نے پوچھا ہے کس نے جانا ہے

عشق ہر حال اک تڑپ ٹھہرا
فرقتِ یار تو بہانہ ہے

جانے ہم کانچ کے کھلونوں نے
کس کے ہاتھوں میں ٹوٹ جانا ہے

گرچہ تُو بھی وفا شناس نہیں
میرا مقصد بھی چوٹ کھانا ہے

وہ تو اوروں کے امتحاں لے گا
میں نے خود کو بھی آزمانا ہے

میرے دل کی تجوریوں میں اداؔ
پیار ہی پیار کا خزانہ ہے

پرویزؔ ساحر

عجب ایک نُوریں غُبار ہے مِرے چارسُو
کوئی روشنی کا حِصار ہے مِرے چارسُو

بُجز اُس کے کوئی بھی شے دِکھائی نہ دے مجھے
وہی ایک چہرۂ یار ہے مِرے چارسُو

یہ اُسی کی صحبتِ خُوش اثر کا ہے معجزہ
یہ جو نُور کا سا غُبار ہے مِرے چارسُو

مَیں نہ چاہتے ہوئے بھی اِسی کے اثر میں ہوں
یہ عجب طلسمِ بہار ہے مِرے چارسُو

مَیں کہ جس میں دفن ہوں میری اپنی ہی قبر ہے
مِرے جسم ہی کا غُبار ہے مِرے چارسُو

ایک دن

شمشاد احمد

چھٹی والے دن سرپٹ دوڑتے پاگل گھوڑے قدم قدم چلنے لگتے ہیں.... زندگی اچانک کچھ مختلف، کچھ آسان ہو جاتی ہے۔

میں بغیر بھرکی چھٹری نیند سے خوب گلے لگ کر سویا ہوں....

میرے قریب ہی میرے دونوں بچے سکون سے سو رہے ہیں.... وہ آج خاصی دوپہر تک سوتے رہیں گے۔

کچن میں ایک چھناکا ہوتا ہے سے پتا چل گیا کہ بیگم چائے بنا رہی ہیں.... وہ جانتی ہے کہ صبح آنکھ کھلتے ہی میرا پہلی تقاضا مانگتا ہے۔

میرے پاؤں خود بخود دکھانے کی میز کی طرف اٹھنے لگے۔

دروازے کی جھری میں آدھے اندر آدھے باہر اخبار نے مجھے گھورا.... میں نے اسے نظر انداز کر دیا.... سارا دن پڑا تھا۔

میں نے کرسی کھینچی اور ٹانگوں سمیت اس پر بیٹھ گیا۔

ہفتے کے چھ دن صبح اٹھتے ہی میں اپنے دو جانی دشمنوں اخبار اور سگریٹ کے ساتھ سید ھا واش روم کی طرف لپکتا ہوں.... ڈرتے ڈرتے اخبار کی سرخیاں پڑھتا ہوں۔

ہر کام جلدی جلدی کرنے کی کوشش میں سب کچھ ہی ادھورا رہ جاتا ہے۔

میری آنکھیں نیچے بازار میں کھلنے والی کھڑکی پر ٹھہر جاتی ہیں....

کھڑکی کھلی دیکھ کر مجھے حیرانی بھی ہوئی اور خوشی بھی....

ہم جب سے اس فلیٹ میں شفٹ ہوئے ہیں، میری اور بیگم کی اس کھڑکی پر کئی بار جھک جھک ہو چکی ہے.... وہ اسے ہر صورت بند رکھنا چاہتی ہے کیونکہ اسے گرد و غبار، دھوئیں اور بے ہنگم آوازوں سے الرجی ہے.... میرے اندر کا دیہاتی سال ہا سال شہر میں رہ کر بھی شہری نہیں ہو پایا.... وہ کھلی ہوا مانگتا ہے، خواہ اس میں زہر ہی کیوں نہ ملا ہو۔

میں کھڑکی سے جھانکنے لگتا ہوں۔

جاتے موسم سرما کی نرم دھوپ بلڈنگوں کی چھتوں پر اداس لیٹی ہے۔

اچانک کہیں سے ایک لالی آنکلی.... وہ ٹیلی فون کی دھیلی تنی تار پر پھڑپھڑائی.... پھر اس پر بیٹھ گئی.... لالی کے وزن سے تار آگے پیچھے ہلنے لگی۔

تار آہستہ آہستہ ساکن ہو گئی.... لالی نے اپنی زرد چونچ دونوں طرف سے باری باری تار سے رگڑی اور پھر مزے سے جھولا جھولنے لگی۔

اچانک کھمبے کے عین نیچے ایک شوخ لمبی گاڑی انتہائی بدتمیزی سے آن رکی۔

لالی ٹھٹکی، اچھلی.... پھر گولی کی تیزی سے فضا میں کود کر میری نگاہوں کے زاویے سے نکل گئی۔

ٹیلی فون کی تار کافی دیر تک ہلتی رہی.... اس کے ساتھ میں بھی ہلے چلا جا رہا تھا۔

مجھے گاڑی اور گاڑی والی پر سخت غصہ آیا۔

ایک ضرورت سے زیادہ پلی پلائی، ادھیڑ عمری بیگم صاحب قسم کی خاتون نے بد بودار وقت سے دروازہ کھولا اور چھلکتی ہوئی باہر آگئی۔

اس دوران پچھلی سیٹ سے اس کا خمیدہ کمر ملازم برآمد ہو چکا تھا.... اس نے پچھلی ڈگی میں سے جہازی سائز کی ٹوکریاں اٹھائیں اور جھک جھک کرتے قدموں سے بیگم کے پیچھے چل پڑا۔

چمچ چائے کی پیالی میں جلترنگ بجاتا ہوا چلا آ رہا تھا....

ایک سست انگڑائی میرے بازو پھیلا کر میرے اوپر لیٹ گئی۔

بیگم نے کھلے چہرے پیالی میز پر رکھ دی اور میری ناک پکڑ کر شرارت سے کھینچ ڈالی۔

"آپ سکون سے چائے پئیں.... میں ناشتہ لاتی ہوں.... آج ناشتہ ایک ساتھ کریں گے"

میں نے چائے کی ایک پھیکی سی چسکی لی اور کپ میز پر رکھ کر پھر کھڑکی کی طرف پلٹا۔

کھڑکی کے نیچے چھٹی کی صبح والی خوش خرام زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔

زیادہ تر گاہک گوشت سبزی کی دکان پر تھے۔

گاڑی والی "بیگم" صاحبہ قصاب پر برس رہی تھیں۔

"سالوں سے تم سے گوشت لے رہی ہوں.... ذرا لحاظ نہیں کرتے.... آدھے سے زیادہ چھیچھڑا ڈال دیا ہے.... نکالو اسے.... تم جانتے ہو کہ مجھے چھیچھڑا بالکل پسند نہیں۔"

قصاب ہونٹ دبا کر مسکرا دیا۔

کچے پکے مہاسوں سے لدے چہرے والا نوجوان ایک نوزائیدہ گھیل سے کھیل رہا تھا.... اس کی بھوکی آنکھیں "بیگم" صاحبہ کے

سپر (super) بیچنے پر جھگڑنے لگیں۔
ارد گرد کھڑے بوڑھے جوان تاکیب مکمل انہماک سے بیگم صاحبہ کی نوک جھونک پر نمک مرچ چھڑک کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔

قصاب سے جڑی سبزی والی دوکان پر مختلف نسل اور رنگ کی سبزیاں انسانوں سے کہیں زیادہ ترتیب اور ڈسپلن سے سجی رکھی تھیں.... ان پر تازہ دم چھڑکے پانی کی بوندیں پر بہار کر دی تھیں۔

سبزی والا ٹنڈے ترازو کے پلڑے میں ڈالتا اور لٹی ہوئی بڑھیا اپنی چاپ اسٹک (Chop Stick) انگلیوں سے ہر ٹنڈے کو دبا کر جانچتی۔ اس پر روس تلاش کرتی.... جو پسند نہ آتا واپس ٹوکرے میں ڈال دیتی۔ کھیل کچھ دیر چلتا رہا۔

دکاندار تنگ پڑ گیا۔

"جاؤ.... اپنا رستہ لو.... میری دکانداری خراب نہ کرو۔"

بڑھیا بھی بپھر گئی۔

"رکھ اپنے پاس سڑے ہوئے ٹنڈے۔"

سبزی والا اپنے ٹنڈوں کی توہین پر بھڑک اٹھا.... اس کی رگ ظرافت پھڑکنے لگی.... اس نے کھلے عام بڑھیا پر چوٹ کی۔

"بے موسم کا پھل ہے۔"

بڑھیا بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

میرے اندر ایک قہقہہ پھوٹا اور ہونٹوں کا حصار توڑ کر باہر آ گیا۔

جنرل اسٹور کھل چکا تھا.... مالک باہر اسٹول پر بیٹھا جمائیں لے رہا تھا.... ابھی اس کا وقت شروع نہ ہوا تھا۔

بیگم ٹرے میں ناشتہ سجائے ٹھمکتی ہوئی آ گئی.... چھٹی والے دن وہ بیوی کی بجائے محبوبہ بن جاتی ہے۔

ہلکے سنہری توس، مکھن.... ہری پیاز میں گندھا گرم گرم آملیٹ....

بیگم نے توس پر مکھن لگا کر میری طرف بڑھایا.... میں نے منہ کھول دیا۔

ہم دونوں اکیلے تھے.... وقت ہماری مٹھی میں تھا.... ہم ایک دوسرے کی محبت اپنے حرے سے ماشر کر رہے تھے....

محبت فرصت چاہتی ہے.... ورنہ کملانے لگتی ہے.... پھر چپکے چپکے سسکیاں بھرتی مر جاتی ہے۔"

بیگم کے جسم پر پہلی کروٹیں جا نہیں وجود میں آ چکی تھیں.... لیکن اتنا زیادہ بگاڑ نہ ہوا تھا.... خوش ہو تو دس سال کینچلی کی طرح اتر جاتے ہیں۔

بیگم برتن لے کر جا چکی تھی لیکن اس کی مہک سے کمرہ مہک رہا تھا۔

میرا جی چاہا کہ واپس بستر میں گھس جاؤں.... سر سے پاؤں تک کمبل اوڑھ کر ان خوشگوار لمحوں کے لمبے لمبے سانس لیتا سو جاؤں.... اور پھر کبھی نہ جاگوں۔

میں اٹھنے لگا تو بیگم کی آواز نے روک لیا۔

"بیٹھے رہیے.... میں چائے لا رہی ہوں۔"

دروازے کے نیچے گری پڑی میں لپٹا اخبار چیخنے لگا۔

"میں یہاں ہوں.... میں بھی تمہارا منتظر ہوں.... تم ابھی تک میرے بغیر زندہ ہو؟"

میں اخبار کھولے بغیر اس کے سیاہ ماتھے پر لکھی تحریری سرخیاں پڑھ سکتا تھا۔

میرا دل چیخنے لگا۔

"ہر جگہ کسی نہ کسی صورت جنگ کا بازار گرم رہتا ہے.... گولیاں، آسمانوں سے آگ.... سلگتے انسانی اعضا.... بچ رہنے والوں کی آہ و فغاں... پھر قل تک رکے نوا....

انسان کیوں اپنی تذلیل کرتا پھرتا ہے.... احمق اجنبی دوسرے اجنبیوں کی جان لینے پر کیوں تیار بیٹھا رہتا ہے۔

غصے کی جھاگ بہہ نکلی....

"روٹی.... پیٹ کی آگ موت سے بھی زیادہ بے رحم ہے۔"

میں بہکنے لگا.... میرے ہر مسام سے دعا پھوٹی۔

"مالک.... تیرے خزانے لازوال ہیں.... صبح شام آسمان سے پیٹ کا ایندھن پھینک دیا کر شاید.... "مجھے فوراً ہی اپنے احمق پن کا احساس ہوا۔

"یہ تو صدیوں پہلے بھی تم نے کیا تھا.... لیکن.... لیکن...."

میں نے اخبار کو یکسر نظر انداز کر دیا اور کھڑکی کا سہارا لیا۔

ٹیلیفون کی ڈھیلی ہوئی تار ساکن تھی.... لالی جا چکی تھی اور اب اس کے لوٹنے کی امید ٹوٹ گئی تھی۔

'بے غم' کی شوخ نیلی گاڑی ابھی تک ٹیلیفون کے کھمبے سے لگی کھڑی تھی۔

دھوپ چھتوں سے دبے پاؤں اترتی ہوئی گلی تک آ گئی تھی.... بازار کی گہما گہمی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔

ایک چھوٹا سا متناسب برف کے گالے جیسا لالی کا بچہ 'بے غم' کی کار کے ٹائر سے کھیل رہا تھا.... دھوپ اور زندگی سے محظوظ ہو رہا تھا۔

اس نے اپنے ناخن تارکول کی سڑک پر رگڑے.... ایک نظر ٹائر

سرحدیں

دیپک بُدکی

”انکو اکالا چھیر دیا۔“

ہماری گلی میں جب بھی کتے واویلا مچاتے تو میرے پتاجی اس فقرے کا ورد کرنا شروع کر دیتے۔ بھگوان جانے یہ منتر تھا یا جھاڑ پھونک کا کوئی نسخہ لیکن ان کے دل میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ کتوں کا واویلا کرنا اشبھ ہوتا ہے اور اس کا توڑ صرف اس فقرے میں مضمر ہے۔ بہر حال کہتے تھے کہ ہمارے ہی گھر کے عقب میں ہمیشہ بھونکتے تھے اور اکثر جھگڑتے رہتے۔

ہمارا گھر دو گلیوں کے کونے۔ جنکشن پر واقع تھا۔ پیچھے ایک گلی تھی جو سیدھی جا کر سڑک سے جا ملتی جبکہ سائیڈ والی گلی انگور کی بیل کی مانند دیگر گلیوں سے گزرتی چلی جاتی اور نہ جانے کہاں اپنا وجود کھو بیٹھتی۔ یہی تھی۔ جنکشن گلی کے کتوں کا دارالحرب بن چکا تھا۔

پچھلی گلی پر کتوں کے ایک مخصوص گروہ کا قبضہ تھا۔ تین بچے کتے نر تھے اور دو مادہ۔ یہ کتے بلا خوف و خطر اپنی گلی میں گھومتے پھرتے اور ہمیشہ کھانے پینے کی چیزوں کی تلاش میں رہتے۔ جب بھی کہیں کسی کھڑکی یا دروازے سے کسی شخص کی مانوس ”تو تو تو تو“ یا ’پچ پچ پچ پچ‘ کی آواز سنائی دیتی، سب کے سب گلی کی رفتار سے دوڑ پڑتے اور اپنا حصہ لینے کے لئے چھینا جھپٹی میں مصروف ہو جاتے۔ عموماً بلانے والا شخص کوئی عورت ہوتی جو باسی چاول، بچی کچی ہڈیاں یا سوکھی سڑی روٹیاں ان کے سامنے ڈال دیتی اور وہ اپنا حصہ لینے کے لئے اپنی دم ہلاتے رہتے۔ کم پڑتا یا پھر اور ملنے کی امید ہوتی تو دیدے پھاڑ پھاڑ کر وہیں پر سائل بنے رہتے۔

یہ کتے جان کی بازی لگا کر اپنے علاقے کی حفاظت کرتے۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ آنکھ اٹھا کر بھی ان کے علاقے کی طرف دیکھ لیتا۔

یہی حال سائیڈ والی گلی کا بھی تھا۔ اس گلی پر ایک خاص مقام تک دوسرے گروہ کا راج تھا۔ دو نر تھے اور دو مادہ۔ یہ کتے بھی اپنے علاقے کے محافظ تھے۔ ان کی سرگرمیاں اپنے علاقے تک محدود تھیں۔ ہر ایک چپے پر ان کی کڑی نگاہ رہتی اور معمولی سی مداخلت بھی ان سے برداشت نہ ہوتی۔

سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ ایک گروہ کے کتے اپنی گلی چھوڑ کر دوسری گلی میں ہرگز نہ گھستے اور نہ ہی کبھی علاقۂ غیر کو حرص و طمع کی نظروں سے دیکھتے۔ بس جہاں دوسرے گروہ کے پیشاب کی بُو سونگھ لیتے وہیں ان کی سلطنت ختم ہو جاتی اور وہ اس سرحد سے مڑ کر واپس چلے آتے۔ کتے اپنے علاقے کی حد بندی بارود بچھا کر نہیں بلکہ اپنے پیشاب سے کر لیتے۔ انہیں اپنے ایریا میں جب بھی کوئی اجنبی شے ملتی یا کسی جگہ پر وہ مخصوص بو نہیں ملتی جو ان سے وابستہ تھی تو فوراً وہ اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر اس پر موت دیتے تا کہ سند رہے۔ کتوں کی یہ خصلت نرالی ہے جو آج کل کے تہذیب یافتہ انسانی معاشرے میں بھی نہیں پائی جاتی۔ خود غرضی کی ایسی مثال اشرف المخلوقات کی بجائے ان جانوروں میں ہی ملتی ہے۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ کتوں کے دو گروہ آپس میں کبھی نہ لڑتے ہوں۔ بلکہ صورت حال اس کے بالکل الٹ تھی۔ ہر شام سرحد کی دونوں جانب محاذ آرائی ہوتی۔ دونوں گروہوں کے کتے نر مادہ چھوٹے بڑے سبھی ایک دوسرے کی شہ پا کر بھاگے چلے آتے۔ جانے انجانے ایک دوسرے کو للکارتے، غراتے اور پھر جنگ کا اعلان کر دیتے۔

”او و۔۔۔۔و۔۔۔۔ؤ او۔۔۔۔ووُف ؤف“ پہلا گروہ ہم آواز ہو کر بھونکتا۔

”او۔۔۔او۔۔۔۔ او۔۔۔۔ ووُف ؤف“ دوسرا گروہ حرکت مکافاتی کارروائی کرتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے شور و غل اتنا بڑھ جاتا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ آس پاس کے مکانوں میں رہنے والے لوگ اس مسلسل چیخم دھاڑ سے تنگ آ جاتے اور بعض اوقات ان کتوں کو منتشر کرنے کے لئے ان پر ڈنڈے یا پتھر برساتے۔ کبھی کبھی ان لڑائیوں کے دوران پلّوں کے بلبلانے کی دلسوز آوازیں آتیں اور سننے والوں کو ایسا محسوس ہوتا کہ چند لمحوں کے بعد ان پلّوں کی جان چلی جائے گی۔ بہر حال گزشتہ پچاس برسوں میں نہ تو میں نے ان لڑائیوں میں کسی کو بری طرح زخمی ہوتے دیکھا اور نہ ہی کسی کی موت واقع ہوتی دیکھی۔ حالانکہ ہر شام جنگ کے بگل بجتے، دونوں طرف سے بھونکنے کی آوازیں آتیں اور اکثر و بیشتر گھمسان چھڑ پیچھڑ جاتیں۔ کبھی کبھار چند ایک کتے نصف شب تک آسمان کی جانب سر اٹھا کر بین کیا کرتے۔

کتوں کی ایک اور خصوصیت جو انسانوں سے مختلف ہوتی ہے افزائشِ نسل کا طریقہ ہے۔ کتیا جب تک حدت کی حالت میں نہ ہو وہ مجامعت کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ اور یہ حالت سال میں ایک دو بار ہی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ صرف ایسی حالت میں کتیا کا حمل ٹھہرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس لئے گروہ کے کتے ان دنوں کتیا کو رجھانے کے لئے طرح طرح کے داؤ پیچ

آزماتے ہیں۔

کتوں کی محبت بھی ہم بچوں کو انوکھی لگتی۔ وہ انسانوں کی مانند ہر پل ہر وقت شریک محبت کی تلاش میں نہیں رہتے۔ عام طور پر یہ کارروائی شب میں ہوا کرتی لیکن بعض دن میں بھی دیکھنے کو ملتی۔ جب بھی کوئی کتیا جوش میں آتی، اس کے گروہ کے کتے اُسے زیر کرنے کے لئے دم بار بار ہلاتے اُسے چوستے چاٹتے اور آخر کار ان میں جو طاقت ور ہوتا وہ کامیاب ہو جاتا۔ ایسی باتیں تو خیر بھی جانوروں میں نظر آتی ہیں مگر کتوں میں جو خاص بات قابل توجہ ہے وہ نر اور مادہ کا گھنٹوں آپس میں جڑے رہنا ہے۔ اس حالت میں شریر بچے تجسس کے باعث ان کا تعاقب کرتے یا کبھی کبھار ان پر پتھر مار کر الگ کرنے کی کوشش کرتے۔ عورتیں تو خیر نظریں چرا کر نکل جاتیں البتہ بوڑھے بزرگ پاس کھڑے بچوں کو تنبیہ کرتے کیونکہ انہیں اس بات کا احساس ہوتا کہ بچے خواہ مخواہ اس فطری عمل میں دخل اندازی کر رہے ہیں۔

ایک رات غضب ہوا۔ سائیڈ والی گلی کی کتیا حدت کی حالت میں پریشان تھی۔ گلی کے کتے روزمرہ کی معرکہ آرائی کے بعد سو چکے تھے۔ چودھویں کا چاند اپنی نقرئی کرنوں سے زمین کی ہر شے کو نہلا رہا تھا۔ دفعتاً کتیا کی نظر سرحد کے اس پار دوسری گلی پر پڑی جہاں ایک خوبصورت کتا کب سے اپنی دم ہلا ہلا کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گو سرحدیں مانع تھیں مگر دونوں ایک دوسرے کی جانب کھنچے چلے جا رہے تھے۔ عشق عقل پر حاوی ہو گیا اور ڈری سہمی کتیا دم دبائے ہوئے چپ چاپ آہستہ آہستہ دوسری گلی میں داخل ہو گئی۔ کتا جو بہت دیر سے اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑا تھا اپنی دم ہلاتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ کتیا اپنے محبوب کی موجودگی میں سارے عالم سے بے خبر ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو گئے اور انجام کار یک جان دو قالب ہو گئے۔

اسی اثنا میں پچھلی گلی کی ایک کتیا کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے علاقے میں اس اجنبی کتیا کو دیکھ کر وہ حسد اور جلن کی آگ سے تپ گئی اور زور زور سے بھونکنے لگی۔ اس کی آواز سنتے ہی گلی کے بھی کتے اکٹھا ہو گئے اور ان دو جڑی ہوئی روحوں پر بھونکنے لگے انہوں نے بارہا اس جوڑے پر حملہ کیا اور انہیں جدا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ان کی آوازیں سن کر سائیڈ والی گلی کے کتے بھی جمع ہو گئے اور ان کو للکارنے لگے۔ دفعتاً دونوں گروہ محاذ پر آمنے سامنے ڈٹ گئے اور ایک دوسرے پر حملے کرنے لگے۔ پچھلی گلی والے کتے یہ بھول ہی گئے کہ ان کے علاقے میں کوئی کتیا گھس بیٹھ کر کے آ چکی ہے اور ان کے ایک باغی کتے کو ورغلانے میں کامیاب ہو چکی ہے۔

سرحدیں خاموش اس منظر کو دیکھ رہی تھیں۔ اختتام پر کتیا کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے۔ علاقہ غیر میں سکونت اختیار کرے یا پھر واپس چلی جائے۔ جس علاقے میں وہ آئی تھی وہاں کے کتوں کے لئے وہ ناقابل قبول تھی۔ اس لئے اس نے واپس اپنے علاقے میں جانے کی ٹھان لی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب وہ اکیلی نہیں تھی بلکہ اپنے عشق کی نشانی بھی ساتھ میں لیے جا رہی تھی۔

وہ اپنی دم دبائے چپکے سے لڑتے جھگڑتے کتوں کے بیچ میں سے راستہ بنا کر اپنے علاقے میں داخل ہوئی۔ اس کی دبی ہوئی دم نے جنگ کے میدان میں سفید پرچم کا کام کیا۔ اُسے خود لڑائی جھگڑے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ حالانکہ اس کے علاقے کے بھی کتے اس وقت دوسری گلی کے کتوں سے برسر پیکار تھے۔

اس مراجعت پر اس کے گروہ کے کسی کتے نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ جیسے کہیں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اگر آدم زاد ہوتی تو نہ جانے کیسے کیسے سوال اٹھائے جاتے، رنگ و مذہب نسل و ذات کا واسطہ دیا گیا ہوتا اور کون جانے کیسے کیسے عتاب اس پر نازل کئے جاتے۔ اتنا بھی ممکن تھا کہ دار و رسن ان کے خون سے لب تک تر ہو چکے ہوتے لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ گزشتہ ایام کی طرح ہی روزمرہ کے کاموں میں جٹ گئی۔

کچھ ہفتوں کے بعد اُسے اپنا جسم بھاری سا محسوس ہونے لگا۔ اس کی چھاتیوں میں دودھ اتر آیا۔ اس نے گلی کے شور شرابے سے دور ایک مکان کے چبوترے کے نیچے اپنا مسکن بنا لیا اور وہیں پر چھ پیارے پیارے خوبصورت پلوں کو رات کے اندھیرے میں جنم دیا۔ مکان کی مالکن ہر روز مٹی کے برتن میں اُبلے چاول کا پانی کتیا کے سامنے رکھ دیتی جسے وہ ثواب کا کام سمجھتی تھی۔ کئی ہمسائے بھی بچا کھچا کھانا چبوترے کے نیچے رکھ کر چلے جاتے۔ کتیا جہاں بھی جاتی ننھے منے پلے اس کے ساتھ چلے جاتے۔ کسی جگہ کھڑی ہوتی تو وہ اچھل اچھل کر ماں کے بھاری بھرکم لٹکتے تھنوں کو منہ میں پکڑنے اور چچوڑنے کی کوشش کرتے۔

دیکھتے ہی دیکھتے پلے بڑے ہو گئے۔ ان میں سے چار تو لقمۂ اجل بن گئے جبکہ باقی دو اپنے گروہ میں شامل ہو کر ہر شام اپنے علاقے کی حفاظت کے لئے محاذ پر ڈٹ کر مقابلہ کرتے انہوں نے بھی اپنی سرحدوں کی نشاندہی کے لئے جگہ جگہ مُوت دیا اور پوری طرح اطمینان کر لیا کہ کوئی اجنبی کتا ان کے ایریا میں گھسنے نہ پائے۔

انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ جن کتوں کے ساتھ لڑ رہے تھے ان میں سے ایک ان کا اصلی باپ بھی ہے۔ انہوں نے اپنی سرحدیں رشتوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ جغرافیائی اساس پر طے کر لی تھیں۔ انہوں نے اپنے علاقے کی حدود پر مُوت کر اپنے خونی رشتوں سے قطع تعلق کر لیا تھا اور اب اپنی گلی میں آوارہ اور بے فکر گھوم رہے تھے۔

کوئلہ بھئی نہ راکھ

ارشاد احمد صدیقی

جب زینب کی شادی ہوئی اور وہ امریکا چلی گئی تو غزالہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بھری دنیا میں تنہا رہ گئی ہے۔ زینب اور غزالہ صرف بہنیں ہی نہیں تھیں بلکہ وہ راز داں سہیلیاں بھی تھیں۔ غزالہ زینب کے جانے پر خوش بھی تھی اور نا خوش بھی۔ خوش اس لئے تھی کہ زینب سنجیدہ، سادہ لوح اور کم گو تھی، دوسرا یہ کہ وہ عمر کی اس منزل پر تھی کہ اب اگر اس کی شادی نہ ہوتی تو شاید کبھی بھی نہ ہوتی۔ غزالہ اور زینب کے درمیان زوروں کی خط و کتابت ہونے لگی۔ وہ خطوط دو بہنوں کے خطوط سے زیادہ دو سہیلیوں کے خطوط تھے۔ غزالہ کبھی اُسے باجی، کبھی ڈیئری اور کبھی گرل فرینڈ لکھتی۔ زینب اُسے لکھتی "زالی امریکہ کا وہ تصور جو ہمارے لوگوں میں ہے، امریکا ویسا بالکل نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں کے شہر درحقیقت روشنیوں کے شہر ہیں۔ شاپنگ مال ہیں جیسے ہمارے شہروں کے ایئر پورٹ، زندگی کی حرکت ایسی جیسے دریا میں طغیانی۔ اور مصروفیات کی یہ حالت کہ ماؤں کے پاس بچوں کو دودھ پلانے کا وقت نہیں۔ 80 فیصد سے زیادہ بچے ماں کے دودھ سے محروم ہیں..... زالی اگر میاں بیوی دونوں کام نہ کریں تو وہ زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بچے نرسری میں پلتے ہیں۔ اور شام کو جب ماں باپ باہر جاتے ہیں تو بچوں کو Baby Sitters کے حوالے کر جاتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بچوں اور والدین کا تعلق سرسری ہے اور دوسرا یہ زالی! کہ کسی کو کسی سے بات کرنے کا وقت ہے نہ دماغ۔ ہر کوئی اپنے اپنے راہٹ کے گرد تندہی سے چکر کاٹ رہا ہے۔ میں جو تصورات لے کر امریکا آئی تھی وہ یہاں عنقا ہیں۔ بلاشبہ یہاں عظیم الشان ریسٹورنٹ ہیں لاجواب سڑکیں ہیں۔ شام ہوتے ہی شہر کے طعام کدے اور بار (Bar) جگمگاتے چہروں سے لبریز ہو کر چھلکنے لگتے ہیں۔

غزالہ زینب کے لمبے لمبے خط پڑھ کر دل میں کُڑھ کُڑھ کر کے ہنستی۔ وہ اپنے آپ سے کہتی باجی امریکا جا کر بھی اللہ میاں کی گائے ہی رہی۔ اور وہاں کی زندگی کو صرف اور صرف اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ بے چاری گرل فرینڈ! غزالہ ایک بار غلطی سے پوچھ بیٹھی کہ "ڈیئر تم سارا دن کیا کرتی ہو؟" زینب نے جو خط لکھا اس میں حقیقت پسندی کے پس منظر میں حزن تھا۔

"میری عزیز از جان زالی۔ میرے شب و روز کا دائرہ تیلی کے بیل سے مختلف نہیں۔ تم کوئی کریدی کیسی تو تھی باتیں کر رہی ہے۔ لیکن حالات ہی ایسے ہیں۔ عمران نے دبے دبے لہجے میں مجھے ایک بار کہا تھا کہ جاب ڈھونڈو میں نے تھکا تھک درخواستیں ہر سمت روانہ کیں۔ چند ایک انٹرویو بھی ہوئے اس کے بعد تعریفوں بھرے Rejection کے خطوط بھی ملے۔ پھر سوچا کسی بینک میں Teller یا کسی فرم میں Receptionist بن جاؤں لیکن زالی! اللہ کی امان۔ تنخواہ بہت کم اور اوقات کار بہت زیادہ۔ دس گھنٹے دفتر میں کام کرو تین گھنٹے آنے جانے کا لگا لو تو ہفتہ کے چھ دن تو گئے نا۔ اور دوسری بات یہ کہ ایسی ملازمتوں کے لئے ہائی سکول پاس لڑکیوں کی قطاریں ہر لحظہ منتظر ہیں کو تنخواہ سے زیادہ ملازمت کے حصول کی جستجو رہتی ہے۔ اس طرح وہ آسانی سے Dating کر سکتی ہیں۔ خاوند پھانس سکتی ہیں کیونکہ یہاں شادی سراسر لڑکے اور لڑکی کا معاملہ ہے اس میں والدین کا دخل بے جا ہے۔ تم نے پوچھا میں سارا دن کیا کرتی ہوں؟ عمران صبح سات بجے چلے جاتے ہیں۔ رات آٹھ بجے واپس آتے ہیں۔ ہم چھ بجے ناشتہ کرتے ہیں۔ TV پر خبریں اور موسم کی رپورٹ سنتے ہیں۔ عمران کے جانے کے بعد میں ایک کپ چائے اور پیتی ہوں۔ مقامی اخبار دیکھتی ہوں۔ پھر گھر کی صفائی کرتی ہوں۔ کپڑے بدل کر کے اپنا پسندیدہ پروگرام General Hospital دیکھتی ہوں (یہ ایک ٹی وی پروگرام ہے) نہ ہمیں کوئی ملنے آتا ہے اور نہ ہی ہم کسی کے ہاں جاتے ہیں۔ بہت ہوا تو ویک اینڈ پر شہر چلے گئے۔ ہفتہ بھر کا سامان خرید لیا کبھی کبھار کسی پاکستانی دعوت پر چلے گئے۔ عمران کے جاننے والے ہیں تو بہت ہیں لیکن سارے کے سارے گردن گردن تک اپنی مصروفیات میں غرق ہیں۔ بہت ہی کم ایسا ہوا کہ ہم کسی امریکی دعوت میں مدعو ہوں۔ سوائے آفس پارٹی کے وہ بھی کرسمس کے موقع پر۔"

غزالہ نے یہ خط پڑھ کر بھی وہی انداز لگایا جو پہلے لگا چکی تھی۔

اتفاق کی بات کہ جب غزالہ نے ماسٹرز کی ڈگری لی اسی مہینے عمران کی سالگرہ بھی تھی۔ زینب نے عمران کے دوستوں کو سالگرہ پر مدعو کیا اور سب کو غزالہ کی ماسٹرز کی نوید بھی سنائی۔ پارٹی کے دوسرے ہی دن نعیمہ نے زینب کو فون کیا۔ پارٹی کا شکریہ ادا کیا۔ زینب کے رکھ رکھاؤ طور اطوار کی تعریفیں کیں۔ پھر کہنے لگی تمہاری بہن نے ماسٹرز کر لیا ہے اب اس کی شادی کا کب بندوبست ہو رہا ہے؟ زینب نے کہا ابھی تو ہم نے کوئی ایسی بات Discuss نہیں کی۔ نعیمہ کہنے لگی زینب اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"فرمائیے نعیمہ بہن۔"

"بات یہ ہے کہ میرا بھائی چار سال سے یہاں مقیم ہے۔ کالج گریجویٹ ہے سیلز کی جاب بھی ہے عنقریب پروموشن کا بھی امکان ہے۔ اگر برا نہ مانو تو میں غزالہ کے لئے بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں اور میرے میاں

آپ کی شخصیت آپ کے رکھ رکھاؤ سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ ہم شاید آپ کے قابل نہ ہوں....'' زینب نے بات کاٹ دی ''ایسی بات نہ کریں۔ آپ کی پروپوزل پر میں عمران سے بات کروں گی۔ پھر پاکستان امی سے بات کروں گی اور جو جواب ملا آپ کو مطلع کروں گی۔ اور آپ نے میری تعریفوں کے جو پل باندھے ہیں میں اس کے لئے آپ کی مشکور ہوں۔''

عمران کا انتظار طویل ہوگیا اور جوں ہی وہ گھر میں داخل ہوا زینب نے جھٹ اُسے سارا قصہ سنا دیا۔ پھر دونوں نے مل کر پاکستان فون کیا۔ امی کا پہلا سوال یہ تھا ''تم نے لڑکے کو دیکھا ہے.... اُس سے بات کی ہے؟'' زینب ششدر رہ گئی جھٹ بات بنا کر کہنے لگی ''امی آپ سے بات کر کے ہم انہیں بلائیں گے آپ کی اجازت چاہیے۔'' امی نے اجازت دے دی۔

زینب نے اہتمام کے ساتھ نعیم کی ساری فیملی کو ڈنر پر مدعو کیا۔ گلزار قدرے شرمیلا تھا۔ کم گو بھی تھا۔ زندگی کی راہوں میں قدم جمانے کا متمنی تھا۔ اپنی سیلری کی جاب سے بڑی حد تک مطمئن تھا۔

دوسرے دن زینب نے فون کیا اور بڑی حد تک گلزار کی توصیف کی۔ ماں نے تجویز پیش کی زینب براہ راست غزالہ سے بات کرے۔ جب زینب نے غزالہ سے بات کی تو اُسے محسوس ہوا جیسے غزالہ کی مدتوں کی خوابیدہ آرزوئیں جاگ کر رقص کناں ہوں۔

''ایک بات پوچھوں باجی.......''

''ہاں ہاں ضرور پوچھو.......''

''باجی اس کی شکل دہقان بابا سے تو نہیں ملتی جلتی؟'' زینب غزالہ کی رگ ظرافت سے تو واقف تھی۔ پھر غزالہ نے سنجیدگی سے زینب کو خط لکھا جس میں ایک سجے سجائے گھر پھولوں بھرے لان' امریکہ کی سیاحت' حسین ریسٹورنٹ میں بین الاقوامی طعام' شب گھر میں دوستوں کی پارٹیوں کی دبی دبی خواہشات جھلکتی دکھائی دیتی تھیں۔

عمران اور زینب گلزار کی فیملی سمیت پاکستان گئے۔ گلزار شادی کے بعد غزالہ کو لے کر اس کی خواہش کے مطابق پیرس لندن نیویارک سے ہوتا ہوا لاس اینجلس آیا۔ گلزار کی رہائش دو کمروں کے اپارٹمنٹ میں Middle Income ایریا میں تھی۔ اپارٹمنٹ کا سامان واجبی تھا۔ کھانے کی میز کچن میں تھی۔ اپارٹمنٹ Complex کا لانڈری روم مشترک تھا۔ غزالہ جب اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی تو اس کا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا۔ دن گزرتے گئے اور غزالہ کی چلبلاہٹ گھٹتی گئی۔ اس کی زندگی میں زینب ہی روشنی کا مینار تھی۔ جب وہ زینب کے کندھے پر سر رکھ کر آنسو بہاتی تو زینب میں اچانک بڑی بہن جاگ اٹھتی اور اُسے ڈانٹ دیتی۔ عمران کی کوشش سے غزالہ کو اسلامک سنٹر میں ٹیچنگ کی جاب مل گئی جس سے اس کا دل قدرے بہل گیا۔ لیکن بحر اوقیانوس کے اس طرف رہ کر بھی وہ اپنے آپ کو دقیانوسی پاکستان میں محسوس کرتی۔ جب بچوں کی مائیں انہیں سکول سے لینے آتیں تو آپس میں سرسوں کے ساگ اور آم کے اچار کی باتیں کرتیں۔ یا پھر اپنے کپڑوں اور زیور کی نمائش مطلوب ہوتی۔ یا وہ اپنے خاندان کے پاکستان میں well off ہونے کے تذکرے کرتیں۔ ایک عورت نے یہاں تک کہہ دیا کہ اُس کا بھائی آرہا ہے جو کہ Cardiologist ہے۔ یہ بات کہہ کر وہ عورت شاید بھول گئی اور جب اُس کا بھائی آیا تو معلوم ہوا کہ وہ سیون الیون (7/11) سٹور میں رات کی ڈیوٹی دے رہا ہے۔ ان کی دروغ گوئی سُن سُن کر غزالہ کے کان پک گئے۔

زینب نے غزالہ کو ڈاکٹر منصور کے بیٹے کی سالگرہ پر ساتھ جانے کو کہا۔ ظاہر ہے گلزار ان کے ساتھ نہ جا سکا کیونکہ وہ ڈیوٹی پر تھا۔ زینب نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر منصور اور ان کی بیوی کئی مدت سے یہاں مقیم ہیں' خوبصورت مکان میں رہتے ہیں۔ پاکستان میں بھی خاصی پراپرٹی ہے۔ جب عمران امریکا آیا تو ڈاکٹر منصور نے اُس کی خاصی مدد کی تھی۔

غزالہ کو ان کا کشادہ حسین مکان' قیمتی کارپٹ اور قیمتی قالین' دیواروں پر آویزاں Oil painting اچھی لگیں۔ مقامی ریسٹورنٹ نے کھانے کا اہتمام کیا تھا۔ باہر لان کے کونے میں سیخ کباب بن رہے تھے اور اندر پلاؤ کی خوشبو اشتہا میں اضافہ کر رہی تھی۔ پرتکلف کھانے کے بعد تین منزلہ کیک کاٹا گیا۔ سب نے خوش دلی سے Happy Birthday گایا۔ چائے اور کیک کے ساتھ ہی بل کھاتی دھنوں کے تحت Trio نے پاکستانی نغمے بجانے شروع کر دیئے۔ تین لڑکیاں اٹھ کر ڈانس کرنے لگیں۔ ان کی دیکھا دیکھی اور عورتیں بھی ڈانس میں شریک ہو گئیں۔ مرد اوپر کمرے میں جام بلوریں تھامے قہقہے لگا رہے تھے۔ اچانک غزالہ کو محسوس ہوا کہ یہ امریکا ہے جسے وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر منصور نے ہولے سے غزالہ کے کندھے کو چھوتے ہوئے کہا ''آپ ابھی نئی نئی لگتی ہیں۔ Loosen up۔ ڈانس کیجئے۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے آپ اجنبیت محسوس نہ کریں۔'' غزالہ نے شرما کر ان کا شکریہ ادا کیا ان کے گھر اور ان کی دعوت کی بہت تعریف کی۔ ڈاکٹر منصور کہنے لگے ''دیکھیں اب آپ سے ملاقات ہو گئی ہے اب یہ تعلق استوار رہنا چاہیے۔ میں آپ کو ہر پارٹی میں مدعو کروں گا اور آپ مجھے شرف بخشیں گی۔'' ڈاکٹر منصور کی لفاظی پر غزالہ اپنی ہنسی پر قابو نہ پا سکی۔ ڈاکٹر منصور قدرے خفیف ہوئے لیکن جلد ہی سنبھل کر کہنے لگے ''میں نے اسلامک سنٹر کا سکول نہیں دیکھا..... میں آپ سے ملنے آؤں گا۔''

ایک ہفتہ بعد ڈاکٹر منصور سکول کے لنچ کے وقفے سے صرف چند منٹ پہلے آئے۔ دفتر میں سٹاف سے ملاقات کی سرسری طور پر غزالہ کا کلاس

روم دیکھا کہنے لگے "کیا میں آپ کو لنچ پیش کر سکتا ہوں؟" غزالہ کو حیرت ہوئی
"میں لنچ ساتھ لے کر آتی ہوں۔"

"اوہو.... وہ تو روز ہی be ہے۔ آج ہمارا ان چوائس قبول کر لیں۔" ڈاکٹر منصور نے کار کا دروازہ کھولا اور غزالہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"آپ کو کس قسم کے کھانے پسند ہیں" ڈاکٹر منصور نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "پکے ہوئے" غزالہ نے منصور کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ منصور نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ "جواب نہیں آپ کا اچھا وضاحت کرتا ہوں۔ چائنیز، پاکستانی، میکسیکن یا امریکی "Meat and Potatos"۔ غزالہ نے جواب نہ دیا وہ دھیرے دھیرے مسکراتی رہی۔ "چلیں آج آپ کو میکسیکن کھانا کھلائیں وہ ذرا کرارے ہوتے ہیں۔" ریسٹورنٹ میکسیکن Decor سے مزین تھا۔ ڈائننگ روم کے عین وسط میں فوارہ نصب تھا۔ بھاری سمبریرو اور ڈھیلی واسکٹوں میں ملبوس wandering guitarist اونچے اونچے سروں میں ہسپانوی گیت گا رہے تھے۔ ڈاکٹر منصور نے mix plate کا آرڈر دیا۔ جب ویٹرس کھانا لے کر آئی تو ڈاکٹر منصور نے کہا "آپ یہ بتائیں کہ یہ کیا کیا ہے؟" ویٹرس نے خوش دلی سے کھانوں کی مختصر تفصیل بتائی۔ غزالہ احتیاط سے ٹھہر ٹھہر کر کھانا کھا رہی تھی۔ اور منصور اسے اپنے میکسیکو کے سفر کی روداد سنا رہے تھے۔

کلاس روم کے دروازے سے جھانک کر ایک لڑکی نے کہا "مس غزالہ آپ کا فون ہے" فون پر ڈاکٹر منصور تھے۔ خیر خیریت پوچھنے کے بعد کہنے لگے "اس دن کا لنچ خوب رہا۔ سوچتا ہوں اسے دہرایا جائے۔"

"آپ اپنی بیوی کے ساتھ لنچ نہیں کرتے؟"

"نہیں وہ کالج میں ہوتی ہیں اور میں ادھر ادھر۔"

"دیکھئے یہ سلسلہ اچھا نہیں لگتا......"

"واہ جی واہ آپ بہت ہی ذہین ہیں یقین کریں فون کرنے سے پہلے میں بھی یہی سوچ رہا تھا میں معافی چاہتا ہوں......"

"نہیں معافی مانگ کر شرمندہ کر رہے ہیں۔ تو......"

"آپ کی بہت بہت مہربانی بندہ حقیر پھر جسارت کرے گا۔ خدا انکار نہ کیجئے۔"

غزالہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

"فون کرنے کا مقصد یہ تھا کہ میں نے Pharmaceutical کمپنی کے ڈائریکٹر سے بات کی ہے۔ وہ آپ کو کال کریں گے کہہ رہے تھے انٹرویو بہت ہی اچھا رہا اور میں ایک کانفرنس کے سلسلے میں فلوریڈا جا رہا ہوں کوئی ہفتہ بھر بعد آنے کا امکان ہے۔ واپس آکر آپ سے رابطہ کروں گا۔"

اس شام جب گلزار گھر آیا تو اس کی بغل میں موٹی سی فائل تھی۔ کہنے لگا مجھے 90 days کے لئے ایجوکیشنل ٹریننگ کے لئے شکاگو بھجوایا جا رہا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ آپ بھی ساتھ جا سکیں لیکن ہماری کروڑوں کی کمپنی ہمیشہ مزید اخراجات کے لئے انکاری رہی۔ غزالہ کو گلزار کے جانے کی خوشی بھی ہوئی اس کے ساتھ نہ جانے کا دکھ بھی۔ اس نے شکاگو کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ دیکھنا چاہتی تھی۔ گلزار تین ماہ کے لئے چلا گیا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وقت مکمل طور پر اس کے تسلط میں آگیا ہے اور دوسرے دن Pharmaceutical کمپنی سے فون آیا اور غزالہ کو ایپلیکیشن جاب کی مبارک دی گئی۔ غزالہ نے جھٹ زینب کو فون کیا۔ اسے خوشخبری سنائی اور کہا "دیکھو دیدی گلزار تین مہینے کے لئے چلا گیا ہے۔ مجھے جاب مل گئی ہے چلو چل کر اودھم مچائیں میری اچھی دیدی....." لیکن زینب اللہ میاں کی گائے کی طرح اپنے استھان پر براجمان رہی۔ "نہیں چلی آؤ۔ میں چائے بناتی ہوں۔"

ڈاکٹر منصور نے کانفرنس سے لوٹنے کے بعد غزالہ کو فون کیا۔ اسے جاب کی مبارک دی اور گلزار کے ٹریننگ کے لئے شکاگو جانے پر تسلی کا اظہار کیا۔ پھر کہنے لگے "آپ ان کے ساتھ کیوں نہیں گئیں؟"

"کوشش تو کی تھی لیکن کمپنی ایسی کنجوس......"

"اوہو۔ ٹکٹ کی بات تھی بندوبست کیا جا سکتا تھا" غزالہ نے جواب نہ دیا۔

"یہ تو celebration کی بات ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے میرا ایک پسندیدہ ریسٹورنٹ ہے سینٹا مانیکا میں وہ غضب کی Lamb chopes بناتے ہیں اور گریک سلاد......"

"آپ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر آئیں گے؟"

"نہیں وہ نہ آسکیں گی بچوں کا مسئلہ ہے ان کی اپنی سکول کی activities ہیں...... لیکن یہ میرا معاملہ ہے آپ کا مسئلہ نہیں۔" غزالہ نے ڈاکٹر منصور کی چرب زبانی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

کھانا کھانے کے بعد وہ سینٹا مانیکا Pier کی طرف چلے گئے۔ جہاں کارنیوال کا سا سماں رہتا ہے۔ چلتے چلتے ڈاکٹر منصور نے غزالہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"جب آپ کے ساتھ be ہوں تو یہ دنیا مختلف نظر آنے لگتی ہے....."

غزالہ نے آنکھ بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حزن تھا۔ غزالہ نے سوچا وہ اپنی ازدواجی زندگی سے ناخوش ہے۔ شاید ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ لیکن کچھ نہ کہا اور اپنا ہاتھ چھڑانے کی

کوشش کرنے لگی لیکن منصور کی گرفت اس کے ہاتھ پر مضبوط ہو گئی۔ غزالہ نے اپنا ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ بپھرا ہوا سمندر pier کے ستونوں سے سر پٹکتا رہا۔ چاند ایک بادل کے حجاب سے نکل کر دوسرے حجاب کی طرف سفر کرتا رہا۔ گرم سانسوں کا اژدھام ٹھنڈی نمکین ہوا میں تحلیل ہو رہا۔ موسیقی کا شور Farries wheel کا متوازن اتار چڑھاؤ، رات کی انگڑائیاں بار بار ٹوٹتی رہیں۔

اس رات کے بعد ڈاکٹر منصور غزالہ کی چھٹی ہوتے ہی اس کے دفتر پہنچ جاتے۔ ایک شام وہ غزالہ کو لے کر سیدھے ڈرائیونگ سکول لے گئے اور اسے انسٹرکٹر کے حوالے کر کے خود ہسپتال چلے گئے۔ منصور نے کہا تھا "اس دنیا میں پہیوں کے بغیر جینا محال ہے۔" غزالہ نے بھی وقت نکال کر ان میں دو دو کلاسیں لینا شروع کر دیں۔ اور وہ جلد ہی لاس اینجلس کی چل تھل سڑکوں کے اژدھام کا حصہ بن گئی۔

☆

غزالہ سفید باتھ روب میں لپٹی Hyat Regency Resort کی دسویں منزل پر کھڑکی میں کھڑی سمندر کے تھپیڑوں بھرے سینے کو دیکھتے ہوئے ملائم آواز میں بولی "اگلے ماہ گلزار آ رہے ہیں۔"

"تو انہیں سرپرائز دیں۔ کار لے کر ائرپورٹ چلی جائیں۔"

غزالہ پھر کر پلٹی اور چیخ کر "آپ نے صرف یہی کہا تھا...... آپ" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دوسرے دن وہ کام پر بھی نہ گئی۔ سارا دن روتی رہی۔ فون بجتا رہا لیکن اس نے جواب نہ دیا۔ شام دروازے کی گھنٹی زور سے بجی، اس نے سوچا زینب ہو گی۔ لیکن جب دروازہ کھولا تو ڈاکٹر منصور زرد گلاب کا Bouquet لئے کھڑے تھے۔ "کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟" غزالہ نے جواب نہ دیا دروازے سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس شام ڈاکٹر منصور نے اپنا دل کھول کر غزالہ کے قدموں میں رکھ دیا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہے تھے۔ غزالہ کے قدموں میں بیٹھ کر معافیاں مانگ رہے تھے۔ غزالہ کا دل پسیج گیا۔ اسے منصور کے آنسوؤں میں صداقت کی جھلکیاں دکھائی دینے لگیں۔ اس کی ہچکیوں میں کرب کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ غزالہ اپنی لانبی لانبی انگلیوں سے منصور کے بال سہلانے لگی۔ منصور نے غزالہ کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ اور پھر اس رات کے بعد شام کے Gourmet Dinners اور دور دراز Resorts کا سلسلہ پھر استوار ہو گیا۔

"منصور..... میں اب تصنع کی زندگی نہیں گزار سکتی۔ مجھے گلزار سے بالکل محبت نہیں، اور نہ ہی تھی۔ آپ سے جدا ہو کر میرے لئے خودکشی ہو گی، زینب میری بہن ہی نہیں میری رازدان سہیلی بھی تھی۔ اب ہم میں فاصلے بڑھ رہے ہیں۔ میں گلزار سے علیحدگی چاہتی ہوں" کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

منصور دھیمی آواز میں بولا "میں تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔"

غزالہ نے چیخ کر کہا "I don't want to be second to nothing" منصور سہم گیا۔ اس کے چہرے کا سارا خون نچڑ گیا۔ اس کی موٹی موٹی چمکدار آنکھیں ماند پڑ گئیں۔ وہ سکتے کے عالم میں چھت کو گھورتا رہا۔

غزالہ نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ گلزار کے ساتھ نہ رہے گی۔ جب اس نے یہ خبر زینب کو سنائی تو زینب کو غش آنے لگے۔ اس نے رو رو کر غزالہ کی منتیں کیں، اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ امی یہ خبر سن کر جان دے دیں گی۔ لیکن غزالہ اپنے فیصلے پر اٹل رہی۔

غزالہ نے منصور کے ساتھ مل کر گلزار سے علیحدگی کا بندوبست کرنا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر منصور نے century city میں اپارٹمنٹ کا بندوبست کر دیا جو غزالہ کے دفتر کے قریب تھا۔ اسی شام زینب کا فون آیا وہ فون پر بے تحاشا رو رہی تھی۔ اس نے ہچکیوں کے درمیان غزالہ کو بتایا کہ امی فوت ہو گئی ہیں۔ غزالہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اور عمران پاکستان جا رہے ہیں۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ غزالہ جواب دینے سے قاصر تھی۔ غزالہ نے منصور کو اس کے cell پر فون کیا۔ منصور بوکھلایا ہوا آیا۔ غزالہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر روتی رہی۔ منصور نے ملائم لہجے میں کہا "ذرا معلوم کرو وہ کونسی ائرلائن اور کونسی فلائٹ پر جا رہے ہیں میں ٹکٹ کا بندوبست کرتا ہوں۔ اور کچھ نہ سنتا۔"

دونوں بہنیں بین کرتی سیدھا قبرستان گئیں۔ ختم قرآن، خیرات وغیرہ کے بعد جب حالات معمول پر آئے تو غزالہ یونیورسٹی جانے کے بہانے گھر سے نکل آئی۔ لاس اینجلس سے روانگی سے قبل منصور نے غزالہ کو اپنے پراپرٹی منیجر کا پتا اور فون نمبر دیا تھا اور تاکید کی تھی کہ وہ حیات آباد والا مکان دیکھ کر آئے۔ جو خالی پڑا تھا جسے وہ کرائے پر نہیں لگانا چاہتا تھا۔ وہ منیجر کو ساتھ لے کر گئی۔ سیکٹر نمبر 6 میں پہاڑی بنگلہ نما سرخ چھت والا مکان بالکل تنہا کھڑا تھا۔ قریبی مکان کوئی دو سو گز کے فاصلے پر تھا۔ غزالہ نے بہ نظر غائر مکان کا معائنہ کیا۔ مکان میں ساری آسائشیں موجود تھیں۔ غزالہ عمران زینب صرف دس دن پاکستان میں رہے اور واپس آ گئے۔ ایک دن غزالہ نے گلزار سے کہا "آج رات ذرا جلدی آ جایئے آپ سے ضروری بات کرنا ہے۔" شام گلزار جلدی آ گیا۔ غزالہ نے کھانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ کھانا کھا کر وہ دونوں صوفے پر بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ غزالہ نے گلزار کی طرف دیکھے بغیر کہنا شروع کیا۔ "میں آپ سے بہت اہم بات کرنا چاہتی ہوں۔ ہماری شادی arrange marriage ہے..... نہ میں نے آپ کو دیکھا نہ آپ نے

مجھے دیکھا۔ یہ ضرورت تھی۔ اور ہم ضرورت کے تحت میاں بیوی بن گئے۔ گلزار اگر میں چاہوں بھی تو آپ کے ساتھ ساری زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم علیحدہ ہو جائیں۔" گلزار سکتے کے عالم میں غزالہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اور جواب دیے بغیر اٹھ کر بیڈروم کی طرف چلا گیا اور دھماکے سے دروازہ بند کر لیا۔ غزالہ صوفے پر بیٹھی روتی رہی۔ اسے گلزار پر رحم آ رہا تھا۔ اپنے آپ پر رحم آ رہا تھا۔ اپنی زندگی کی uncertainty پر رحم آ رہا تھا۔ اپنے فیصلے کی ناآسودگی پر رحم آ رہا تھا۔ اس کے چاروں اور اندھیرے گہرے ہو رہے تھے۔ گلزار اور غزالہ علیحدہ ہو گئے۔ اور زینب دھاڑیں مار مار کر روتی رہی۔

دن گزرتے گئے غزالہ نے اپنی کمپنی میں قدم جما لئے تھے۔ وہ خوش تھی۔ ایک دن زینب اور غزالہ کی مشترک دوست سعیدہ محمود نے ان کو اپنے خاوند کی سالگرہ پر بلایا۔ غزالہ پارٹی اور دوستوں میں مسرور تھی۔ اچانک ڈاکٹر منصور اور اس کی بیوی آئے۔ وہ سب سے ملے لیکن غزالہ ان سے کترا کر دوسری طرف جاتی رہی۔ کھانا کھلایا گیا۔ سعیدہ اور ارشد محمود نے اپنے تحائف کھولے سب کا شکریہ ادا کیا اور مہمان آہستہ آہستہ جانے لگے۔ غزالہ Patis کے دروازے کے پاس کھڑی زینب کا انتظار کر رہی تھی لیکن باتوں میں زینب ایسی گم تھی جیسے دوبارہ ملاقات کے امکانات نہ ہوں۔ اچانک اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر منصور کی بیوی تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"غزالہ تم ہو؟" اس نے درشتی سے کہا۔

"جی ہاں......" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تم وہ......تم...... Hollywood Boolevard کی وہ street walker ہو جو لوگوں کے گھروں میں آگ لگاتی پھر رہی ہو۔ میرے ہاتھوں تمہارا انجام اچھا نہ ہوگا۔" وہ نفرت سے بولی "منصور چلیں بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔"

ڈاکٹر منصور غزالہ کی موجودگی سے سراسر ناآشنا بیوی کے پیچھے پیچھے دروازے کے پیچھے روپوش ہو گیا۔ غزالہ پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ کھلی آنکھوں سے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے سر میں درد کی ٹیسیں ابھریں اس کا جی متلایا اور وہ چکرا کر قالین پر بکھر گئی۔

زینب کئی دن اس کے سرہانے بیٹھی اس کی تیمارداری کرتی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو اپنے اپارٹمنٹ میں آ گئی۔ اس پر ازلی تھکاوٹ مسلط تھی۔ نہ کھانے کو جی چاہتا تھا نہ ہی نیند آتی تھی۔ ایک طرح کی بے کلی نے اس کی رگ رگ کو جکڑ رکھا تھا۔ بیماری کے دوران اسے جتنے بھی رسالے کتابیں دی گئیں وہ ساتھ لے آئی تھی لیکن پڑھنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ البتہ اسے ن م۔ راشد کی نظم نے مسحور کر رکھا تھا وہ بار بار اسے پڑھتی:

آگ سے آزادی کا دلشادی کا نام
آگ پیدائش کا افزائش کا نام
آگ کے پھولوں میں نسرین کا، سمن، سنبل، شقیق و نسترن
آگ آرائش کا زیبائش کا نام
آگ وہ تقدیس دھل جاتے ہیں جس میں سب گناہ

☆

بالآخر ڈاکٹر منصور کا فون آیا جس کے لئے وہ ذہنی طور پر تیار تھی۔

"میں گاڑی میں ہوں' ہسپتال سے آ رہا ہوں۔ آپ سے ضروری بات کرنا ہے۔"

"اب باتوں میں کیا باقی رہ گیا ہے؟"

"میں آپ کی منت کرتا ہوں۔ تھوڑا سا وقت دے دیں۔"

"منصور میری بے چارگی اور بے سہارگی کا مزید مذاق مت اڑاؤ۔"

"میں آپ کو کیسے بتاؤں میرے دل میں آپ کے لئے کتنی عزت ہے۔"

"اور حقارت؟ Hollywood Boulevard کی street walker؟"

"خدارا ایسا نہ کہیں۔ میں آپ کے اپارٹمنٹ کے بالکل قریب پہنچ چکا ہوں۔"

غزالہ خاموش ہو گئی۔ اس کی کھلی آنکھوں سے آنسو خود بخود گرنے لگے۔ غزالہ صوفے پر لیٹی تھی منصور اس کے سامنے بیٹھا تھا "یہ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟ سنبھال جائے نہ کیجئے بدلے......خدا......"

"کسی بات کو جی نہیں چاہتا۔ ازلی تھکاوٹ۔ صبر آزما تھکاوٹ ہے۔"

میز پر prozac کی شیشی پڑی تھی۔ ڈاکٹر منصور سمجھ گیا کہ اسے depression کے دورے پڑ رہے ہیں۔ "چیک اپ کے لئے کب جا رہی ہیں؟"

"کل جا رہی ہوں پھر زینب کے ساتھ۔"

"دیکھیں......مجھ پر بھروسہ کریں۔ میں ڈاکٹر ہوں۔"

"ہوں......آپ ڈاکٹر ہیں......مرض دینے والے ڈاکٹر......"

"ایسا نہ سوچیں غزالہ خدارا مجھ پر بھروسہ کریں۔ مجھے معاف کر دیں۔"

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے زینب آنے والی ہے آپ تشریف لے جائیں۔ میرا اسلام آباد ٹوٹ رہا ہے۔"

زینب رات بھر غزالہ کے سرہانے بیٹھی رہی۔ اس کا جسم بخار کی حدت سے دہکتا رہا۔ زینب برف کی پٹیاں اس کے ماتھے پر رکھتی رہی۔ غزالہ بڑبڑاتی رہی۔ "آگ...... آگ...... زرتشت کی مقدس آگ......

"آگی دیوی......!" دیوی...... وہ جل جاتے ہیں جس میں سب گناہ!!"

غزالہ کا بخار اترا تو اسے چپ لگ گئی۔ کام سے آتے ہوئے سودے پر واز ہو جاتی۔ فون کر کے کھانا منگوا لیتی۔ طبیعت ذرا بحال ہوئی تو اس نے زینب اور عمران کو بلایا۔

"دیدی...... "اس نے عزم کے ساتھ کہنا شروع کیا "دیدی میں واپس پاکستان جانا چاہتی ہوں۔" عمران اور زینب ششدر اس کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ غزالہ کے فیصلے پتھر پر لکیر ہوتے ہیں۔

بعد میں اس نے منصور کو فون کیا اور اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ منصور نے بیزار کہا کہ میں بندوبست کر رہا ہوں کوئی صورت نکل آئے گی۔ تھوڑی سی مہلت دے دیں۔ لیکن غزالہ اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی۔

منصور غزالہ سے ملنے آیا۔ "آپ اپنا فیصلہ نہ بدلیں گی؟" غزالہ خاموش رہی۔ منصور نے بریف کیس کھول کر ایک فائل نکالی۔ "آپ کی خدمت میں ایک التجا ہے آخری التجا سمجھئے۔" غزالہ بدستور خاموش رہی۔ "پہلا انکار کر کے مجھے مزید اذیت نہ دیں" غزالہ منصور کو گھورتی رہی۔

"یہ حیات آباد والے گھر کی Power of attorney۔ یہ میں آپ کی نذر کرتا ہوں" منصور نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھا کر غزالہ کی طرف دیکھا۔ غزالہ کا چہرہ ردعمل سے عاری تھا۔

"منصور...... میں تو اپنی کشتیاں جلا کر جا رہی ہوں اور تم میری پاؤں میں نئی زنجیر پہنا رہے ہو؟"

"اسے زنجیر نہ سمجھئے غزالہ۔ یہ میری کتاہیوں کا ساتھی نامہ کہہ لیں۔" منصور کو محسوس ہو رہا تھا کہ غزالہ کا گلابی رنگ اتر چکا ہے اس کی آنکھیں بجھی گئی ہیں۔ اس کے چہرے پر شام اندھیرے منڈلا رہے ہیں۔ منصور نے گھڑی دیکھی "مجھے ہسپتال جانا ہے میں پھر آؤں گا۔"

غزالہ کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے منصور کی طرف دیکھ کر کہا۔ "Don't call me, I'll call you......!"

منصور چلا گیا اور غزالہ میز پر پڑی فائل کو گھورتی رہی۔

☆

ائرپورٹ پر غزالہ کو لینے کے لئے بھائی قدیر، بھابی بچے بھی موجود تھے۔ غزالہ عائشہ اور جبار کو دیکھ کر حیران ہوئی۔ "بھابی جان بچے کتنی جلدی بڑے ہو جاتے ہیں۔ جبار تو ماشااللہ میرے برابر ہو گیا ہے اور عائشہ بھی پیچھے نہیں۔"

دو ہفتے بھر گھر میں خوب گہما گہمی رہی۔ خاندان کے سارے لوگ غزالہ سے ملنے آئے۔ جب حالات معمول پر آگئے تو غزالہ نے شام کے کھانے کے بعد قدیر اور بھابی سے کہا "دیکھیں بچے بڑے ہو گئے ہیں میں نے عائشہ کے کمرے پر قبضہ کر رکھا ہے ان کو اپنی Privacy چاہیے اور مجھے بھی میں دو کمروں کے مکان کا بندوبست کر کے آئی ہوں۔ مکان حیات آباد میں فیز نمبر 6 میں ہے آپ میرے ساتھ چلیں۔ مکان کی صفائی کروا لی ہے اور اس کے بعد میں وہاں شفٹ ہو جاؤں گی۔"

بھائی اور بھابی نے بڑا اصرار کیا لیکن غزالہ کا فیصلہ قائم رہا اور مکان مرمت سے رہائش کے قابل ہونے لگا۔ فون بھی لگ گیا۔ گیس بھی لگ گئی۔ قدیر کی وساطت سے غزالہ نے چھوٹی سی جاپانی کار بھی خرید لی اور وہ حیات آباد میں شفٹ ہو گئی۔ چھوٹا سا پہاڑی بنگلہ نما مکان اسے اچھا لگا۔ اس نے کالج اور یونیورسٹی میں بہت سی درخواستیں بھی دے دیں۔ وہ سارا دن کسی نہ کسی کام یا دوڑ دھوپ میں مصروف رہتی لیکن شام کے اندھیرے اس پر گراں گزرتے۔ شامیں اداس ہوتی رہیں اور راتیں لمبی ہوتی رہیں۔ غزالہ نے ایک الجھا ہوا خط زینب کو لکھا۔

"دیدی...... یہ باتیں میں صرف آپ سے کر سکتی ہوں میں تو تلاش نگاراں کے لئے نکلی تھی۔ لیکن ان روشنیوں نے مجھے اندھا کر دیا۔ میں سرابوں میں بھٹکتی رہی...... میں نے ریت کو پانی سمجھ کر پی لیا اور اب میرا رواں رواں پتھر ہو چکا ہے......"

☆

اس رات ہندوکش پر خوب برف باری ہوئی۔ سارا شمال مغربی علاقہ سردی کی لپیٹ میں آ گیا۔ حیات آباد کے سارے گھروں میں آتش دان دہک اٹھے۔ لوگوں نے کمروں کے سارے دروازے اور کھڑکیاں مضبوطی سے بند کر لیں۔ شہر میں سکوت چھا گیا۔

دو بجے کے قریب شور بلند ہوا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ غزالہ کا گھر آگ کے تند و تیز شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ کسی نے فائر بریگیڈ کو فون کیا۔ لیکن فائر بریگیڈ کے پہنچتے پہنچتے مکان جل چکا تھا۔ دوسرے دن اخبار میں خبر آئی۔ "حیات آباد فیز نمبر 6 میں مکان نمبر 672 F/3 آگ لگنے کی وجہ سے مکمل طور پر جل گیا ہے لیکن کسی جانی نقصان کی اطلاع نہیں ملی۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔

یہ کیسی محبت

ڈاکٹر رینو بہل

میں اُسے پچھلے تیس سالوں سے جانتی ہوں۔ اُس کے ساتھ ایک انجانے، بنا نام رشتے میں خود کو میں نے باندھ رکھا ہے۔ اُس کی رگ رگ سے واقف ہو چکی ہوں۔ اُس نے مجھے بے انتہا پیار کیا مجھے پانا چاہا مگر میرے ضمیر نے مجھے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ میں اپنا گھر بسانے کی خاطر کسی اور کا گھر جلا اُجاڑ دوں۔ کسی کے آشیانے کو جلا کر میں اُس کی جھولی بکھرتی رہی۔ ہاں اتنا ضرور وعدہ کر لیا کہ یہ جسم اُس کے نام۔ اُس نے اپنا پیار نبھایا تو میں نے اپنا وعدہ۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی دوسرے مرد کو نہیں آنے دیا۔ میں نے اُس کا گھر بچایا مگر اپنا کبھی نہیں بسایا۔ میں نے اس کی اولاد سے اُن کے باپ کا سایا نہیں چھینا مگر خود کو ماں بننے کے دردوں سے محروم رکھا۔ وہ میرے پیار کو قربانی کہتا ہے مگر میں اسے صرف پیار اور پیار ہی کہتی ہوں۔

اُس نے اپنی شادی کو مجبوری کا نام دیا تھا۔ اُسے نبھایا بھی مگر ڈھلتی عمر کے ساتھ وہ مجبوری کب اُس کی ضرورت بن گئی میں سمجھ ہی نہیں پائی۔ وہ مجھ سے دور ہوتا تو ہمیشہ میرے بارے میں ہی سوچتا رہتا۔ مجھ سے ملنے کی لگن لگی رہتی کسی وجہ سے نہ مل پاتی تو بے چین ہو اُٹھتا مجھ سے جھگڑنے لگتا پھر اُسے شانت کرنا میرے لئے بہت مشکل ہو جاتا۔ میں کئی بار اُس کی کیفیت دیکھ کر اُسے چھیڑتی۔

"اب تو ایسی باتیں چھوڑ دو اب بڑھاپا دستک دے رہا ہے۔"

"میرا جسم بوڑھا ہوا ہے دل ابھی بھی جوان ہے ویسے ہی تمہیں چاہتا ہے جب تیس سال پہلے تم انیس کی تھی۔"

تقریباً دس بارہ سال پہلے کچھ روز کے لئے اُس کی بیوی اپنے مائیکے گئی تھی۔ مگر اُسے چار دن میں ہی واپس آنا پڑا تھا کیونکہ اُس کی طبیعت پیچھے سے خراب ہو گئی تھی۔ میں جب اُس کا حال معلوم کرنے اُس کے گھر گئی تو اُس کی بیوی نے مجھے زور دے کر بیٹھاتے ہوئے کہا تھا:

"اب تو میں نے فیصلہ کر لیا ہے انہیں اکیلا چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی دو دن کے لئے کیا گئی بیمار ہو گئے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ مجھے چھوڑ کر مت جانا مگر میں نے سنی ہی نہیں۔ اب تو توبہ کرتی ہوں۔"

میں خاموشی سے سنتی رہی کہ مجھے ایسا لگا کہ اپنے دل کو تسلی دے رہی ہے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اُس کے دل میں اُس کی زندگی میں میری کیا جگہ ہے۔ کچھ روز تو اس کی باتیں میرے ذہن میں گھومتی رہیں مگر میں نے کبھی اس بات کا ذکر اُس سے نہیں کیا۔ کرتی بھی کیوں؟ میرا رشتہ تو کسی بندھن کا محتاج نہیں تھا۔ میں نے کسی رسم سے نہیں صرف پیار سے اُسے باندھا تھا۔ کئی بار اُسے بیوی بچوں کے ساتھ دیکھ کر جلن بھی ہوتی مگر میں کسی کو دوش تو نہیں دے سکتی تھی کیونکہ زندگی اُس کے نام کرنے کا فیصلہ صرف میرا اور میرا ہی تھا۔ کسی نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔

اور آج میرے رشتے کی سچائی میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ کسی مجبوری کی وجہ سے اُس کی بیوی کو پھر مائیکے جانا پڑا۔ وہ گھر پر بالکل تنہا ہو گیا۔ دو دن تو ٹھیک گزرے مگر تیسرے دن ملا تو تھوڑا اُکھڑا ہوا تھا۔ چڑچڑا پن مزاج میں شامل ہو گیا تھا۔ میرا دل کہنے لگا تھا کہ وہ تنہائی سے گھبرا اُٹھا ہے۔ چار دن کی تنہائی اُس سے برداشت نہ ہوئی اور میں نے اتنی زندگی اپنی پوری جوانی تنہا گزار دی۔

"طبیعت خراب ہے کیا؟" میں نے پوچھ ہی لیا۔

"تھوڑی سی تلخی محسوس کر رہا ہوں طبیعت میں۔"

"وجہ؟"

"گھر کی دیواریں کھانے کو دوڑتی ہیں۔ اپنا سارا کام خود کرنا پڑتا ہے۔ نہ کھانے کا کوئی وقت ہے اور باہر کا کھانا اب ہضم نہیں ہوتا۔"

"اُسے فون کر کے واپس بلا لو۔"

"اُسے معلوم ہے مجھے اکیلے رہنے کی عادت نہیں پھر وہ خود نہیں سوچ سکتی؟"

میں چپ چاپ اُس کی بے چینی دیکھتی رہی۔ آج وہ میرے پاس تو تھا مگر مجھ سے کوسوں دور۔ آج وہ مجھے نہیں بلکہ میرے پاس بیٹھ کر اُسے یاد کر رہا تھا۔ میرے دل میں ٹیس سی اُٹھی۔ یہ کیسا پیار ہے مجھے وہ تب miss کرتا ہے جب وہ اُس کے پاس ہوتی ہے.... وہ تو اُس کی مجبوری تھی مگر اتنے سالوں میں اُسے اُس کی عادت ہو گئی ہے۔

اُس کی زندگی میں میری کیا اہمیت ہے مجھے نہیں معلوم۔ جو باتیں میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی تھی آج خود اُن پر شک کرنے لگی ہوں۔ معلوم نہیں یہ بے نام بے انجام کیسا رشتہ ہے۔

میں نے سنا ہی نہیں تھا بلکہ محسوس بھی کیا تھا کہ انسان جس شخص کو دل و جان سے چاہتا ہے اُسے اپنی ملکیت سمجھنے لگتا ہے اُسے کسی کے ساتھ بانٹنا نہیں چاہتا اُسے لے کر کافی possessive ہو جاتا ہے۔ میں خود بھی تو ایسی ہی تھی مگر وقت اور عمر کے ساتھ نہ جانے یہ عادت کب بدل گئی۔

اُس کی بے چینی اور اُداسی دیکھ کر یہ سچائی تو میرے سامنے آ ہی گئی کہ وہ میرے بغیر تو زندہ رہ سکتا ہے مگر اُس سے جدا ہو کر جی نہیں پائے گا۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی اور میرے دل سے یہ دعا نکل کر "بھگوان اُن دونوں کی جوڑی بنائے رکھنا۔ انہیں ہمیشہ خوش رکھنا اور اُن کے حصے کے غم بھی مجھے عطا کر دینا۔"

خزاں کے سنگ سنگ

ڈاکٹر عمران مشتاق

جب اُس نے پہلی بار انہیں رنگے ہاتھوں پکڑا تو وہ رنگوں کی برسات میں نہائے ہوئے تھے اور ان کے بیچ اُس کی نظروں کے سامنے ایک ہی رنگ سرخی بن کے پھیلنے لگا تھا۔ حیرت سے گنگ و دخت ہوتے اعصاب کو پتھر ہوتا دیکھتا گیا۔ حیرانگی سے ششدر لمحے نے سامنے والوں کو بھی پتھر کے مجسموں کی صورت دیکھا۔ کئی پل بیتر سے لمحے چپ کی حکمرانی سے مغلوب ہوتے رہے۔ کوئی قوت بننے کی امید میں منتظر تھی منتظر رہی۔ اور بکھرے بالوں والے لڑکے کے بظاہر سوئے لبوں نے انتظار کی چادر تان رکھی تھی۔

"تو تمہیں پتہ چل ہی گیا۔"

اُس سے کچھ بولا نہ گیا۔ کیا کہتا کیسے کہتا۔ آبگینہ اعتبار ٹوٹ چکا تھا۔ چور کرنے والی اگر عزیز ہستیاں ہی ہوں تو پھر کوئی کیا کہے۔

"کیا کوئی کچھ کہہ سکتا ہے؟"

"یہ تو ہونا ہی تھا۔ منطقی طور پہ یوں ہی ہوا کرتا ہے۔" دو ساکت و جامد مردوں کے درمیان منتشر حوصلے کو اعتماد کی ہچکی دیتی آواز کے ساتھ خوشنما بھنورا مڑ گیا۔

اُسے منطق کی سمجھ کبھی بھی نہ آ سکی تھی۔ آج شاید آ رہی تھی۔ آنسو اور آنے کی توقع بند ہو چکی تھی۔ اُس نے پہلو میں لٹکتا پتھر ہوا دایاں ہاتھ اُٹھانا چاہا۔ وہ ہاتھ جسے اُس کی کسی بھی صورت پیش آنے کی صورت میں خنجر تھامنا تھا چاقو چلانا تھا۔ پستول کا گھوڑا یکدم گھما دینا تھا معمولی جنبش سے بھی محروم تھا۔

"میری مرضی کے تابع اب کچھ بھی تو نہیں رہا۔ نوجوان بھتیجا، جوان بیوی حتیٰ کہ میرے جسمانی اعضا ہوا اعمال بھی......" میں ایک سوچ تھی جو پتھر ہونے سے بچ رہی تھی۔ "چچا مجھے...... معا...ف" وہ شرمندہ اور جھکی جھکی نظروں سے کہہ رہا تھا۔ "معاف...... کر دیں...... میں آپ کو...... د...... دکھ...... نہیں...... دینا...... چاہتا...... تھا...."

"دکھ تو ایک چھوٹا بہت ہی ننھا سا لفظ ہے۔ اور وہ اپنی ہوس بھرے عمل کے بوجھ کو ایک ننھے سے لفظ میں سمو کر آسانی سے اپنی ندامت اتار پھینکنا چاہتا ہے کیونکہ جانتا ہے کہ میں اُسے بچوں کی طرح عزیز رکھتا ہوں۔ ماں باپ کی وفات کے بعد وہ تب ننھے سے وجود کو میں نے بڑی محبت سے سینے سے لگایا تھا وہی سینہ اُس نے چھلنی کر ڈالا ہے۔ بے اعتباری کی بھاری چٹان سے پیس کر رکھ دیا ہے اور کہتا ہے مجھے دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔" غم و اندوہ کی تیز لہر سارے وجود کو کاٹتے گزر گئی۔ "ابھی امریکہ گیا نہیں اور انہی کی زبان بولنے لگا ہے۔ ہر لفظ کی تشریح اپنی مرضی سے کرو۔ اس طرح سے define کرو کہ اپنا مقصد حل ہو جائے۔ دنیا جائے بھاڑ میں۔" دنیا تو بھاڑ میں جا رہی تھی اور اس کا جی چاہا کہ ان دونوں کو بھی اُس میں جھونک ڈالے۔ وہ اتنا ہی کر سکا کہ اپنا رخ تبدیل کر کے لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے سے باہر نکل جائے۔ اُس کے پیچھے ابھری اطمینان بھری سانس اُس کے سیسہ پلائے کانوں میں سے رخنہ تلاش کر کے سوتے جاگتے ذہن پہ تازیانے کی صورت جا پڑی۔ "انگریز شاید ٹھیک ہی کہتا ہے Please knock the door before entering اس طرح جانے انجانے دکھ سے تکلیف سے انسان بچ جاتا ہے اور بھرم رہ جاتا ہے۔"

لاشعوری طور پہ پچھلے دو سال سے وہ ایسے ہی کسی "حادثے" کا منتظر تھا۔ خوشبو رنگ بالوں والی حسینہ سے اُس کی شادی دو برس پہلے ہوئی تو وہ اپنی قسمت پہ نازاں تھا کہ مردانگی کی بجھتی لو کو بھڑکانے کے شعلے جلانے والی آ گئی۔ پہلی شادی کی تلخ یادوں نے اُسے صنفِ مخالف سے متنفر سا کر دیا تھا۔ جب پچیس سالہ حسینہ (اُس کا نام رکھنے والوں کی دور اندیشی کا تو وہ قائل ہو گیا تھا) حسن کی بجلیاں گراتی اُس کی طرف بڑھی تو وہ سہم کے دبک گیا تھا۔ التفات کے جواب میں اُس نے بے رخی اور کھردرے پن کے خول میں پناہ ڈھونڈی تھی۔ "وہ آئی اور چھا گئی" کے یوں سارے خول ٹوٹ کے بکھری ریت ایسے ہو گئے۔ "مجھ بڈھے میں آخر کیا رکھا ہے کہ ایک حسین اور طرح دار لڑکی مجھ پر ریجھ جائے۔ یقیناً میری دولت کے پیچھے ہوگی۔" اُس نے دور بھاگنے کا جواز ڈھونڈ لیا تھا مگر جب وہ ساڑھے تین روپے حق مہر کے عوض اُس کے عقدِ ثانی میں آنے پہ تیار ہو گئی تو اُسے پہلے سے "Yes, Yes" کہتے دل کے سامنے جھکنا پڑا اور ذہن کا کمزور سا احتجاج کہیں کھو گیا۔

پہلی بیوی نے جب طلاق مانگی تھی تو اُس نے لمحہ بھر کا بھی تردد نہیں کیا تھا۔ بیس سال کی رفاقت میں وہ خوشی کے ایک لمحے کو ترس گیا تھا۔ اولاد نہ ہونے کا غم دل کا چھالا ہی بن جاتا اگر ننھا اشعر اُس کے بڑے بھائی کی نشانی اُس کی گود میں نہ آ جاتا۔ وہ بیوی کے سخت رویے کی وجہ سے اُس سے کافی دور رہتا تھا مگر اشعر کے لئے اُس کی نفرت شور و غوغا اور انکار کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس نے پرورش کے لئے ایک گورنس کا انتظام کر دیا۔ بیوی نے کچھ عرصے بعد

مفاہمت کر لی کیونکہ اُس کی پرورش کی ذمہ داری میں اُس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ جلد ہی "عورت کی امتا" سے مغلوب ہو کے وہ شعر کو گلے لگا لے گی۔ جب ایسا نہ ہوا تو اُسے پتہ چل گیا کہ خدا نے کیوں اُسے اولاد سے نہیں نوازا۔ "بانجھ عورتوں سے بھی بھلا کوئی فیض یاب ہوا ہے۔"

دوسری مرتبہ جب اُس نے انہیں دنیا و مافیہا سے دور رنگوں میں ڈوبے پایا تو دروازے کی جھری کو ہی کواڑ بنانا ضروری جانا اور یوں "رنگ میں بھنگ" ڈالنے کے گناہ سے بچ گیا۔ اُسے بڑھاپا تیزی سے اپنی سمت لپکتا محسوس ہوا جسے وہ اپنے دہشت زدہ ہاتھوں سے پرے ہٹانے کی بے سود کوشش کرنے لگا۔

ایک دن وہ حسینہ سے پوچھنے لگا کہ "کبھی اُسے چوٹ لگی ہے؟"

"یہ بھلا کیا سوال ہے۔ سبھی کو چوٹ لگتی ہے مجھے بھی کئی بار لگی ہے۔" اُس کی حسین مسکان میں چھپا کرب کا زہر اُسے بطرح ڈسنے لگا۔

"کبھی تم نے چوٹ کھائی ہے؟"

"یہ آج تم کیسے سوال کر رہے ہو؟ چوٹ کھانا اور چوٹ لگنا ایک ہی تو بات ہے کوئی خاص فرق تو نہیں۔" وہ کچھ حیران ضرور ہوئی تھی۔

"فرق ہے بہت ہی خاص فرق" وہ زور دیتے ہوئے بولا "چوٹ تو سبھی کو لگتی ہے مگر چوٹ کھاتا کوئی کوئی ہے اِس فرق کو شاید تم نہ سمجھ سکو۔"

وہ سمجھنا بھی نہیں چاہتی تھی اس لئے اٹھ کے چل دی۔ غصے سے اُس کی مٹھیاں بھنچ گئیں آنکھیں شعلے برسانے لگیں اور زبان کوڑے کی طرح کڑکی۔ "ایک دن میں یا شاید وقت تمہیں ایسی چوٹ دے سکتا کہ تم ساری زندگی بھلا نہ سکو گی۔ سُن رکھو کانٹوں کی فصل کاٹتے اپنا ہی جسم لہولہان ہو جاتا ہے۔"

اب وہ اس کے ساتھ کم ہی وقت گزارتی تھی۔ کبھی کبھار وہ خود پہ اپنی کمزوری پہ جھلا اُٹھتا۔ "وہ اُس پہ ہاتھ کیوں نہیں اٹھاتا؟ اُسے ذلیل کر کے گھر سے نکالنا مشکل تو نہیں۔ دہشت گردی کے اِس دور میں چند ہزار روپے میں کوئی بھی اُس کی مشکل آسان کر سکتا ہے شعر کو بے عزت کر کے بے گھر کرنا بھی آسان ہے تو پھر آخر کیوں......" اِس کیوں کا جواب شاید اس کے پاس نہیں تھا یا تھا تو اُس سے صرفِ نظر کرنے پہ وہ مجبور تھا۔

"غیرت کے نام پہ قتل کرنے والے قانون کی نظر میں تو مجرم ہوتے ہیں پر معاشرہ ابھی تک اپنی اقدار کی حفاظت میں اُن کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہے تو پھر آخر کیا شے ہے جو اُسے روک لیتی ہے ہاتھ تھام تھام لیتی ہے کیا بزدلی...... نہیں...... تو پھر کہ جگ ہنسائی کا خوف......"

شاید یہی خوف تھا اُس دن اُس کے ذہن کی گرہ آپ ہی کھل گئی۔

"اُسے اِس بوڑھے معاشرے پہ غصہ آنے لگا جو بات کا بتنگڑ بنانے میں لاجواب مہارت رکھتا ہے۔ بوڑھے آدمی کا کسی کنواری نوجوان دوشیزہ سے شادی ایسا جرم سمجھی جاتی ہے جس کی سزا اقربا عزیز و اقارب کے ساتھ ساتھ معاشرہ بھی برابر دیتے رہتے ہیں۔ اگر وہ غیرت میں آ کے بدچلن بیوی کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا تو بھی وہ خود ہی قصوروار کہلاتا کیونکہ وہ تو "بیچاری معصوم" تھی۔ اُس نے لمبی سانس لی "تو یہ معاشرے کا خوف تھا جس نے اُس کے ہاتھ باندھ دیئے تھے۔" اُسے یہ جان کے خوشی ہوئی تھی کہ "اُس کی رگوں میں بہتا خون ابھی بھی اُبل سکتا ہے وہ بزدل نہیں ہے کبھی نہ تھا آج شاید شرافت کا دوسرا نام بزدلی ہی ہے۔" یہ ایسا اطمینان تھا جو اُسے مہینوں کی ذہنی کشمکش کے بعد نصیب ہوا تھا۔

☆

اخروٹ رنگ بال مٹی مٹی ہو رہے تھے۔ طویل سیاہ سڑک دور دور تک ویران تھی۔ زرد پتوں کا ہجوم تھا جو ہوا کے شور میں اپنی آواز شامل کرتا گولے کی صورت اُس کے سامنے ناچنے لگا۔ برسوں سے کھڑے اُداس شجر سبز سے کا پیرہن اُتار چکے تھے۔ خزاں رسیدہ درد بھرا موسم سنگ سنگ چلنے کو تیار تھا۔ اُس کی مرضی جانے بنا اُسے راہ کا ساتھی چن چکا تھا۔ نرم و نازک سرخ غلاف سے ڈھکا تکیہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ نہ جانے وہ اُسے کیوں اٹھا لائی تھی۔ کپڑے کے نرم پروں سے بنا تکیہ اٹھانے کے لئے جھکنے کے لئے اُسے شعوری کوشش کرنا پڑی۔ یہ وہ تکیہ تھا جس پہ سر رکھتے ہی وہ اُس کے خوشنما سر کے گداز سے بوجھ سے دب جاتا اور دھنستا چلا جاتا۔ آج وہ ساری نرمی اور گداز کہیں رخصت ہو چکا تھا اُسے لگا جیسے اُس نے خطرناک شے ہاتھوں میں دبوچ رکھی ہو۔ جو کسی بھی لمحے آ کر جھپٹ لے گی لہولہان کر ڈالے گی۔ اُس نے گھبرا کے تکیہ چھوڑ دیا اور ویران سڑک پہ دوڑتی چلی گئی۔ آوازوں کا ہجوم اُس کے تعاقب میں تھا ہوا کا شور تھا۔ خزاں کا زور تھا اور اس کی سماعت کو چھیلتے شعر کے کٹیلے جملے۔ "چچا نے ساری جائیداد میرے نام کر دی ہے جب اس میں تمہارا کوئی حصہ نہیں اور یہ سب کچھ مجھے اِس شرط پہ ملا ہے کہ تم سے کبھی بھی کوئی تعلق نہ رکھوں گا۔ اور میں کوئی بیوقوف تو نہیں کہ اس عالیشان جائیداد سے محروم ہو جاؤں۔ بوڑھے نے مجھے میری "بدترین حرکتوں" کے باوجود اپنی وراثت سے بے دخل نہیں کیا۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ بوڑھا عظیم تھا۔ اب تو چاہے کوئی زرد بالوں والی ہو یا سرخ بالوں والی یا سنہرے روپہلے جسم سے سجی سبھی میری دسترس میں ہیں۔ بوڑھے کی شرط ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں...... ایسے......"

لمحوں کی گرفت

انجم جاوید

وہ رات ہر اعتبار سے گزرنے والی دوسری راتوں سے مختلف تھی اس رات شدید بارش بھی ہوئی تھی اور اندھیرا بھی غضب کا چھایا ہوا تھا اس سناٹے اور خوف بھری رات میں وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا لوگوں کی نظروں سے بچتا بچاتا چلا جا رہا تھا اچانک اسے ایک کوٹھری نظر آئی اسے اس قدر سرد موسم میں حرارت کی طلب تھی سو وہ بے جھجک اس کوٹھری میں چلا گیا ہلکی ہلکی روشنی میں کمبل میں لپٹا وجود اسے نظر آیا وہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا کمرے کے اندر بہت ہلکی آنچ کے ساتھ انگیٹھی سلگ رہی تھی اس نے چپکے سے اپنے وجود کو دوسرے وجود کے ساتھ کمبل میں کر دیا اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اس نے زبان سے موسم کی حدت محسوس کرنے کی کوشش کی اچانک ایک آواز ابھری

پاگل کہیں کا.... آ گئے ہو تم

ہاں.... اجنبی کی کپکپاتی ہوئی آواز گونجی

تو پھر تم گئے کیوں تھے؟ دوسری آواز ابھری.... کمرے میں خاموشی رہی.... اچانک کمبل میں ہلچل سی ہوئی اور ایک وجود اٹھ کر بیٹھ گیا بجلی تپش میں صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے اور عورت بھی ایسی کہ جس پر فرشتے بھی سجدہ ریز ہو کر کہہ اٹھیں "سبحان تیری قدرت"

تو نے مری بات کا جواب نہیں دیا جوگی! وہ عورت ایک بار پھر بولی

دوسرے وجود نے سمٹ کر ایک طرف ہوتے ہوئے کہا میں دوغلا نہیں ہوں جوگن جی!

کیا مطلب ہے تمہارا؟

بات یہ ہے جوگن جی کہ عمر کی اور دوستی کی اتنی مسافتیں طے کرنے کے بعد اب بھی مجھے نہیں علم کہ قدرت نے ہمارے مابین ایسا کون سا روحانی تعلق پیدا کر دیا ہے کہ جسے لفظوں کا جامہ پہنایا ہی نہیں جا سکتا ہم اتنا کر ہیں لفظ ہمارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں مگر مجھے وہ الفاظ ڈھونڈنے سے نہیں مل رہے جس سے میں اس رشتے اور محبت کی وضاحت کر سکتا جو ہمارے مابین قدرت نے قائم کر دیا ہے میں ان الفاظ کی تلاش کے لئے کوہ ندا بھی گیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ میں طلسم میں گھر کر پتھر کا بن چکا تھا۔

تو پھر اتنی کٹھنائیاں سہنے کے بعد تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ جوگن نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

بات دراصل یہ ہے کہ کچھ رشتے ذاتی غرض سے ہٹ کر قربانی کے نظریے پر مرتب ہوتے ہیں سو جب میں کوہ ندا کی وادیوں میں محو سفر تھا اس وقت ایک شہزادہ گل بکاؤلی کے پاس آ چکا تھا جب میں سفر سے پلٹا تو ایک خوبصورت جھرنے کے کنارے پر میری شہزادی اس شہزادے کی گود میں سر رکھے اسے انتہا کی محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی مسکرا رہی تھی اسے خوش دیکھ کر میں اس سے اپنا لگاؤ بھول گیا اس کو پُر مسرت دیکھ کر میں مسرت مور کی طرح ناچ اٹھا اور پھر مری نگاہ مرے پاؤں پر پڑ گئی اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پھر ...پھر کیا ہوا؟

پھر یہ ہوا کہ وہ دونوں ایک طویل سفر پر روانہ ہو گئے میری گل بکاؤلی کے چہرے پر ابھرنے والی کرنیں میری زندگی کا حاصل تھیں یاد رکھنا کہ دوستی خود غرضی کا نام نہیں ہے اس میں "میں اور میں" یا احساس سود و زیاں نہیں ہے بلکہ قربانی کا جذبہ ہر سطح پر انسان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اس نے میری دوستی کے سفر میں جہاں میرا بہت ساتھ دیا وہاں مجھے اس کی ذات سے کبھی کبھی شکایت بھی ہوئی ہم دونوں ایک دوسرے سے لڑتے بھی جھگڑتے بھی مگر یہ سب غبار عارضی ہوا کرتا تھا اور ہم پھر ایک ہو جایا کرتے تھے ہماری دوستی ہماری محبت بہت سے دیکھنے والوں کو ناگوار بہت ناگوار گزرتی تھی ایک دن اس کے شہزادے نے اس سے پوچھا گل بکاؤلی! یہ بیگانے دیس سے آنے والا اجنبی مسافر تمہیں جاناں کیوں کہتا ہے یہ حق کس نے دیا ہے؟

اس نے بڑے ناز سے جواب دیا یہ حق اسے میری دوستی نے دیا ہے اس دوستی نے جو کچے مکانوں سے لے کر محلے کی ٹوٹی پھوٹی گلیوں میں کھیلے جانے والے لڑکپن کے زمانے سے وابستہ ہے یہ حق اسے اس اعتماد نے دیا ہے جو ہمارے مابین ایک ایسی زنجیر کی صورت ہے جو نظر آتی بھی ہے اور نہیں بھی اور پھر جس رشتے پر خدائے بزرگ و برتر کی نظر ہو اسے دنیا کی کوئی طاقت توڑ ہی نہیں سکتی!

اچھا میں نے سنا ہے کہ وہ اجنبی دیس کا مسافر تم پہ مرتا ہے؟

تم جیلس ہو رہے ہو شہزادے گل نے بڑے غور سے اس کی آنکھوں میں مچلتے ہوئے شرارتی و شکی لمس کو دیکھتے ہوئے کہا تم سے کس نے کہہ دیا کہ وہ مجھ پہ مرتا ہے یہ قطعی غلط ہے وہ تو مجھے دیکھ دیکھ کر جیتا ہے اور ایک بات تم کو لو شاید اس بات پر تم یقین نہ کر سکو کہ ہمیں آگے پیچھے موت آئے گی

اور ہم اگلے جنم میں پا لگے جہاں ہم ایک ہوں گے

یہاں ایک سوال ابھرتا ہے جوگن نے جوگی کی بات کاٹ دی۔ سوال یہ ہے کہ اگر اجنبی مسافر اور گل کی دوستی کا یہی عالم تھا تو پھر ان دونوں میں اتنا فاصلہ کیوں رہا؟

ہاں! یہ سوال اہم ہے دیکھو جوگن جی! محبت اور دوستی دونوں بڑے عجیب سے رشتے ہیں ان میں انسان حد سے گزرنے کے بعد بھی محسوس کرتا ہے کہ کچھ کسر رہ گئی ہے یہ دنیا بڑی ظالم ہے انسان کو اخلاق' قواعد و ضوابط کے حوالوں سے اتنا جکڑ لیتی ہے کہ ان زنجیروں کو توڑنا کافی حد تک مشکل ہو جاتا ہے پھر یہ بھی کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے ایک ہاتھ سے آپ اپنے آپ کو یا کسی دوسرے شخص کو تھپڑ ہی مار سکتے ہیں پھر وفا کر کے وفا کا صلہ خود سے مانگتے رہنا؟؟ میں تو گل بکاؤلی اور شہزادے کی چاہت دیکھ دیکھ کر ہی سرشار ہو رہا تھا کہ اچانک باد صرصر کے جھونکے چلنا شروع ہو گئے اور اس نے نہ صرف گل بکاؤلی کے حسین و شگفتہ چہرے کو جھلسا دیا بلکہ آندھی کے جھونکے ختم ہوئے تو اس نے دیکھا کہ گل کا شہزادہ اس سے میلوں دور جا چکا ہے اور وہ تن تنہا ہے ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد بھی لا حاصل پن اس کا مقدر ٹھہرا۔

پھر.... پھر کیا ہوا؟

یہ خبریں پردیسی مسافر تک پہنچیں تو اس نے سندباد کی صورت لنگر اٹھائے اور عازم سفر ہوا اس نے کوشش کی کہ کسی طرح سے یہ فاصلہ جو شہزادے اور گل بکاؤلی کے درمیان پیدا ہو چکا ہے مٹ جائے پھر سے قربت ان کا مقدر بن جائے مگر اس کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔ آخر کار اسے ناکام ہی لوٹنا پڑا۔

کچھ دن گزرے کہ ایک دن یہ اجنبی پردیسی مسافر' جو تھکا تھکا مضمحل مضمحل سا زندگی کا سفر طے کر رہا تھا پیاس کی شدت نے اسے قریبی جھیل تک پہنچا دیا اس نے پانی پینے کے لئے ہاتھ کی اوک بنائی ہی تھی کہ ٹھٹھک گیا گل بکاؤلی کا پھول اس کے سامنے تیر رہا تھا اس نے ہاتھ بڑھائے اور اس کی حیرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ پھول تیزی سے لپکا اور اس کے ہاتھوں میں آ گیا یہ پھول اس سے کتنا گریزاں رہتا تھا آج تو اسے اس کرم نوازی پر رب کائنات کا اور پھول کا شکر گزار ہونا چاہیئے! اس نے دو رکعت نماز نفل شکرانہ پڑھنے کے بعد پھول کو چھو لیا۔ اس کے پورے بدن میں لمس کی تازگی وحدت دوڑ گئی تلاطم و نازک سا حرارت آمیز اتنا نشہ سے پُر پھول اس کی زندگی میں کہاں آیا تھا اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا اس نے پھول کو سونگھا۔ غضب کی خوشبو تھی جو زندگی بھر کے لئے اس کے جسم و روح میں سما گئی۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ پھول اس سے کچھ کہنا چاہ رہا ہے اس نے پھول کو سینے کے قریب کر لیا پھول کہہ رہا تھا کہ "اجنبی دیس کے مسافر! اب تم مری حرارت' مری خوشبو کے رازدار بن چکے ہو' مجھ سے وعدہ کرو کہ تم کبھی کسی اور پھول کی طرف نہیں دیکھو گے؟

اجنبی مسافر نے بھرپور بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے بتا سے میرے گل' مجھے تمہاری شرط قبول ہے تم سے وفا اور محبت میں تا عمر ثابت قدم رہوں گا مگر اس سفر میں اتنا یقین ضرور رکھنا کہ میں تو ان باتوں پر عمل کر کے دکھا بھی دوں گا مگر تم شاید ایسا نہ کر سکو میں نے کئی قصے سنے ہیں کہ آنکھ کی دسترس سے باہر ہوتے ہی پیار بھی اوجھل ہو جاتے ہیں ہم سائی کی آخر لیں کب کہاں اجنبیت کا پیرہن اوڑھ لیں یہ کس کو علم؟ پھر تم خود ہی سوچو میری خواہش کب ہو گی کہ میں تم سے دور رہ سکوں۔ مگر ایک بات تم بھی یاد رکھنا میں انتہا درجے کا حساس' جذباتی شخص ہوں مجھے چھوٹے منہ بھی کوئی اپنا کہہ دے میرا تن من دھن اس کے لئے وقف ہو کر رہ جاتا ہے اور اگر یہ علم ہو گیا کہ پیار محبت کے الفاظ صرف حروف کی بازی گری تھی عارضی رابطہ تھا تو مجھے بکھرنے کے لئے زیادہ وقت درکار نہیں ہو گا اور یقین مانو کہ مجھ جیسا انسان ممکن ہے بظاہر بڑا با حوصلہ نظر آتا ہو مگر اندر خانہ ریت کی طرح سے بکھرا بکھرا ہوتا ہے گرنے اور بکھرنے کے لئے کچھ زیادہ وقت نہیں لگتا لہٰذا یہ التجا ضرور تم سے کی جا سکتی ہے کہ اس وقت بھی جب تمہارے گرد کوئی حصار نہیں اور اس وقت بھی جب تمہارے گرد پھر سے ایک حصار قائم ہو جائے مجھے اپنی خوشبو سے محروم نہ رکھنا تم میرے لئے رات کی رانی نہ بن جانا!

رات کی رانی کی صورت؟ مگر تمہیں تو رات کی رانی کا پھول بہت پسند ہے؟

ہاں! واقعی مجھے رات کی رانی بےحد پسند ہے مگر اس کی ایک بات اچھی نہیں لگتی اپنی مرضی سے رات بھر خوشبو دیتی رہتی ہے اور دن کو اگر اس سے خوشبو کی طلب کرو تو خوشبو عنقا! یہ کیا کہ آپ اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کرتے پھریں یہ تو کوئی بات نہ ہوئی!

آج میں تم میں ایک بات اور محسوس کر رہی ہوں جوگی' جوگن نے کہا۔

کیا؟ جوگی نے استفہامیہ انداز سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا

آج موسم بھی خنک آلود ہے باہر بارش کھڑکیوں' دروازوں پر تحرک رہی ہے اور تم اپنے پسندیدہ موسم میں مجھ سے دور بیٹھے ہو کیا بات ہے؟ جوگن کا لہجہ شکوہ آلود تھا

اب شاید ایسا ہی ہو' جوگی نے بڑی گہری نظروں سے جوگن کو دیکھتے ہوئے کہا

کیوں.... آخر کیوں' جوگن تڑپ اٹھی

آج زندگی میں پہلی بار ایک ناگن نے ایسا ڈسا ہے کہ میں اب تک اس کے زہر میں ڈوبا ہوا ہوں۔

کیا کہا تمہیں تمہیں ناگن نے ڈس لیا؟ تم جو سانپوں کو قابو میں کرنے کے ماہر ہو اور سانپوں کا زہر بھی تمہارے جسم میں گھٹی کی صورت اتارا جا چکا ہے۔ جوگن کا لہجہ حیران کن تھا

ہاں ایسا ہو چکا ہے آج کی ہونے والی بارش سے پہلے کی بات ہے کہ میں بین لے کر سانپ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا کافی جدوجہد اور تلاش کرنے پر میری نظر ایک سانپ پر پڑی میں چونک اٹھا کلغی والا سانپ، جس کی جستجو مجھے گزشتہ بارہ سالوں سے سرگرداں رکھے ہوئے تھی نظر آ چکا تھا میں نے بین بجائی اور منتر پڑھنا شروع کر دیا کافی دیر کے بعد وہ ناگن مست ہونا شروع ہوئی میں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا ناگن نے انتہائی بے چینی، اضطراب کے ساتھ میرے بازو کے گرد کنڈلی مارنا شروع کر دیے تمہیں کیا بتاؤں جوگن جی! میں نے بہت سے سانپ پکڑے ہیں مگر اس کی کلغی سے نکلتی ہوئی روشنی کی کرن، اس کے جسم کا ملائم لمس اور اس کی گرفت نے مجھے عجیب سی کیفیت میں مبتلا کر دیا اور میں خود سے بیگانہ ہوتا چلا گیا میرے آبا و اجداد نے مجھے ہمیشہ یہ سبق سکھلایا ہے کہ کبھی بھی ایسے موقع پر سانپ سے آنکھیں نہ ملانا ورنہ تمہیں پتا نہیں ہو گا منتر پڑھنا بھول جاؤ گے اور وہ تمہیں با آسانی ڈس لے گا لیکن جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے ہوس کے لمس نے تماشہ دیا کہ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال ہی دیں اس کے بعد اتنا ہوش رہا کہ دو نوکیلی سوئیاں میرے چہرے پر اتری تھیں اور جب پھر ہوش آیا تو میں خالی ہاتھ تھا میں وہاں سے میں بھاگتا ہوا آ رہا ہوں اور اب بزرگوں کی اگلی پیش گوئی کا انتظار کر رہا ہوں انہوں نے کہا تھا کہ ایسے سانپ کے ڈسے ہوئے آدمی میں رفتہ رفتہ اس کی خوشبو اپنا حصار مکمل کر لیتی ہے اور وہ خود بھی اسی کے رنگ میں ڈھل کر سانپ بن جاتا ہے اور ہاں.... سنو غور کرو جوگن جی کیا تمہیں کوئی خوشبو محسوس ہو رہی ہے؟

جوگن نے ناک سکوڑی اور بے ساختہ بولی ہاں عجیب سی پیاری سی سوندھی خوشبو تمہارے وجود سے آ رہی ہے آج تم.... تم مجھے کچھ اور لگ رہے ہو اور تمہارے جسم کی یہ خوشبو مجھے مدہوش کر....

اس سے آگے جملہ جوگن مکمل نہ کر سکی اور یک دم چیخ مار کر بیرونی دروازے کی طرف بھاگ اٹھی وہاں رک کر اس نے دھڑکتے دل سے پلٹ کر دیکھا جہاں پہلے جوگی بیٹھا تھا وہاں اب ایک سفید دھاریوں والا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا پھر اس نے دیکھا کہ اس نے سرکنا شروع کر دیا جوگن نے دروازہ کھول دیا اور سانپ نما جوگی رینگتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

کی چوٹی پر ڈالی اور پھر کلائی پر چڑھنے لگا۔

وہ تقریباً آدھا راستہ سر کر چکا تھا کہ توازن برقرار نہ رکھ پایا اور لڑھک کر زمین پر آ رہا۔ گرتے گرتے اس نے اپنے آپ کو ٹانگوں پر سنبھال لیا۔

اس نے ایک باغی کی نگاہوں سے ٹاور کو گھورا.... ایک بار پھر ناخن تیز کیے اور نئے عزم کے ساتھ ایک اور کوشش کی۔

وہ بڑی احتیاط سے سنبھل سنبھل کر رک رک کر آگے بڑھ رہا تھا۔

میرے دیکھتے دیکھتے وہ چوٹی پر پہنچ گیا۔

چوٹی پر جم کر خوب پھول کر اس نے نیچے ایک سرسری سی نظر بھی ڈالی.... پھر مطمئن اپنی فتح کا جشن منانے لگا۔

میں پورے انہماک سے یہ کھیل دیکھ رہا تھا.... خود اس کا حصہ بن گیا تھا۔

بیگم کھٹ کھٹ کرتی چائے لے آئی.... میں باہر سے اندر آ گیا۔

میری رگوں میں خوشی دوڑ رہی تھی.... تلخیوں کا کہیں کوئی نام و نشان نہ تھا۔

میں نے بیگم کا ہاتھ تھاما اور والہانہ چوم لیا۔

میں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کپ میز پر رکھ دیا۔

”بیگم.... آؤ تمہیں ایک تماشہ دکھاؤں۔“

میں نے شہادت کی انگلی اٹھا کر باہر بلی کے بچے کی طرف اشارہ کیا.... اور خود بھی کھڑکی میں جھک گیا۔

بلی کا بچہ چوٹی پر بیٹھا اطمینان سے اپنی گردن کھجا رہا تھا۔

اچانک کار کا پہیہ گھوما اور.... اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

میں اور بیگم ہر دو کھکابت بنے کھڑکی میں جمے کھڑے تھے۔

ہمیں سنبھلنے میں ایک عرصہ لگا۔

خون کا ایک چھوٹا سے میلا دھبہ.... اس میں لگے کچھ سفید بال....

بلی کے بچے کو کار کا دروازہ بند ہونے اور اسٹارٹ ہونے کی آواز پر ہوشیار ہو جانا چاہیئے تھا.... ایسا کیوں نہ ہوا؟

شاید وہ اپنی فتح کے نشے میں اتنا سرشار تھا کہ اسے کوئی آواز ہی سنائی نہ دی تھی۔

ہم دونوں آج بھی اس کھڑکی کے سامنے کھڑے سوچ رہے ہیں کہ اسے ہم نے کس پل کی چھوڑ دیں۔

فریقِ ثانی

گلزار جاوید

مہمان کو سب سے پہلے کوفت کا سامنا اُس وقت ہوا جب اُس نے دروازے پر لگی کال بیل کا استعمال احتیاط اور مناسب انداز میں کرنے کے بعد کوئی جواب نہ ملنے کی صورت میں خاصے غصے اور جھنجھلاہٹ کے انداز میں کال بیل کے بٹن کو انگلی کا ٹرائیگر سمجھتے ہوئے ٹھاہ ٹھاہ کے انداز میں کئے اوپر تلے بار داغ دیا۔ جب یہ ترکیب بھی کارگر نہ ہوئی تو وہ کال بیل کے بٹن پر دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا دباؤ ڈال کر اس طرح بھول گیا جس طرح دودھ پیتا بچہ منہ میں اور شریر بچہ مٹھائی شیرے یا دودھ میں ڈال کر بھول جاتا ہے۔ دوسری کوفت مہمان کے روبرو میزبان کی خمار آلود آنکھیں اور کسمساتا بدن ناگوار محسوسات کی صورت میں موجود تھی۔ تیسری کوفت میزبان نے مہمان کے کسی مقصود کی بابت کسی طرح کا ذکر کرنے یا حوصلہ افزا گفتگو کے بجائے مہمان خانے میں بیٹھنے اور تواضع کے لئے سامانِ خورد و نوش لانے کے بہانے گھر کے اندرونی حصے میں جا کر مہمان کو پہنچائی۔

مہمان خانے میں سجے طغرے، کیلنڈرز، کتابیں، میز، کرسی، صوفے، الماری، پلنگ، چاندنی، گاؤ تکیے اور جھاڑ فانوس میں مہمان کو قطعی دلچسپی نہ تھی۔ سب چیزیں اُس کے مزاج اور معیار سے کوئی مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ بار بار مہمان کی نگاہیں گھر کے اندر داخل ہونے والے دروازے پر مرکوز ہو رہی تھیں۔ توجہ ہٹانے کے لئے مہمان مصنوعی طرز پر کمرے میں موجود چیزوں پر سرسری نظر دوڑا کر کبھی ایک چیز کبھی دوسری چیز کو غور سے دیکھ کر اُس کی ساخت اور معیار کی بابت رائے قائم کرنے کی کوشش کرتا۔ صاحب خانہ کی مالی حیثیت اور کمرے میں سجی اشیا کی قدر و قیمت پر حیران ہوتا مگر مہمان کا ذہن اُچھل کود کرتا ہوا کسی اور جانب بھٹکنے لگتا۔

تمام رات آنکھوں میں کاٹنے، طرح طرح کے اندیشوں، واہموں اور وسوسوں میں مبتلا رہنے کے باعث مہمان کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، چہرے پر پژمردگی، بالوں میں بے ترتیبی اور لباس میں شکنیں واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔ ہر چند میزبان چند ہی ساعتوں میں واپسی کی نوید سنا گئے تھے مگر چند ساعتوں کا دورانیہ طویل ہونے کے باعث مہمان کی بے چینی اور بے قراری میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ مہمان کو آزمائش کے یہ لمحات صدیوں پر محیط نظر آ رہے تھے۔ کبھی وہ خود کو نہر کھودنے والے کوہکن فرہاد، کبھی صحرا نوردی کرنے والے مجنوں، کبھی پانی کی منہ زور لہروں کا شکار مہینوال محسوس کرتے ہوئے عجیب طرح کی کوفت، بے بسی اور لاچاری سے دوچار تھا۔ دل ہی دل میں مہمان اُس وقت کو کوس رہا تھا جس کے باعث اُسے اس کڑے وقت کا سامنا تھا۔

جمال چھریرے بدن، لمبے قد، روشن آنکھوں والا خوش شکل، خوش گو، خوش فکر، خوش خصال، خوش اطوار اور خوشحال نوجوان تھا۔ بیوہ ماں کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناطے جمال کی پرورش میں وہ تمام ناز و نعم اور احتیاط شامل تھیں جو ایک بیوہ ماں کی دسترس میں ہوا کرتی ہیں۔ جمال کا بچپن بلا کسی ایڈونچر کے بخیر خوبی جوانی کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ میٹرک میں ایک سال ضائع ہونے کے بعد تعلیمی سفر بھی صحیح سمت میں جا کر اختتام پذیر ہو چکا تھا۔ صاحب اختیار اقربا کی تگ و دو سے ملازمت کی جدوجہد بھی جلد رنگ لے آئی تھی۔ جمال کی والدہ کو مسئلہ درپیش جمال کی شادی کا تھا۔ جمال کی والدہ جب کوئی لڑکی پسند کرتیں جمال لڑکی یا اس کے خاندان میں کوئی نہ کوئی نقص نکال کر شادی سے انکار کر دیتا۔ خدا جانے یہ سلسلہ مزید کتنے روز جاری رہتا اگر جمال کے باس جمال کی والدہ سے ملنے جمال کے گھر نہ آتے۔ جمال کی والدہ جمال کے باس کو جمال کا بزرگ سمجھ کر اپنی پریشانی بیان کر رہی تھیں انہیں کیا معلوم تھا کہ جمال کے باس ڈاکٹر محمد افضل اُن کے اسی مسئلے کا حل لے کر آئے ہیں۔ اصل میں آئے تو وہ جمال کی شکایت لے کر تھے کہ جمال اپنے ہمراہ کام کرنے والی پڑھی لکھی خوبصورت اسسٹنٹ کشور میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ دفتر کے بعد کا بہت سا وقت بھی دونوں اکٹھے گزارنے لگے ہیں۔ جمال کے باس کی اس اطلاع نے جمال کی والدہ کے لئے پریشانی کے بجائے آسانی بلکہ خوشیاں مہیا کر دیں۔

کشور کے والدین، جمال اور اُس کے خاندان کی بابت زیادہ جانکاری نہ ہونے کے باعث کسی قدر پس و پیش سے کام لے رہے تھے۔ جمال کے باس ڈاکٹر محمد افضل کی ذاتی دلچسپی اور ضمانت نے جمال اور کشور کے رشتے کو پکا کرنے میں اہم رول انجام دیا تھا۔

کشور اور جمال کا جوڑا دیدنی بھی تھا اور مثالی بھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے اور ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال بھی رکھا کرتے۔ سوسائٹی میں مختلف مقام کے باعث دونوں کے مزاج، رہن سہن اور ذہنی اپروچ میں فرق ہونے کے باعث بہت سے اُمور پر اکثر اُن میں اختلاف بھی ہو جاتا۔ جب بھی ایسا موقع آتا، دونوں میاں بیوی ازدواجی زندگی کو پرسکون رکھنے کے لئے تدبر اور فہم و فراست سے کام لیتے ہوئے چھوٹے چھوٹے مسائل پر جلد قابو پا لیا کرتے۔

کچھ دنوں سے اُن کے درمیان ایک ایسا اختلافی مسئلہ در آیا تھا جسے کشور اور جمال کوشش کے باوجود دور کرنے میں ناکام رہے تھے۔ کشور نے

جمال کو ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کا اپنے کزن عرفان سے اب کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ عرفان کے ساتھ اس کے رشتے کی بات چلی ضرور تھی مگر عرفان کے تعلیم کے حوالے سے انگلینڈ جانے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ جمال کشور کی یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ جب بھی کشور اور عرفان کو ملتا اور گفتگو کرتا دیکھتا اس کے دل میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھتی۔ وہ کشور اور عرفان کے درمیان عشق محبت اور پیار کی عدم موجودگی کو ماننے سے صاف انکار کر دیتا۔ جمال کے دل کا یہی چور اکثر کشور اور جمال کے درمیان اختلاف کا باعث بنا کرتا۔ کبھی کبھی یہ اختلاف لڑائی میں بدل جاتا اور کشور جمال سے روٹھ کر میکے جا پہنچتی۔ چند دن تنہائی میں گزار کر جب جمال کو کشور کی یاد ستاتی تو وہ کشور کو منا کر واپس اپنے گھر لے آتا۔

ایک دن کشور اپنی کزن کوکب کی شادی کی تصویریں جمال کو دکھا رہی تھی۔ اتفاق سے ان تصویروں میں ایک تصویر ایسی بھی تھی جس میں دلہا اور دلہن کے ساتھ کشور اور عرفان بے تکلف انداز میں کھڑے تھے۔ تصویر دیکھ کر جمال کو موقع ہاتھ آ گیا کشور کو نشانہ بنانے کا۔ کشور نے اس روز جمال سے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اپنے ذہن سے اس طرح کے فضول اور بے ہودہ خیالات کو ہمیشہ کے لئے نکال دے ورنہ ان کی ازدواجی زندگی کے لئے جمال کا یہ رویہ نقصان کا باعث ہو گا۔ کشور کی نصیحت کا جمال نے الٹا اثر لیا۔ پہلے دونوں میں زبانی تکرار ہوئی پھر نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ جمال اس قدر طیش میں آیا کہ اس کے منہ سے ایک نہیں دو نہیں تین بار طلاق کا لفظ ادا ہو گیا۔

شریعت کی رو سے کشور اور جمال کا میاں بیوی کے طور پر ایک ساتھ رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ کشور کو روکنے کے لئے جمال نے ہر وہ حربہ استعمال کیا جو اس کے بس میں تھا۔ معافی، تلافی اور آئندہ کے لئے محتاط رہنے کے وعدے بھی کشور کو اس کے گھر جانے سے نہ روک سکے۔ ہمیشہ کی مانند اس بار بھی کشور جمال سے ناراض ہو کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ کشور کے گھر والے کشور کے اس طرح جمال سے ناراض ہو کر گھر آنے کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ انہوں نے کشور کے گھر آنے کا زیادہ نوٹس لیا نہ کشور سے اس کی ناراضگی کا سبب دریافت کیا۔ جمال ہر روز کشور سے ٹیلی فون پر بات کرنے کی کوشش کرتا۔ ہر روز ہی کشور ٹیلی فون پر جمال کی آواز سن کر فون بند کر دیتی یا طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنا کر ٹیلی فون اٹینڈ کرنے سے انکار کر دیتی۔

ایک دن جمال نے فون کر کے خاص طور پر کشور کی امی سے درخواست کی کہ وہ ایک بار کشور سے فون پر بات کرا دیں۔ کشور اگر والدہ کا حکم نہ مانتی تو اسے والدہ کو مکمل بات بتانا پڑتی جس سے خاندان میں کہرام مچ جاتا۔ سر دست کشور خود ہی اپنے خاندان کو کسی آزمائش سے دو چار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

طوعاً و کرہاً کشور نے جمال سے ٹیلی فون پر بات کرنا گوارا کر لیا۔ جمال نے کشور کو خدا اور رسول کا واسطہ دے کر ایک مرتبہ ملنے کے لئے یہ کہہ کر آمادہ کیا کہ اگر کشور اس کی بات سے مطمئن نہ ہوئی تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کشور کی زندگی سے کہیں دور چلا جائے گا۔

بے شک جمال ایک مثالی شوہر اور ہمدرد جیون ساتھی تھا۔ محبت کرنے کا سلیقہ اور ڈھنگ بھی جانتا تھا۔ کشور کے لئے اس کا شکی مزاج شکی ذہن اور زود رنج طبیعت کو نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ جمال نے کشور کا موڈ ٹھیک کرنے کے لئے ابتداء اپنی غلطی اور آئندہ کے لئے ہر طرح سے محتاط رہنے اور کشور کے احساسات و جذبات کا خیال رکھنے سے کرتے ہوئے طویل تمہید باندھ کر مدعا بیان کیا۔

فوری طور پر جمال کے بیان کردہ حل سے کشور مطمئن یا خوش ہونے کے بجائے خاصی پریشان ہوئی۔ کشور کے لئے کسی نامحرم کے سامنے اس طرح کا ذاتی مسئلہ بیان کرنا کس قدر شرم کا باعث تھا۔ عالم دین نے کوئی ایسی ویسی بات دریافت کر لی تو وہ مارے شرم کے زمین میں گڑ جائے گی۔ جمال نے کشور کو اس تمام کوشش و جستجو کی بابت بتلایا جو وہ گزشتہ ایک ہفتے سے کر رہا تھا۔ قاری وحید الدین اچھی شہرت کے مالک پڑھے لکھے جہاں دیدہ علما میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان سے مشورہ کرنا ہمارے لئے ہر طرح سے فائدہ مند ہو گا۔

قاری وحید الدین جمال اور کشور کی زبانی ان کی روداد سن کر ایک طرح سے سکتے میں آ گئے۔ ان کا خیال تھا جس طرح محلے، پاس پڑوس اور دور دراز سے اکثر شادی شدہ جوڑے ان کے پاس اولاد نہ ہونے کی فریاد لے کر آتے ہیں یا جن، بھوت، پریت کے سائے کی شکایت کے مریض لائے جاتے ہیں یا اندرونی عوارض کی شکایتیں لے کر کچھ خواتین رازداری سے قاری صاحب کے پاس آتی ہیں یا کچھ اپنے مردوں کی بد چلنی یا بیکاری سے پریشان ہو کر قاری صاحب سے مدد کی طالب ہوتی ہیں یا کچھ بچیوں کے مناسب رشتے نہ آنے کے باعث پریشان ہو کر قاری صاحب سے تعویذ گنڈا لینے آتی ہیں ویسے ہی یہ جوڑا بھی قاری صاحب کے پاس امداد کی طلب لے کر آیا ہے۔

قاری صاحب کی خاموشی اور مراقبے کی کیفیت جمال اور کشور کے لئے فکر مندی کا باعث تھی۔ جمال کے توجہ دلانے پر قاری صاحب کے منہ سے ایک لمبی "ہونہہ" برآمد ہوئی۔ مراقبے کی کیفیت سے باہر آتے ہوئے قاری صاحب نے فقط اتنا فرمایا۔ "اسی لئے اسلام میں غصے کو حرام قرار دیا گیا ہے" اتنا کہہ کر قاری صاحب ایک مرتبہ پھر مراقبے کی کیفیت میں چلے گئے۔ اس مرتبہ کشور نے منت اور گریہ زاری کے انداز میں قاری صاحب کو مخاطب کیا تو ان کے منہ سے ایک بار پھر لمبی "ہونہہ" برآمد ہوئی۔ اس مرتبہ قاری صاحب

کی روشن آنکھیں، سرخ سپید گول مٹول چہرہ، بھرے بھرے گال، چوڑی چھاتی اور صحت مند بازو پوری طرح چاق و چوبند ہو چکے تھے۔ قاری صاحب نے دائیں ٹانگ کو بائیں ران کے اوپر سے اٹھا کر بائیں ٹانگ کو دائیں ران پر منتقل کیا، پھر منہ کے بائیں جبڑے میں دبے سالم پان کو مسوڑھوں کی چار جانب گھما کر چباتے ہوئے زبان کی مدد سے اور، نیچے کے ہونٹوں میں دبے بقیہ پان کو سمیٹتے ہوئے دائیں گال کی گھپا میں محفوظ کر کے زوردار ڈکار لی جس کے بعد قاری صاحب نے بلند آواز میں "الحمدللہ" کہہ کر سیدھے ہاتھ کی انگشت شہادت اور انگوٹھے کو ناک کے نیچے رکھتے ہوئے ایک بار پھر زور سے "ہونہہ" کی آواز نکالی۔ "اسلام میں اس کا ایک ہی حل ہے "حلالہ" قاری صاحب کی مختصر بات مکمل ہوتے ہی کشور کا رنگ پیلا پڑ گیا اور جمال کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ آگے آگے جمال، پیچھے پیچھے کشور قاری صاحب کے قریب ہوتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولے "اس کے علاوہ کوئی اور حل بھی ضرور ہوگا قاری صاحب" قاری صاحب یہ سنتے ہی اشتعال میں آگئے۔ "توبہ توبہ استغفار کیجئے اللہ اور اس کے رسول کے احکامات میں دخل اندازی کرنے کی کسی کو اجازت نہیں، جس قدر جلد ہو سکے آپ اس غلطی کا ازالہ کیجئے۔"

قریبی پارک میں بیٹھ کر کشور اور جمال نے مناسب شخص کی بابت غور و فکر شروع کر دیا۔ باتوں باتوں میں کشور پر غشی کا دورہ پڑا اور وہ بے سدھ ہو کر پارک کی زمین پر لیٹ گئی۔ آس پاس کے لوگوں سے بے نیاز جمال دوڑا ہوا پارک کی کینٹین میں گیا اور ٹھنڈے شربت کی بوتل کشور کو پلانے کی کوشش کرنے لگا۔ جمال کی بات پر کشور کے لئے خود پر قابو رکھنا محال ہو رہا تھا۔ شربت کی بوتل ایک طرف رکھ کر کشور زار و قطار رونے لگی۔ جمال نے کشور کو چپ کرانے کے لئے اس کے شانوں کو ہاتھ لگایا تو وہ اچھل کر جمال سے دور ہو گئی۔ "خبردار! مجھے ہاتھ لگانے یا میرے نزدیک آنے کی اس وقت تک کوشش نہ کرنا جب تک خدا اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے حکم کے مطابق تمہاری غلطی کا ازالہ نہیں ہو جاتا، تب تک تم میرے لئے نامحرم ہو۔"

دراصل جمال نے مناسب آدمی کے طور پر عرفان کا نام لے لیا تھا جسے سن کر کشور خود پر قابو نہ رکھ پائی تھی۔ جمال کو بے نقط سنانے کے ساتھ عرفان کے لئے بھی کشور کے منہ میں جس قدر سخت اور غلیظ الفاظ آئے سب کے سب کشور نے بک ڈالے۔ جمال حیران تھا کہ کشور کی زبان پر اس قدر نامناسب اور نازیبا الفاظ کیونکر آ سکتے ہیں۔ جمال اس وقت بات کو طول دینا نہیں چاہتا تھا۔ ساری غلطی کا ذمہ دار خود کو ٹھہراتے ہوئے کشور سے معافی طلب کرنے لگا۔ آئندہ کے لئے ہر طرح سے تابعدار رہنے کی یقین دہانی کرانے لگا۔

قاری صاحب ایک مرتبہ پھر مراقبے میں چلے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد بھی "ہونہہ" نے انہیں مراقبے سے باہر آنے میں مدد کی۔ "میرے عزیز! حوصلے سے کام لیجئے۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ آپ کے پاس پڑوس، دوست احباب، اقربا وغیرہ میں کوئی نہ کوئی صاحب ایسے ضرور ہوں گے جو آپ کو اس مشکل سے نجات دلائیں۔" قاری صاحب کو ان سے دلی ہمدردی تھی وہ ان کی مدد بھی کرنا چاہتے تھے..... مگر..... بے بس تھے۔ قاری صاحب نے جمال اور کشور کو یہ کہہ کر رخصت کی اجازت دے دی۔ "آپ بھی موزوں آدمی کی تلاش کیجئے ہم بھی کوئی مناسب شخص ڈھونڈتے ہیں۔"

صاحب خانہ تازہ گرم چائے کے ہمراہ معقول مقدار میں سامان خورد و نوش نفیس ٹرے اور ریشمی رومال میں سجائے مہمان خانے میں نمودار ہوئے تو جمال کی جان میں جان آئی۔ جمال نے چائے کی ٹرے اور اس میں موجود سامان خورد و نوش سے بے اعتنائی برتتے ہوئے عرض مدعا بیان کیا۔ میزبان نے جمال کی بات سنی ان سنی کر کے چائے کی جانب جمال کی توجہ دلائی۔ جمال نے میزبان کی کوشش کو نظر انداز کرتے ہوئے واضح اور دو ٹوک طریقہ پر عرض مدعا پھر سے بیان کیا تو میزبان کی تیوری پر بل پڑ گئے انہوں نے خاموشی میں عافیت جانی۔ جمال کے تیسری بار بلند آواز میں اصرار کرنے پر میزبان یکایک آگ بگولا ہو گئے۔ میزبان نے صاف صاف لفظوں میں جمال کو چائے پیئے نا پیئے کا آپشن دیتے ہوئے فوری طور پر عمل کرنے کو کہا۔ جمال کے لئے میزبان کا رویہ قطعی طور پر ناقابل فہم اور ناقابل قبول تھا۔ جمال نے میزبان کے بدلتے تیور کی پرواہ کئے بغیر فریق ثانی سے ملنے پر اصرار کر ڈالا۔

میزبان نے ڈیوڑھی کے دروازے کے پیچھے کھڑے فریق ثانی سے محرم کی آخری خواہش پوری کرنے کو کہا جسے سن کر جمال کے جی میں آئی کہ وہ اچھل کر میزبان کا منہ نوچ لے یا زمین پر پٹخ کر اس کی اس قدر دھلائی کرے کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے..... مگر..... جمال کو اپنے چار جانب گہرا پانی اور اس میں بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اپنی ناتوانی کا شدت سے احساس ستانے لگا۔ اس کے روبرو میزبان کی روشن آنکھیں، سرخ و سپید مسکراتا چہرہ، پھولے ہوئے گال، چوڑی چھاتی اور بازوؤں کی پھڑ پھڑاتی مچھلیاں جمال کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کے لئے کافی تھیں۔

واپسی پر جمال میزبان کی عہد شکنی، بے مروتی اور بے ایمانی پر جس قدر کھول رہا تھا اس سے زیادہ اسے کشور کی بے وفائی، بدعہدی اور بے شرمی کھل رہی تھی۔ کشور کی آواز کا مانوس ٹھہراؤ اور پرسکون لہجہ بھی جمال کی اندرونی کیفیتوں کو بے کلی کے زہر میں تبدیل کر رہا تھا.........!

گرداب

ستیہ پال آنند

ستر برس کی عمر سے جیسے پاؤں پلٹ کر
پیچھے کی جانب لوٹی' سات برس کی ننھی بچی
ڈر کے مارے چیخ رہی تھی.... ''ماں' مجھے بچاؤ!
میں دریا میں ڈوب رہی ہوں!''
اس کے چاروں سمت بھنور تھے
لہروں کا اک جال بچھا تھا
اٹھتے' بڑھتے' چکر کھاتے گردابوں میں گھری ہوئی تھی
ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں تھی
سر پانی سے اوپر رکھنا' اک دو سانس برابر لینا
سات برس کی بچی کو مشکل لگتا تھا
پھر اک بار ابھر کر پانی سے اوپر آئی تو چیخی زور سے ....
''او ماں میری! مجھے بچاؤ! میں دریا میں ڈوب رہی ہوں!''
تند بپھرتے دریا کی لہریں کچھ شانت ہوئیں تو
اس کو یوں محسوس ہوا' پانی نے پیار سے
گالوں کو سہلا کر' اس کے سر ماتھے کو چوم لیا ہو
جیسے لہروں کے سرگم نے
ماں کی لوری سی آواز میں
اس کے لہروں کے نیچے گم ہو جانے
یا سو جانے کی تھپکی دی ہو۔
پاؤں پلٹ کر پھر لوٹی تو
اس کے بوڑھے چہرے پر ڈر کے سائے کو
نور کی چادر ڈھانپ رہی تھی!

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے لئے نظم

یونس صابر

تُو آ ملا ہے جب بھی پکارا گیا تجھے
ڈھونڈا تو جیسے اپنے قریں پا لیا تجھے

تُو ہے بدل ادیبؔ بلاشک مہا کوی
کہتی ہے ہندو پاک کی اُردو سبھا تجھے

لکھے ہیں شیکسپئر کی زباں میں بھی تو نے شعر
پھر کون ہے وہاں جو نہیں جانتا تجھے

آنند! آجکل تُو عجب کشمکش میں ہے
بیوی کا روگ کرب نیا دے گیا تجھے

تُو بھی تھا زخم زخم کبھی ہسپتال میں
اب پرملا کے درد نے مرجھا دیا تجھے

سونا تھا ستیہ پال وہ کرتی تھی رتجگا
سیوا سے اُس کی ملتا نیا حوصلہ تجھے

تُو اُس کا گیت ہے وہ ترے پیار کی غزل
دیتا ہے ساتھ اُس کا بڑی سانتا تجھے

بیٹھے ہیں گرچہ خاطرؔ و محسنؔ کے شہر میں
ہم نے بھی لوحِ دل پہ رقم کر لیا تجھے

دُکھ پڑھ کے ترا' لکھ دیا اک نامۂ طویل
رکھتا ہے اپنی یاد میں یوسف رچا تجھے

ڈھیروں دُعائیں دیتی ہیں اے بہن پرملا
اختر زریںؔ بانو بھی اور عائیہ تجھے

پرنام آپ دونوں کو مایوس مت رہو
بخشے گا جلد دستِ مسیحا شفا تجھے

بھائی کے گھر رہا ہے وہ مہمان چار دن
اب کیسے بھول جائے گا صابرؔ بھلا تجھے!

سُنو! صوت علی صفوت

ہجومِ اُنس میں یارانِ فکر و غور میں اب
سُنو! کہ میں ہی ولی ہوں تمہارے دَور میں اب

تمہارے محضرِ خونی میں ہر جواں کی قسم
تمہاری قید میں ہر ایک ناتواں کی قسم

تمہاری ساری سُپر پاوری کی جاں کی قسم
تمہاری اور ہماری ہر ایک ماں کی قسم

یہاں پہ اور بھی طاقت کی بارگاہیں ہیں
کہ جن میں ذہن تکبر کی داستانیں ہیں

شراب و حسن قیامت کے جو بھی ساماں ہیں
سنو! کہ ہم اس تردامنی سے نالاں ہیں

تمہارے شہر کے بالغ سبھی تو زانی ہیں
تمہاری ساری معیشت میں سود خوانی ہیں

تمہارے شہر جُوئے کے سبب ہی شاید اب
ہیں لاٹری کے ٹکٹ، سیل سب سے زاید اب

طوائفوں کا بھی پیشہ بہ لفظِ سادہ میں
تمہیں پتہ ہے کہ جائز ہے یہ نوا ڈا میں

ابورشن کا یہ قانون ہے عجیب و غریب
کہ منصفوں میں بھی باقی نہیں ہے کوئی نجیب

تمہارے عیب، یہ انلام کام کا جی سب
تمہارے دور کی جمہوریت کے پاجی سب

شباب و مہر کے اقتدار پھر سے ماپیں گے
بناتِ نقش کی مالائیں پھر الاپیں گے

مناتِ و لات کہ عزا کو پھر تراشیں گے
کہ اسپِ نیل بقرِ بُت بنا کے پوجیں گے
کہ تم بناؤ گے اہرام مصر کی قبریں
کہ طورِ سینن سے لاؤ گے اب نئی خبریں

یہ نابکاریٔ ایٹم یہ لو ہوائیں سب
تمہارے ذہن میں جو بھی کہکشائیں سب

یہ زمیں عرش یہ زمب حرم یہ کچھ بھی نہیں
وہ داستان ہے خود اور قلم یہ کچھ بھی نہیں

شروع ہے ہی نہیں اختتام ہے ہی نہیں
ولود ہے ہی نہیں، موت قام ہے ہی نہیں

وجود صرف وجود انتقال ہے ہی نہیں
عروج صرف عروج اور زوال ہے ہی نہیں

وہ لامکاں کی عبارت ہے سرسراہٹ ہے
جہاں پہ کچھ بھی نہیں وہ وہاں کی آہٹ ہے

شبیہ ہے نہ کسی سے کوئی شباہت ہے
مگر تمام زمانے کی بادشاہت ہے

سنو! تمہیں بھی یہ فرعونیت نہ لے ڈوبے
چمک دمک کسی موتی کے ہاتھ میں دے دے

کسی کا حشر ہوا ہے کسی کی باری ہے
بس اس نزول پہ ہیبت سی ہم پہ طاری ہے

رَنگ دے بَسَنتی — دِل نواز دِل

ہر سال وہی تار وہی دھار وہی مار
ہر سال وہی ڈور وہی زور وہی شور
ہر سال وہی رنگ وہی ڈھنگ وہی جنگ
ہر سال دِکھاتی ہے نئے رنگ بَسَنت اَور

ہر سال وہی آب وہی تاب وہی خواب
ہر سال نئی جُون وہی دُون وہی خُون
ہر سال پَتنگ اور تُرنگ اور نہنگ اَور
ہر سال دِکھاتی ہے نئے رنگ بَسَنت اَور

ہر سال وہی جوگ وہی روگ وہی بھوگ
ہر سال وہی قہر وہی جَبر وہی تبر
ہر سال پکڑو اور دھکڑو اور جکڑو دیکھ
ہر سال دِکھاتی ہے نئے رنگ بَسَنت اَور

ہر سال ہے اُمید وہی دید وہی عید
ہر سال شراب اور رَباب اور عذاب اَور
ہر سال وہی جام وہی بام وہی شام
ہر سال دِکھاتی ہے نئے رنگ بَسَنت اَور

ہر سال وہی آن وہی بان وہی شان
ہر سال وہی بات وہی رات وہی گھات
ہر سال نئے یار بہت پیار کئی بار
ہر سال دِکھاتی ہے نئے رنگ بَسَنت اَور

ہر سال وہی توڑ وہی چھوڑ وہی ڈور
ہر سال نئے دام وہی نام وہی کام
ہر سال گئی ڈور کی بے رَحم وہی کاٹ
ہر سال دِکھاتی ہے نئے رنگ بَسَنت اَور

ہر سال پتنگوں پہ اُڑاتا ہے جہاں نوٹ
ہر سال جَلاتے ہیں غریبوں کا لہو لوگ
ہر سال گنواتے ہیں کئی لوگ یہاں جان
ہر سال دِکھاتی ہے نئے رنگ بَسَنت اَور

ہر سال عجب "بو" ہے تو "کاٹا" ہے غضب لُوٹ
ہر چھت پہ ہے اِک ڈھول پڑے جس پہ دھمک تھاپ
کوئی کی خوا مخو سے مَرے اور جِئے فُتور
ہر سال دِکھاتی ہے نئے رنگ بَسَنت اَور

ہر سال بُرا حال کرے کال ہے کیا کال
ہر سال اِسی حال میں جاتا ہے یہاں بیت
ہر سال کی حالت پہ رُلاتی ہے ہمیں آنکھ
ہر سال دِکھاتی ہے نئے رنگ بَسَنت اَور

ہر سال کا رونا ہے یہ ایک دن کی نہیں بات
ہر سال کا دُکھڑا ہے مہینے کا نہیں روگ
ہر سال صدی اور ہزاری میں ڈھلے دیکھ
ہر سال دِکھاتی ہے نئے رنگ بَسَنت اَور

ہر سال سُناتا ہے مجھے یار وہی شعر
ہر سال وہی ایک غزل اور وہی نظم
ہر سال گزر جائے اِسی پیچ میں بے تاب
ہر سال دِکھاتی ہے نئے رنگ بَسَنت اَور

ہر سال حکومت کی وہی مرگِ مفاجات
ہر سال وہی حُکم عدولی کے کئی کیس
ہر سال عدالت پہ وہی ظلم کا اِلزام
ہر سال دِکھاتی ہے نئے رنگ بَسَنت اَور

اَے سالِ رواں جا کے مچا شور کہیں اور
اَے خانہ بَرانداز لگا ڈور کہیں اَور
اَے جانِ جہاں یوں نہ لڑا پیچ کھلے عام
اَے دِل تُو اُڑا اب یہ پتنگ اور کہیں اَور

میں بھی ہوں جنگ کا حامی

ماجد سرحدی

میں بھی ہوں جنگ کا حامی میرے یارو لیکن
آؤ گر جنگ ہی کرنی ہے تو غربت سے کریں
جنگ کرنی ہے تو پھر کیوں نہ جہالت سے کریں
قدغین فتح کریں جنگ قدامت سے کریں
جنگ کرنی ہی جو ٹھہری ہے تو نفرت سے کریں

جنگ ہم ان سے کریں جو کہ بنے ہیں نمرود
کالے دھن کے لئے جنکی نہیں معلوم حدود
جو شبستانوں میں لوٹے وہ صنم اپنے ہیں
شاذیہ ہو کے وہ مختاراں یہ غم اپنے ہیں

جن کو اپنوں ہی نے کاٹا وہ شجر دیکھے ہیں
ہم نے برسات میں جلتے ہوئے گھر دیکھے ہیں

کیوں نہ جمہور و صداقت کے لئے جنگ کریں
کیوں نہ انساں کی محبت میں نئے رنگ بھریں
آؤ ہم جنگ کریں جنگ کریں
میں بھی ہوں جنگ کا حامی میرے یارو لیکن

بے نام خلش

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

سارا کچھ اپنا ہو کر بھی
اپنا کیا ہے
کچھ اپنا ہونے کا احساس
کہاں ڈھونڈوں
ہاں اور نہیں کا زہر
ہر وقت ....ہر کسی پر
اپنا اثر دکھاتا رہتا ہے
یہ کیسی ساعت ہے جب میں
اپنی شناخت میں خود نکل پڑا ہوں
لا یعنی معنوی جہت کا بیکراں سمندر
سامنے ہے
اور ساحل ساحل میری آوازیں ہیں
آؤ....میری آواز کی پہنچ میں آجاؤ
ہم مل کر کائنوں کے تن من میں
غوطہ زن ہو سکیں
اور اک دوجے کو چاند ستارے کہہ سکیں
اپنے قتل کا اک سانحہ بن سکیں
اپنے سائے سے ڈر کر
اپنے آنگن میں بگولے بھر سکیں
اور حدود ذات کے پھیلاؤ میں
اپنی پیمائش کر سکیں
عقوبت
بھلائی
جزا
اور اپنا آستانہ!!

عید

قیصر نجفی

بجھ گئی ہیں جو سرِشام ان آنکھوں کی قسم
بام بے نور پہ اترا نہ کبھی عید کا چاند
قلب نادار میں پیوست ہے خنجر کی طرح
دکھ لے دیکھنا چاہے جو کوئی عید کا چاند

جلتے بجھتے ہوئے تاروں کی کمیں گاہوں سے
روشنی اور اندھیرے کے برستے پیکاں
جانے کس آنکھ کے آنگن کو کریں گے بےنور
جانے کس چشم کے عارض کو کریں گے تاباں

زرد چہروں کی کتابوں کے ورق بکھرے ہیں
یاس و نومیدی کا طوفاں ہے کہ تھمتا ہی نہیں
سرد آہوں کی ہواؤں کا سفر جاری ہے
منزلِ عید پہ یہ کارواں رکتا ہی نہیں

کوئی مفلس کسی مفلس سے بغل گیر نہیں
یہ ہے کیا رسم انہیں بھی تو بتا دو کوئی
گر یہ ممکن ہو تو اے علم تمدن کے امیں
ان کو بھی عید کے آداب سکھا دو کوئی

دلگرفتہ

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ

زندگی کا ملے خندہ ہر ایک لمحہ اور تُو
آنکھوں میں آنسو بھرے رہتا ہے کھویا اور تُو

بخشں اُٹھائے ذِتی رہتی ہے تجھے تیری انا
کیسے مستحکم رہے تیرا ارادہ اور تُو

کوئی ہمدم ہے نہ اب کوئی رفیقِ جاں ترا
آہ تشنہ کسقدر ہے بے سہارا اور تُو

چھوڑ کر تجھکو اکیلا سب ہی رخصت ہو گئے
رہ گئے باقی تیری خالی سی دُنیا اور تُو

تُو پریشاں ہے یہ اب کیسے کہے کس سے کہے
جذبۂ احساس پہ ہے اُس کا سایا اور تُو

ایسے میں جائے کہاں اب کس کو تُو آواز دے
تیری قسمت میں ہے تنہائی اندھیرا اور تُو

دل ہی نہیں اے زندگی آنکھیں بھی بُجھنے لگیں
دُور تک پھیلا ہوا تاریک صحرا اور تُو

رہ گئے باقی اب تیری تنہا زندگی کو بانٹنے
داغِ فرقت سوختہ جاں دلگرفتہ اور تُو

بے وجہ نہو پریشاں یوں بھی تو جیتے ہیں لوگ
دُور تک اِک ماتم اِک راستہ سا اور تُو

اشک آنکھوں سے چھلک کر تشنہ رُسوا کر گیا
رات کے دامن میں ہے ٹوٹا ستارا اور تُو

نئی واردات

غالب عرفان

قدم قدم کے تجسس میں ذہن غلطاں ہے
میں دن کے شور سے دور آ گیا ہوں، دور بہت!
میں شب کے شور میں گم ہو رہا ہوں ہر لمحہ
مرے قریب سمندر کی لہریں رقصاں ہیں
مرے قریب اندھیروں کے داغ روشن ہیں
بہت ہی دور اجالے میں شہر ڈوبا ہے
بلندیوں سے بہت روشنی اُبلتی ہے
جھلک رہی ہیں بہت دیر سے مری آنکھیں
خطوطِ فکر کا ہر دائرہ شکستہ ہے
فضائے آتش و آہن کے ملگجی سائے
دھواں دھواں سے خلاؤں کی سمت ابھرے ہیں
افق افق کی سیاہی میں رقص کرتے ہوئے
سکوتِ شب کی ساعت میں لرزے جاتے ہیں
وضاحتوں کے دریچوں پہ دل کی دستک ہے
اتھاہ روح سے ٹکرا رہی ہیں آوازیں
کتابِ دل کے ورق پھر اُلٹتے جاتے ہیں
اذیتوں کے ہر اک وار کے پسِ پردہ
یہ چہرہ کس کا ہے؟ سادہ بھی اور سوالی بھی
جبیں پہ غم کی لکیروں کی نارسائی بھی
یہ کون مجھ سے نبرد آزما بہر صورت
شعورِ وقت کا ملبوس پہنا آیا ہے
میں سوچتا ہوں یہ میں ہوں
یا میری تنہائی!
بپھرتی ڈولتی طغیانی موج بن بن کر
شعور و فکر کی راہوں سے میری نس نس میں
گزرتی ہے نئی وارداتِ قلب و نظر!

زلزلہ کے بعد پہلی عید پر

خیال آفاقی

خوگرِ بزمِ طرب، ہنگامۂ محشر بھی دیکھ
چشمِ دیدِ زندگی آ، موت کا منظر بھی دیکھ

کس طرح منظر بدل جاتے ہیں اک پل میں یہاں
اپنے اندر سے نکل کر، اک ذرا باہر بھی دیکھ

دیکھتا آیا ہے گل افشاں بہاروں کا وجود
اب خزاں بھی دیکھ، خاروں کے کھلے نشتر بھی دیکھ

مخملیں سبزے پہ پاؤں رکھ کے چلنا بھول کر
زندگی کی راہ میں بکھرے ہوئے پتھر بھی دیکھ

ایک لوحِ آسماں پر ہی ستاروں کو نہ گن
خاک میں جو مل گئے ہیں وہ مہ و اختر بھی دیکھ

وادیٔ کشمیر کی صبحیں تو دیکھی ہیں مگر
خون میں ڈوبی ہوئی اک شام کا منظر بھی دیکھ

اے سراپا زخم خوردہ، سوختہ جاں، خستہ دل
کھول آنکھیں اب ہلالِ عید کا خنجر بھی دیکھ کر

ہاں مگر رازِ مشیت کا بھی کچھ ادراک کر
آیتِ قرآں میں ''اِلّا ما سعیٰ'' پڑھ کر بھی دیکھ

دیکھ کر جن کو فرشتے بھی ہیں جیسے دم بخود
حادثے اپنی جگہ ہیں، صبر کے پیکر بھی دیکھ

اس قدر بھی اے شکستہ دل نہ محوِ یاس ہو
پھر نمایاں کر دلوں میں جذبۂ تعمیرِ نو

سانحۂ کربلا

شگفتہ نازلی

دل پہ مرے رقم ہے شہادت حُسینؓ کی
ہم کیسے بھول جائیں اس پہ دل گواہ ہے
اِس رَہ کی روشنی ہے سب ایثار کے دیئے
جذبوں کی انتہا ہے یہی دل کی چاہ ہے!

اب بھی بیان کرتی ہیں لہریں فرات کی
اِک داستان پیاس کی بکھری یہاں وہاں
ہر دور میں بیانیہ دُہرایا جائے گا
حق اور کفر کی ہو آویزش جہاں جہاں!

ٹھکرانا بیعت کفر کی حق تا اَبد رہے
اعزاز و افتخار تھا دونوں جہان کا
نانا کا دین اُن کے دل و جاں سے تھا قریب
اَرفع و اعلیٰ طے ہُوا امتحان کا!

تاریخ تو ہر دور میں ہوتی رہی رقم
ایثار کے نشاں مگر زریں قدم قدم
لکھا گیا لہو سے جو تھا ذکر کربلا
جس کے ہر ایک حرف سے ہوتی ہے آنکھ نم!

منظر عجیب سرزمین کربلا پہ تھا
راہِ خدا میں جان دی جو پاس پاس تھے
اُتری تھی شامِ حزن کا نوحہ لئے ہوئے
کہ ہو چکا جو ہونا تھا خیمے اُداس تھے!

بہارِ بے خزاں

صابرؔ عظیم آبادی

بچپن بیتا
آئی جوانی
ارمانوں کا خواب سہانا
لے کر اپنی آنکھوں میں
خوشبو جگنو
چاند ستارے
کومل کلیاں
پھول انوکھے
کتنے پیارے لگتے ہیں
یہ بھی گزرا
رفتہ رفتہ
بوڑھا لمحہ
پچھلی باتیں
یاد دلانے آیا ہے
لیکن ایسے لمحوں میں بھی
ہستی کا دکھ سہتی ہو
تازہ بتازہ لگتی ہو

حقیقت زمیں ہے...!

مشتاق شبنم

ہواؤں میں اڑتی ہوئی زندگی
زمیں سے گریزاں
چمکتے ہوئے ماہ و مریخ کی
روشنی جذب کرتی ہوئی
اپنی تاریک راتوں کو
روشن بنانے کی خواہش
غرض کی رفاقت میں
اونچی اڑانوں میں
محوِ سفر ہے
مگر اندھی جذباتیت کا سفر
منزلِ پُرسکوں سے پرے ہے
زمیں خندہ زن ہے
ہواؤں میں اڑتی ہوتی زندگی
اصل سے ماورا کسقدر ہے
حقیقت زمیں ہے
مگر یہ سراب آشنا زندگی
خودغرض خواب خواہش کی
راحت کی جانب رواں ہے
کہ یہ اپنی بربادیوں کی طرف ہی رواں ہے
ادھر نابکاری کی ہیں سرحدیں
اور ادھر یہ زمیں ہے مری مہرباں
جس کی مٹی میں ہے
زندگی، روشنی، آگہی.....!!!

ادراک

رعنا پروین

سونے من کے آنگن میں آہٹیں بھی ہوتی ہیں
چاند سے اجالوں کی خواہشیں بھی ہوتی ہیں

کہکشاں کے سب تارے رات میں اترتے ہیں
سُونے بَن میں یوں اکثر رونقیں بھی ہوتی ہیں

خواہشوں کی رنگیلی تتلیوں کے جھرمٹ میں
آسماں کو چھونے کی چاہتیں بھی ہوتی ہیں

جگنوؤں کی بستی میں شب میں دیئے جلتے ہیں
اندھی کالی راتوں میں مشعلیں بھی ہوتی ہیں

ان کہے جذبوں سے لمحے بھی پگھلتے ہیں
بھیگے بھیگے جھونکوں میں خوشبوئیں بھی ہوتی ہیں

آؤ بھر لیں ہم آسماں کے تاروں سے
لمحوں کے اترنے کی ساعتیں بھی ہوتی ہیں

میں نے زلزال کو لفظوں میں اُتر کر دیکھا

حنیف ترین

(۱)

حادثہ چار سو نشر ہوتا رہا
بے کلی سی فضاؤں میں بہتا رہا
ذہن میں کوئی لاوا پگھلتا رہا
خوف سے دم بہ دم دل دہلتا رہا
نارسائی کا غم دل کو کھاتا رہا
پنچھی پنجرے میں پر پھڑ پھڑاتا رہا
گرم لاوا اچانک اُبلنے لگا
مجھ کو احساس کچھ ایسا ہونے لگا
اپنے ہی گھر کے ملبے میں ہوں میں دبا
سر کو دیوار و در سے پٹختا ہوا
میرا کنبہ پریشان' ہیبت زدہ
گرد ملبے کے چکر لگاتا ہوا
زخمی ہاتھوں سے پتھر ہٹاتا ہوا
حسرتیں آنسوؤں میں بہاتا ہوا
"المدد! المدد!" زور سے چیختا
بے بسی پر خود اپنا ہی سر پیٹتا
یوں لگا سب ہی تنہا تھے کہرام میں
پھڑ پھڑاتے ہوئے موت کے دام میں

(۲)

میں نے دیکھا کہ ہوں اس جگہ میں کھڑا
ایک عجب دھند ہے' دن ہے نہ رات ہے
کرب کی سخت پتھریلی برسات ہے
آ کے ٹھہری وہاں غم کی بارات ہے
ہر طرف شور فریاد و ہیہات ہے
(سوگواروں کی پھولی ہوئی سانس ہے)
اور لاشوں کے ڈھیروں سے آتی ہوئی
یہ تعفن نہیں' عطر کی باس ہے
بیچ لاشوں کے' رنگیں قبا میں سجی
میری لختِ جگر کی بھی اک لاش ہے
جس پہ نوحہ کناں غمزدہ باپ ہے
(چشمِ دل پر کھلا یاد کا باب ہے)
سامنے آ کے جیسے کھڑی ہو گئیں
مہرباں ماں کی کھوئی ہوئی شفقتیں
لاڈ بہنوں کا' نانی کی وہ چاہتیں
سامنے آنکھوں کے گھومتے ہیں وہ پل
اس کا بچپن جہاں لہلہایا تھا کل
اس کا کاندھوں پہ چڑھ کر مرے جھولنا
گل کے اطراف تتلی کا وہ ڈولنا
گھر کے آنگن میں وہ کھیلنا کودنا
گڈے گڑیا سے لڑتے ہوئے روٹھنا
ان کے کپڑے بدلنا' انہیں چومنا
گندہ کہہ کہہ کے ڈانٹیں پلانا انہیں
روٹھتے ہیں یہ سمجھ کر منانا انہیں
گھر جب آؤں تو جیبیں مری دیکھنا
واسطے اس کے لایا ہوں کیا' پوچھنا
باتیں اسکول کی سب بتانا مجھے
جوک اور جنگل کا نغمہ سنانا مجھے
اپنے کاموں میں بھی رکھنا میرا خیال
ہوں دُکھی میں تو کر دینا فوراً نہال
(سوچتا ہوں تو ہوتا ہے کتنا ملال)
یادیں صرصر ہیں' اب سخت اندھیاؤ ہے
زندگی ایک رستا ہوا گھاؤ ہے

(۳)

ذہن پر نقش ہیں ان گنت واقعات
خوں رلانے لگے جن کی ایک ایک بات
موت بیدرد منصف کی بے رحم گھات
ہوں وہاں اب میں چشمِ تصور کے ساتھ
غم ہی غم' درد ہی درد ہے کائنات
مجھ میں پھیلا ہے افسردگی کا غبار
گونجتی رہتی ہے مجھ میں اس کی پکار
(جس کی ڈولی اٹھانے نہ آئے کہار)
میری دیوانگی تھی وہ جانِ بہار
حادثہ اک اسے ساتھ میں لے گیا
داغِ فرقت مری روح کو دے گیا
جسم و جاں کی عمارت ہلاتی ہے اب
اس کی یاد ایک اک مجھ کو ڈھاتی ہے اب
اک تناسب کی یکتائی تن اور من
نرم مخمل سا لہجہ' وہ شیریں سخن
گوشۂ دل کو گرماتی چھب کی اگن
ہر ادا میں نہاں برگِ گل کی پھبن
بانہوں میں ہو تو لگتی تھی ریشم کا تھان
ہمقدم اس کی تھی زندگی کی اٹھان
دیکھتے دیکھتے اُف یہ کیا ہو گیا
میں بھی ملبے کا اک ڈھیر سا ہو گیا

ساتھ وہ لے گئی زندگی کی اساس
جینے کی آرزو' کامرانی کی پیاس
غم کی دلدل میں ہر چیز دھنستی ہوئی
میری قسمت کھڑی دور ہنستی ہوئی
ڈوبا ڈوبا سا دل' درد کی سانس کا
دم نکلتا ہوا جیسے احساس کا
تخت اوقات تعزیر چلتے ہوئے
درد انگیز منظر بدلتے ہوئے
ملتہب سینوں میں جاگتا ارتعاش
وقت کی جیسے خود اکھڑی اکھڑی ہے سانس
زندگی کھو چکی اپنے ہوش و حواس
کرب' گذرے ہوؤں کا جواں آس پاس
بے کفن حزن کی لاش کو چومتا
نیلے گنبد کو تکتا ہے مغموم سا

(۴)

یہ سبھی درد بے نام سے چور ہیں
آج اپنے تحفظ سے معذور ہیں
کتنی مشکل میں ہیں' کتنے مجبور ہیں
آئیے راہ دیں ہم مراعات کو
مل کے پورا کریں ان کی حاجات کو
آج یہ ہیں' نہ کل ہم پہ بھاری پڑے

زلزلے سب کی ہی ناک میں ہیں کھڑے
اس کے شاہد سب اوراقِ تاریخ ہیں
دینے والوں کو اللہ دیتا رہا
جنّتوں کے لیے جس نے اللہ سے
نفس اور مال کا اپنے سودا کیا
دو جہانوں میں وہ کامراں ہو گیا
قدرتی جن مصائب میں تم آج ہو
کیا پتہ کل یہی سب مرے ساتھ ہو
دکھ جو دیکھا تمہارا تو میں رو پڑا
آنسو ٹپکا جو دامن پہ مجھ کو لگا
میرے اطراف ویرانیاں ہیں کھڑی
زندگی دشت کی چیخ مٹی ہوئی
ہر طرف ریت سی مجھ میں اڑتی ہوئی
سوچ کے بازوؤں کو جکڑتی ہوئی
جو نہ سوچا کبھی اس سے دوچار ہوں
یاد میں گذرے کل کی گرفتار ہوں
آہ! میں کل تلک کس قدر شاد تھا
میرا گھر عیش و عشرت سے آباد تھا
دیدنی تھا مرا کبر، نخوت مری
مال و دولت بڑھاتے تھے شہرت مری
میرے قدموں میں رہتی تھی دنیا پڑی
نفس کی خواہشوں سے میں مغلوب تھا
پیٹ سے سوچنا مجھ کو مرغوب تھا
موت کی فکر مجھ کو نہ کچھ خوف تھا
کعبۂ نفس کا ہر نفس طوف تھا
نفس کے دین و تہذیب میں قید تھا
نفس کے مکر و فن کا میں اک صید تھا
شہر میں سب سے اونچا میرا دوار تھا
سر بلندی سے جس کی میں سرشار تھا
ایک جھٹکے میں جو منہدم ہو گیا
ریگزارِ عدم میں کہیں کھو گیا
اب اکیلا ہوں اور خود سے بیزار ہوں
وحشتوں ذلتوں میں گرفتار ہوں
دکھ کے ملبے تلے اپنے ہی جسم پر

پڑ رہی اپنے اعمال کی مار ہوں
تھا چھت ہی نہیں روٹیاں ہو گئیں
سوکھ کر بے لہو بوٹیاں ہو گئیں
بے اماں آسانی رضائی میں ہوں
لعنتوں سے بھری چارپائی میں ہوں
کان دے کر سنیں میرے احوال کو
دل میں مخفی نحوست کے جنجال کو
سچ یہ ہے نام ہی کا مسلمان ہوں
آدھا شیطان ہوں، آدھا انسان ہوں
خوف و دہشت کے خونیں تلاطم میں ہوں
آدمیت سے پیہم تصادم میں ہوں
میں نہ عید و کرسمس نہ ہولی میں ہوں
قوم کو لوٹنے والی ٹولی میں ہوں
ایسی حالت میں خود کو میں لایا کہ بس
قہر وہ میں نے ملّت پہ ڈھایا کہ بس
علم و اخلاق سے کر دیا نابلد
تا کہ قوم آپ اپنے میں الجھی رہے
میری جانب نہ اس کی نظر اٹھ سکے
اس پہ یلغار ہے میری آواز کی
نفسانی سروں سے بھرے ساز کی
قوم میں کچھ جو تھوڑے سے بیدار تھے
(راہ میں میری کانٹوں کی دیوار تھے)
دامِ رشوت میں ان کو بھی کستا رہا
مٹھیاں گرم کر کر کے ہنستا رہا
جانتے کیا، وہ تھی کیسی حکمت مری
کس کے دل میں نہ بیٹھی تھی ہیبت مری
صرف منصف ہی کیا، تھی عدالت مری
سب پہ حاوی تھی شیطانی طاقت مری
کیا بتاؤں تمہیں، میں نے کیا کیا کیا
خون خود اپنی ملّت کا پی کر جیا
کیا تمدن، وطن، عزتِ نفس کیا
میں نے ہر شے کا غیروں سے سودا کیا
میں شکاری ہوں اور یہ مری صید ہے
قبر اور حشر کے جال میں قید ہے

روح سے دین کی آج یہ دور ہے
مادّیت کے نشے میں یہ چور ہے
کوئی جب رہنمائی کو اس کی اٹھا
میں نے گمراہ اس کو کچھ ایسا کیا
آخر اس سے وہی سب کرایا گیا
فائدہ جس میں تھا میرے کشکول کا
اور ہتھکنڈوں سے میرے جو بچ گیا
اس کو حیلوں بہانوں سے کچلا سدا
میں ازل سے ہوں آدم کے اخیار میں
توپ میں، تیر میں اور تلوار میں
ہوں میں میزائلوں میں، ہوں بمبار میں
ایک اک خنجر کا گھر، مری مار میں

جو نہ سوچا تھا پھر دفعتاً وہ ہوا
ایک جھٹکا لگا، منہ کے بل گر پڑا
موت کے خوف سے ذہن چکرا گیا
ایک بھولا سبق جیسے یاد آ گیا
(اپنے اعمالِ بد سے میں شرما گیا)
تھرتھراتے لبوں سے یہ نکلی دعا
اے خدا اب ہدایت کا رستہ دکھا
دور کر میری مشکل کو، مشکل کشا
اے خدا سب خطائیں مری بخش دے
تو مجھے اک نئی زندگی بخش دے

(۵)

یہ سسکتے بلکتے سے لیل و نہار
لحظہ لحظہ سراسیمگی کا شکار
جن میں معصوم بچے ہیں روتے ہوئے
اپنے ماں باپ بھائی بہن کھو چکے
غم کا آشوب آنکھوں سے رستا ہوا
چہرہ مایوسیوں سے سلگتا ہوا
خوف کا ناگ روحوں کو ڈستا ہوا
کل جوان سب کا ماؤں سے پیوستہ تھا
بھائی بہنوں کی الفت سے وابستہ تھا
تتلیوں سے تھے جو خواب گہنا گئے

پھول کھلنے سے پہلے یہ مرجھا گئے
چہچہانے کی تُو ان سے رخصت ہوئی
دن میں منڈلاتی ہے ان پہ تیرہ شبی
پیار کی لوریاں دُور ان سے ہوئیں
مامتائیں نہ جانے کہاں کھو گئیں
بے کراں ایک وحشت یہاں اور وہاں
فرش سے عرش تک ہے دھواں ہی دھواں
دیکھ کر ان کے چہروں کی افسردگی
میرے اندر بنی چیخ آزردگی
جس کو میں لکھنا چاہوں تو کیسے لکھوں
اور اگر کہنا چاہوں تو کیونکر کہوں
ان پہ گزرا ہے کیسا عجب سانحہ
لفظ سے تو یہ نوحہ نہ ہو گا ادا
اس قیامت کا لفظوں میں ہو کیا بیاں
نطق کو اُس نے بخشی نہیں وہ زباں
خلق سے اس کو ماں سے زیادہ ہے پیار
جس کا اظہار کرتا ہے وہ بار بار

تم اکیلے نہیں اس مصیبت میں اب
جو ہیں انسان وہ ساتھ ہیں آج سب
اک قبیلہ یہاں آدمیت کا ہے
جو ازل سے ابد تک رواں رہتا ہے
حسنِ اخلاق انسانی میراث ہے
فطرتِ ابن آدم میں انصاف ہے
اس کی پہچان ایثار و اخلاص ہے
دوسروں کے اسے درد کا پاس ہے
ساری مخلوق میں اعلیٰ انسان ہیں
آدمیت کا دنیا میں یہ مان ہیں
ظلمتوں میں دیئے جو جلاتے رہے
ظلم سے بڑھ کے پنجہ لڑاتے رہے
جگ میں امن واماں ان کے ہی دم سے ہے
زندگی گل فشاں ان کے ہی دم سے ہے

جو مدد کرنے ہر ایک کی آئے ہیں
دردِ انسانیت کی دوا لائے ہیں
ابن شانہ بشانہ تمہارے ہے آج
رنج و غم میں تمہارا نبھانے کو ساتھ
دیکھو موجود ہے یہ ہر اک موڑ پر
وادیِ غم میں ہر اُور ہر چھور پر
پاتے ہی یہ خبر دوڑتی آئی ہے
اس سے جو بن پڑا ساتھ لے آئی ہے
سچّا ہمدرد اپنا اسے پاؤ گے
اس کی ہمدردیاں پے بہ پے پاؤ گے
دل شکستہ نہ ہو، رب کے سجدے کرو
صبر اور شکر کرتے ہوئے اٹھ پڑو
مل کے سب ان مصائب پہ چھا جاؤ گے
برف پگھلی کو گل بن کے کھل جاؤ گے

(۶)

تم پہ آئی تھی جو امتحاں کی گھڑی
اپنی پامردی سے خوب طے تم نے کی
ہو چکا غم بہت، اب جیالو اٹھو
کچھ مسائل جو باقی ہیں ان سے لڑو
تم کو تعمیر کرنا ہے پھر اپنا گھر
عزم و ہمت کا بکھرا ہوا مستقر
پھر ارادوں کو اپنے نئی جان دو
تازہ دم ہو کے ان کو نئی شان دو
مشکلیں دھیرے دھیرے نبٹ جائیں گی
داغ بچھڑے ہوؤں کے بھی دھو جائیں گی
غم میں خوشیوں کا پہلو رہا ہے سدا
وقت زخموں کا مرہم رہا ہے سدا
پختہ وعدہ ہے رب کا تمہارے لیے
(جاودانی جہاں ہے تمہارے لیے)
ماورائے گماں، رحمتیں پاؤ گے
جان و دل سے جو تم اس کے ہو جاؤ گے
زندگی امتحاں ہے ہمارے لیے
(عبد کی حیثیت کیا ہے سوچا کرو)
رسّی مضبوط تھامو تو چھا جاؤ گے
جتنا کھویا نہیں اتنا پا جاؤ گے

(۷)

اجڑے ملبوں پہ بس جائیں گی بستیاں
خشک کھیتوں میں پھیلیں گی ہریالیاں
بچّے اسکول کو پھر سے ہوں گے رواں
(پھر سے رستوں میں ٹکرائیں گی تختیاں)
رنگ بچپن میں بھر دیں گی پھر تتلیاں
بھونرے پھر آ کے پھولوں پہ منڈلائیں گے
بند کلیوں کے گھونگھٹ مہک جائیں گے
آ کے آنگن میں ناچیں گے مور اور طیور
درد کا میل آنکھوں سے کر دیں گے دور
جاگ جائیں گی شفقت بھری لوریاں
گیت بابل کے پھر گائیں گی ڈولیاں
زندگی آگے بڑھتی چلی جائے گی
کل کا قصہ ہر افتاد ہو جائے گی:

شاید اسی کا نام محبت ہے

ڈاکٹر سید تقی عابدی

نواب محمد مصطفیٰ خان ۱۸۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ آپ کے والد نواب مرتضیٰ خان کو لارڈ لیک نے گوڑگاؤں کے مضافات میں ہوڈل پلول کا علاقہ بطور جاگیر دیا تھا جس کی سالانہ آمدنی تین لاکھ روپے تھی۔ انگریز سرکار نے نواب کے انتقال پر جاگیر کو ضبط کر کے ان کے خاندان والوں کو سالانہ پنشن ہزار کا وظیفہ مقرر کیا جو ۱۸۵۷ء میں بند کر دیا گیا۔ نواب مرتضیٰ نے اپنی زندگی میں جہانگیر آباد کا علاقہ خرید کر اپنے بیٹے شیفتہ کے نام کر دیا تھا جو آخری عمر تک ان کے بعد ان کی اولاد کی ملکیت میں ۱۹۴۷ء تک رہا۔ شیفتہ کی والدہ اکبری بیگم سپہ سالار اسمٰعیل بیگ خان کی بیٹی اور احتشام الدولہ محمد بیگ کی نواسی تھی۔

شیفتہ نے دہلی کے مشہور و معروف معلم میاں جی مالا مال سے عربی فارسی کے علاوہ علوم مروجہ کی تعلیم حاصل کی۔ حافظ محمد نور سے جو علم حدیث اور تجوید کے عالم تھے قرآن، حدیث اور تجوید سیکھی۔ یہی نہیں بلکہ جب چوبیس برس کی عمر میں حج اور زیارات کے لئے گئے تو وہاں بھی طالب علم رہے چنانچہ مکہ کے عالم شیخ عبداللہ سراج سے صحاح ستہ کے کچھ حصے پڑھے، مدینہ میں شیخ عابد سندھی سے احادیث کا درس لیا اور مولوی کرم اللہ محدث سے علوم ظاہری و باطنی کی تعلیم حاصل کی۔ شیفتہ نے شاہ عبدالغنی نقشبندی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ دوران سفر حج سفرنامہ حجاز "رہ آورد" لکھا۔ تقریباً دو سال سفر حج و زیارات کے سفر میں گزار کر ۱۸۴۱ء کو دہلی پہنچے۔ اس سفر میں شیفتہ کی والدہ اور نانی اللہ کو پیاری ہوگئیں جنہیں جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ سفر حج کے بعد شیفتہ کی زندگی میں بڑی تبدیلی ہوئی۔ شیفتہ نے شاہد و شراب سے کنارہ کشی کر لی جیسا کہ اپنی ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں:

اے شیفتہ ہم جب سے کہ آئے ہیں حرم سے
شوق صنم و خواہش صہبا نہیں رکھتے

حج سے واپسی پر شیفتہ کی عمر مشکل سے (35) برس کی تھی لیکن اب شاعری بھی بہت کم ہوگئی تھی یہی نہیں بلکہ جب شیفتہ نے اپنے دیوان کی نظر ثانی کی تو ان اشعار کو نکال دیا جو مختصر معاملات، رنگین حکایات و محبت کی نئی روایات کے ترجمان تھے اور اسی لئے موجودہ فارسی و اردو کے دیوانوں میں ایسے اشعار کم نظر آتے ہیں۔

شیفتہ کا شمار اردو ادب کے مشاہیر شعراء میں کیا جاتا ہے۔ تقریباً دس گیارہ برس کی عمر میں شاعری شروع کی بیس سال کی عمر میں پختہ کلام لکھنے لگے اور تیرہ برس میں کلام پر کمال حاصل کر لیا خود کہتے ہیں:

اے شیفتہ اس فن میں ہوں اک پیر طریقت
گو عمر ہے میری ابھی اکیس برس کی

شیفتہ نے پہلے مومن کی شاگردی قبول کی اور مومن کے انتقال کے بعد غالب کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ شیفتہ کے تعلقات مومن اور غالب سے استاد اور شاگرد کی طرح نہیں بلکہ دوستانہ اور بے تکلف تھے چنانچہ دیوان مومن پر شیفتہ کا مقدمہ اور شیفتہ کے تذکرہ گلشن بے خار میں مومن کے کلام پر تنقید اور تحلیل اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سب ایک دوسرے کے مصاحب تھے ورنہ غالب جو خود شیفتہ کے استاد تھے یہ نہ کہتے کہ غالب نے اپنے دیوان میں کوئی ایسا شعر نہ رکھا جس سے پہلے شیفتہ مطمئن نہ ہو جاتے۔

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

الطاف حسین حالی نے شیفتہ کو اپنے زمانے کا نقاد مانا ہے چنانچہ یادگار غالب میں لکھتے ہیں۔ "لوگ ان کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار جانتے تھے۔ ان کے سکوت سے شاعر کا شعر خود اس کی نظر سے گر جاتا تھا اور ان کی تحسین سے اس کی قدر بڑھ جاتی تھی۔"

مشہور ہے کہ ہر جمعہ باری باری سے مفتی صدر الدین آزردہ اور شیفتہ کے مکان پر شعری بزم سجائی جاتی جس میں غالب، مومن، امام بخش صہبائی، حکیم احسن اللہ خان، غلام علی وحشت، ضیاء الدین نیر، میر حسین تسکین کے علاوہ قلعہ معلی کے فرد اور مہمان شعراء شرکت کرتے تھے۔ شاعری کے علاوہ شعر و ادب پر تبصرے ہوتے جن کی جھلک شیفتہ کے تذکرہ گلشن بے خار میں نظر آتی ہے۔

شیفتہ کی تصانیف میں چار فارسی اور ایک اردو تصنیف موجود ہے۔

(۱) سفرنامہ حج و زیارات جس کا فارسی نام "رہ آورد" اور عربی نام ترغیب السالک الی احسن المسالک ہے۔ یہ فارسی میں ہے اس سفرنامے سے ان کی فارسی زبان دانی اور مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سفرنامہ ان کی زندگی میں شائع ہو چکا تھا۔ (۲) دوسری فارسی کتاب "حسن عرق" ہے جس انہوں نے ۱۸۶۱ء میں مرتب کیا۔ یہ شیفتہ کے (57) رقعات اور خطوط کا مجموعہ ہے جس سے بھی ان کی فارسی نثر اور علمیت ظاہر ہوتی ہے۔ اس مجموعہ میں دس خط غالب کے نام، سات آزردہ کے نام، سات عبداللہ خان کے نام، تین تین خط مومن اور حکیم احسن اللہ کے نام اور ایک ایک خط فضل حق خیر آبادی، فضل اللہ خان اور صہبائی کے نام ہیں۔ (۳) فارسی میں عظیم کارنامہ شیفتہ کا اردو شعراء کا تذکرہ "گلشن بے خار" ہے جو ۱۸۳۲ء میں دہلی سے شائع ہوا اس وقت ان کی عمر (31) سال تھی اس تذکرہ میں (666) شعراء کے اشعار اور بعض کے حالات درج ہیں۔ یہ تذکرہ اردو ادب کا اہم تذکرہ ہوتے ہوئے بھی طرفداری اور ذوقی تعصب سے دوچار ہے اور ایک تفصیلی جداگانہ مضمون کا طلب گار ہے اگرچہ عندلیب شادانی نے اس کا عمدہ تنقیدی جائزہ لیا ہے اس تذکرہ میں سوائے آٹھ دس ہم پیالہ ہم مشرب شعراء کی تعریف اور اپنی بھلائی کی تحلیل کے سوا دوسرے شعراء کے ساتھ انصاف روا نہیں رکھا گیا۔ شیفتہ نظیر اکبر آبادی جیسے عظیم شاعر کو شاعر بھی نہیں مانتے ان تمام مسائل کے ہوتے ہوئے بھی اردو ادب اس تذکرے سے گردن نہیں موڑ سکتا۔ (۴) فارسی دیوان میں عرفی کی تقلید میں

قصیدے نظیری کی روش پر غزلیں اور قطعات موجود ہیں۔ فارسی نثر کی طرح سے فارسی نظم میں بھی شگفتگی، روانی اور کیف و مستی ہے۔ فارسی کلام میں اردو کی نسبت تصوف کی چاشنی زیادہ ہے۔ یہ شاید حافظ شیرازی کا اثر ہے جیسا کہ حالی نے لکھا ہے کہ وہ اکثر میں حافظ کی پیروی کرتے تھے۔ (۵) دیوان اردو ۱۸۵۵ء میں شائع ہوا جس میں (169) غزلیں اور کچھ فرد اشعار ہیں۔ اگرچہ بیسویں صدی کے ایڈیشن میں کچھ اشعار جو خطوط وغیرہ کرسے میں تھے دیوان میں جمع کئے گئے لیکن اشعار کی تعداد میں چنداں اضافہ نہ ہوا۔ علمائے شعروادب نے زیادہ تر تبصرے شیفتہ کے تذکرہ اور اردو دیوان پر کئے ہیں۔ اگر شیفتہ کے مختصر سے دیوان کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان پر میر، ناسخ، مومن اور غالب کا گہرا اثر ہے جس کو انہوں نے خود تذکرہ میں ظاہر کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بہت صحیح کہا ہے کہ "شیفتہ کی شاعری ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں انیسویں صدی کے تمام مقبول استادان فن کی جھلکیاں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ دوسرے اساتذہ کے رنگ میں شعر گوئی کی یہ کوششیں اتنے وسیع پیمانہ پر اردو شاعری میں پہلی مرتبہ نظر آتی ہے۔ شیفتہ نے اساتذہ قدیم کے دبے ہوئے امکانات کو نہ صرف ابھارا اور یہ کام اس لئے بھی مشکل تھا کہ وہ ہم عصر اور زندہ تھے لیکن ان تمام اساتذہ کے رنگوں کو مقبول ترین بنانے اور ان کے انداز کی تقلید کو عام کرنے کی خدمت انجام دی۔ اسے تخریب ہو کر ویسے بھی دلی کے [illegible] بڑے دل گردہ کا کام تھا۔ اس سے شیفتہ کی ذات تو متاثر ہوئی لیکن اردو شاعری کو نکھرنے، ابھرنے، پھلنے پھولنے اور مقبول ہونے میں بڑی مدد ملی۔ شیفتہ کی اس خدمت کو اردو غزل کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ شیفتہ فطرتاً عاشق مزاج تھے اگرچہ بعد میں مذہبی اقدار کے تحت ان عوامل کی پیروی نہ کی لیکن آخری عمر تک اس سے جدا بھی نہ ہو سکے۔ رقعات میں جو (23) خطوط بنام ہیں وہ ان کی معشوقوں کے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ شیفتہ بی رام جو نزاکت اور اس کی کیکی چنگلی زلف کے ایسے اسیر تھے کہ ان کی تعریف اور توصیف میں ان کے اشعار وغیرہ کرسے آج بھی موجود ہیں۔ اگرچہ یہ بازاری عشق نہ تھا لیکن جیسا کہ بعض ناقدین نے اسے فلاطونی عشق اور مشاہدہ حق کی گفتگو کا رنگ دے دینے کی ناکام کوشش کی ہے وہ بھی نہ تھا یہ سچا عشق تھا جو صنف نازک سے نزاکت سے کیا گیا اور ہمیشہ دل کو آرام ہو جانے کا لیکن اس کے ساتھ ساتھ عشق الٰہی کی شمع بھی فروزاں رہی۔

پائی شہ کو لاؤ رخ خم زرد ہے
جا شفاؤ وقت لب آیا نماز کا

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیب داستاں کے لئے

کرتے ہیں جور و جفا ناز و ادا کہتے ہیں
یہ بھی کیا لوگ ہیں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں

اشرف خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

اظہار عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

خلوت میں شیفتہ سے کوئی مل کے کیا کرے
وہ شخص انجمن میں بھی اور انجمن میں ہے

شیفتہ جس کو نہیں عشق وہ اپنے نزدیک
کیا بری طرح سے دنیا میں بسر کرتا ہے

اسباب عیش یہ جو مہیا ہے شیفتہ
کیا پردہ تم سے آنے کی ان کی خبر ہے آج

جب تک کہ تم رقیب سے ملنا نہ چھوڑ دو
مل جائے تم سے شیفتہ ایسا کبھی نہ ہو

یہ بھی مومن، غالب، حسرت کی طرح شیفتہ نے مقطع کے اشعار کو تخلص سے پرواز دے کر فلک سخن پر پہنچا دیا ہے۔ عشقیہ اشعار ہی نہیں بلکہ اردو شاعری کو سنوارنے کے لئے بھی عمدہ شعر کہیں ہم صرف ایک دو شعر یہاں پیش کرتے ہیں:

وہ طرز فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ
معنی شگفتہ لفظ خوش انداز صاف ہو

شیفتہ سادہ بیانی نے ہمیں چمکایا
ورنہ صنعت میں بہت لوگ ہیں ہم سے بہتر

شیفتہ کیسے ہی معنی ہوں مگر نامقبول
اگر اسلوب عبارت میں متانت کم ہو

شیفتہ کے تین لڑکے محمد علی خان، بخشش بہادر خان اور محمد اسحاق خان تھے اور دو بیٹیاں بھوپال میں بیاہی گئی تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے ہنگامہ میں شیفتہ کا گھر بار لوٹا گیا۔ عظیم کتب خانہ جل کر راکھ ہو گیا۔ سازش کے الزام میں کچھ دن قید ہوئے لیکن پھر بحال کر دیئے گئے۔ آخری عمر ذیابیطس Diabetes اور سیاہ زخم Melanoma کی تکالیف اٹھا کر ۱۸۶۹ء میں (63) برس عمر گزار کر نظام الدین اولیا کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ حالی نے سورہ مریم کی آیت "ونحن اہم بما صبرو اجنۃ وحریرا" سے تاریخ وفات نکالی جو لوح پر کندہ ہے۔

اعجاز راہی کی یاد میں

منشا یاد

میرے مرحوم والد صاحب اپنی ساری اولاد کے اسلام آباد اور لاہور میں مقیم ہونے اور آخری عمر کی بیماریوں کے باوجود گاؤں میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ہم انہیں پکڑ پکڑ کر اپنے کشادہ خوبصورت اور فرنشڈ گھروں میں لاتے، کاروں میں لادے لادے پھرتے، مری، دامن کوہ اور دوسرے خوبصورت مقامات کی سیر کراتے اور ہماری بیویاں طرح طرح کے پکوانوں سے ان کی خاطر تواضع کرتیں مگر وہ چولھے پر دھری گئی مرغی، کسی سدھائے ہوئے کبوتر کی طرح بار بار گاؤں کی بوسیدہ چھتری پر جا اترتے۔ انہیں اس بات کی فکر موت سے بھی زیادہ رہتی تھی کہ ایک روز وہ اپنے بیٹوں کو سخت مصیبت میں ڈالیں گے۔ وہ سب اپنے اپنے ضروری کاموں میں لگے ہوں گے کہ گاؤں سے بے وقت سندیسہ آ جائے گا اور انہیں اچانک اڑھائی سو میل کا سفر کرنا پڑ جائے گا۔ پھر خود ہی اپنی ڈھارس بندھاتے کہ کوئی بات نہیں سب کے پاس اپنی اپنی گاڑیاں ہیں اور ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ ہم ان کی باتوں کو مذاق سمجھتے مگر اب کہ میرا منجھلا بیٹا عامر شکیل امریکہ میں ہے میں منہ سے تو نہیں کہتا کہ مجھ پر دیہاتی بے تکلفی کی جگہ شہری تہذیب کا ملمع چڑھ گیا ہے مگر سوچتا ضرور ہوں کہ ایک روز میں اپنے بیٹے کو مصیبت میں ڈالوں گا اور اس بے چارے کو پتہ نہیں کتنے ضروری کام اور اپائنٹ منٹس کینسل کر کے اچانک پاکستان آنا پڑے گا۔ چند روز پہلے میں اس المیہ ڈرامے کی ریہرسل ملاحظہ کر چکا اور اعجاز راہی کی صورت میں اپنے مرنے اور بیٹے کی امریکہ سے آمد کا منظر دیکھ چکا ہوں۔ جنازے کے بعد اعجاز راہی کا جسد قبرستان میں اس کے بیٹے شکیل کے انتظار میں رکھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس کی بند ہو چکی آنکھیں کسی دوسرے عالم میں پہنچ کر کھل گئی ہوں گی اور بے تابی سے شکیل کی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔ یہ بھی دلچسپ اتفاق ہے کہ میرے بیٹے کا نام بھی شکیل ہے۔ مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اس کی تو کسی ائیر لائن میں واقفیت بھی نہیں۔ ٹھنڈی اور اداس رات کا وہ منظر میرے لئے دہرے صدمے کا باعث بنا۔ ایک اپنے عزیز اور پرانے ساتھی کی موت کا صدمہ اور دوسرا اپنی میت پر بیٹے کے بروقت نہ پہنچ سکنے کا۔

اعجاز راہی سے مجھے اپنی پہلی ملاقات یاد نہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ رشید امجد کے ذریعے ۱۹۶۰ء یا اس سے ذرا بعد میں ہوئی تھی جب میں مری میں کچھ عرصہ گزار کر دوبارہ راولپنڈی آیا تھا۔ میرے مری جانے تک رشید امجد ابھی اختر رشید تھا اور اس کی افسانے سے دلچسپی ابھی پڑھنے ہی کی حد تک تھی۔ میں واپس آیا اور اس سے بزم میر میں ملاقات ہوئی تو اس نے افسانے لکھنا شروع کر دیئے تھے۔ اس سے مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ کیونکہ ہم ایک ہی جگہ میں ایک ساتھ کام کر چکے تھے اور وہ میرے دو تین بھر ابتدائی افسانے جو صحیح اور عکس نو میں شائع ہو چکے تھے پڑھ چکا تھا اور میں اسے پرائیویٹ طور پر تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ بھی دیتا رہتا تھا۔ جس پر بعد میں نہ صرف اس نے بلکہ [illegible] اور خود میں نے بھی عمل کیا۔ مجھے زندگی بھر حسرت ہی رہی کہ وہ اس سلسلے میں اور افسانہ نگاری سے اپنی ابتدائی دلچسپی اور شوق کے بارے میں میرا کوئی حوالہ بھی دیتا اور میرا بھی اعجاز راہی کی طرح ذکر کرتا مگر اپنی خود نوشت میں تو اس نے یہ کہہ کر جھگڑا ہی ختم کر دیا ہے کہ اسے میرے افسانے کیسے پسند آ سکتے تھے؟ کیوں بھائی آپ نے اس وقت کونسی پی ایچ ڈی کی ہوئی اور کافکا کو پڑھا ہوا تھا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میری ملاقات جب اعجاز راہی سے ہوئی وہ جی ٹی ایس میں ملازم تھا اور رشید امجد کے ساتھ ادبی محفلوں میں آتا جاتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم راہی کا یہ اعجاز تھا کہ وہ کبھی کسی طرح کے کمپلیکس میں مبتلا نہیں ہوا اور نہ ہی اپنی سابقہ پوزیشن پر شرمسار۔ بلکہ وہ اس پر بجا طور پر فخر کرتا تھا کہ اس نے اپنی محنت سے ترقی اور علم و ادب کی منزلیں طے کیں اور سوسائٹی میں ایک بلند مقام حاصل کیا ہے۔ اس نے کئی بار اس بات کی خواہش کی کہ ہم چند پرانے دوست اس کے ہاں جمع ہو کر پرانی یادوں کو دہرائیں اور ریکارڈ کر لیں۔ ایسی ہی کچھ یادیں اس نے اپنے اس ادبی خط میں بھی محفوظ کی تھیں جو اس نے رشید امجد کو اس کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر لکھا تھا۔ میری اس سے شروع کی ملاقاتیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہوتی رہیں کہ وہ یونین لیڈر تھا اور اس کی سرگرمیاں مختلف نوعیت کی تھیں۔ پھر وہ کہیں چکلالہ میں رہتا تھا مگر ہم نئے لکھنے والوں کی انجمن، جس کی ایک شاخ میں نے اسلام آباد میں قائم کر دی تھی اور بعد میں حلقہ میں ملتے رہتے تھے۔ ہم سب ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور ایک دوسرے کی کمپنی میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتے تھے۔ میرے ہاں رات رات بھر ریڈیو گرام پر، اپنے اپنے ذاتی دکھوں کو چھپانے کے لئے تالی بجا کر غزلوں اور گیتوں کے ریکارڈ سنتے رہتے۔ اس کے ریٹائر ہونے سے پہلے اس کے پی آئی اے اسلام آباد والے دفتر میں ہماری بہت ملاقاتیں رہیں۔ میں اسے شب خون کا شمارہ پہنچانے جاتا کبھی وہ میرے

ہاں رسالہ لیے آ جاتا اور ہم دیر تک گپ شپ کرتے رہتے جسے ہماری نئی پود کی اصطلاح میں مباحثت کہا کرتے ہیں۔

آخری عمر میں پہنچ کر اسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس نے اپنا بہت کچھ رشید امجد پر وار دیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے حصے کے بہت سے افسانے بھی نہیں لکھے اور ایک کتاب کے بعد افسانہ نگاری کا کام اسے سونپ دیا ہے اور رشید امجد کی مدح سرائی میں فنا فی الرشید ہو گیا ہے۔ مگر رشید امجد کی طرف سے اسے وہ رسپانس نہیں ملا جو ملنا چاہیے تھا۔ وہ رشید امجد کی شان میں چند گستاخیاں کرتا کہ بہت سیانا، چالاک اور سرور کامران والے منافقت کے مستند کی وکیل چلی ہے مگر کیا کروں میرا یار ہے۔ رشید امجد کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر اپنے خط میں بھی اس نے کچھ ایسی ہی دبی دبی شکایتیں کی تھیں۔ مثلاً

☆ "یوں بھی ساری اچھی چیزیں تم اپنے لیے رکھنے کے عادی ہو"

☆ "پھر تم سالہا سال کہانیاں لکھتے رہے اور میں تمہیں داد دیتا رہا۔ گھنٹوں ایک ایک کہانی پر غور کرتے، تم دوبارہ لکھتے اور پھر رکھ لیتے۔ سالہا سال تم لکھتے اور میں تمہیں داد دیتے میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ دونوں کو یاد نہ رہا کہ مجھے بھی کہانی لکھنا ہے اور جب یاد آیا تو اس وقت تمہارا قد ۶ فٹ ایک انچ ہو چکا تھا اور میرا ۵ فٹ ۱۱ انچ پر ہی رک گیا تھا"

یوں تو میرے سمیت ہمارے گروپ کے کئی لوگ سیلف میڈ اور محنتی تھے۔ رشید امجد، اعجاز راہی، منظر الاسلام اور احمد داؤد، سرور کامران شاید پہلے سے جانا پہچانا تھا لیکن محنت میں عظمت کی سب سے روشن مثال اعجاز راہی تھا جس نے کئی ملازمتیں بدلیں۔ بار بار زیرو سے شروع کیا۔ بہت سے امتحانات پاس کیے۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کے علاوہ بی اے ایل ایل بی بھی کر ڈالا۔ اس کے افریقہ، ایشیا، امریکہ اور یورپ کی مختلف زبانوں سے تراجم کا کام دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس نے کس قدر استعداد حاصل کر لی تھی۔ اس نے سات نوبل انعام یافتہ ادیبوں پر تنقید و تحقیق کا کام کیا۔ اور اردو افسانے میں علامت نگاری پر بہت اہم اور شاید سب سے بھرپور کتاب تصنیف کی۔ اس کے افسانوں کا مجموعہ "تیسری ہجرت" ہمارے افسانہ نگاروں میں سب سے پہلا مجموعہ تھا۔

وہ ایک اچھا شاعر بھی تھا اور "بے برکت دعائیں" کے نام اس سے اس کا خوبصورت شعری مجموعہ شائع ہوا تھا۔ اس نے شام، ہالے اور مصلوب کے نام سے دو ناول بھی لکھے۔ اس کا تیسرا ناول خواہشوں کے جزیرے بھی مکمل ہو چکا تھا۔ وہ کبھی کبھار افسانہ بھی لکھ لیتا۔ اس کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "تیری شاخ" زیر طبع تھا مگر اس کا زیادہ رجحان اب تنقید و تحقیق کی طرف ہو گیا تھا۔ اس کی تنقیدی کتابوں میں اظہار، اردو افسانے میں علامت نگاری، اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ وغیرہ شامل ہیں۔ اس نے تنقید و تحقیق سے متعلق بہت سی ٹیکنیکل کتابیں بھی لکھیں۔ جیسے تاریخ خطاطی، دست شناسی، ادراک، ماورائے حیات، اصول تنقید، تحقیق اور اصول وضع اصطلاحات، اردو زبان میں ترجمہ کے مسائل، املا اور رموز اوقاف وغیرہ۔

اعجاز راہی کی زیر طبع کتابوں میں ناول اور افسانوی مجموعہ کے علاوہ بیسویں صدی کے نوبل انعام یافتہ ادیب، اردو افسانے کی ایک صدی اور جدید تنقید کے چار ستون اہم ترین کتابیں ہیں۔

موجودہ دور کے حالات اور نفسا نفسی کے کلچر کو دیکھ کر کچھ عرصے میں نے دوستوں کے معاملے میں محتاط رویہ اختیار کر لیا ہے اور مولانا الطاف حسین حالی کی اس بات پر بہت دیر سے عمل شروع کیا ہے کہ "بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ، مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ" کیونکہ اتنی عمر گزارنے کے بعد اب کہیں جا کر سمجھ میں آیا کہ جن دوستوں کو آپ عزیز رکھتے ہیں ان سے تھوڑا فاصلہ ضروری ہے ورنہ وہی دوست جو آپ کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے نہیں تھکتے اور آپ کی بڑائی اور خوشی میں شریک ہوتے ہیں وہ آہستہ آہستہ پنجابی زبان والے شریک کا روپ دھار لیتے ہیں اور آپ کی جڑیں کاٹنے لگتے ہیں۔ لیکن ایک زمانے میں ہم سب ایک دوسرے کے مخلص تھے اس کا اندازہ ایک چھوٹے سے واقعے سے لگا لیجیے۔

اعجاز راہی کی رحلت پر مجھے ڈاکٹر ایم آئی حسین (خالدہ حسین کے میاں) کی تعزیتی ای میل آئی تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ انہوں ان کے اہل خانہ یا دیگر دوستوں کی بجائے مجھ سے کیوں اظہار تعزیت کیا ہے۔ پھر مجھے ۱۹۸۲ء کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب اعجاز راہی کو جبری ریٹائر کر دیا گیا تھا اور وہ بے روزگاری کی چکی میں پس رہا تھا۔ ہم سب دوست اپنی اپنی جگہ اس کی ملازمت کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈاکٹر ایم آئی حسین ان دنوں نیشنل بک فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ محترم فتح محمد ملک اور میرے ان سے اچھے تعلقات تھے۔ چنانچہ ہم دونوں نے باری باری ان سے اعجاز راہی کی ملازمت کے لیے سفارش کی۔ مشکل یہ پیش آ رہی تھی کہ اعجاز راہی زیر عتاب تھا اور اسے سرکاری ملازمت دینا رسک لینے کے مترادف تھا چنانچہ ڈاکٹر ایم آئی حسین ٹال کر رہے تھے۔ انہی دنوں میں بیمار پڑ گیا اور پولی کلینک میں ایک ماہ کے لیے داخل رہا۔ ایک روز جب مجھے بائی پاس کے لیے آپریشن تھیٹر لے جایا جا رہا تھا، ڈاکٹر صاحب میری مزاج پرسی کو آئے اور اس بات سے بہت متاثر ہوئے کہ آپریشن تھیٹر جاتے ہوئے میں نے ان سے اپنے لیے دعا کی بجائے اعجاز راہی کی ملازمت کا وعدہ لینے پر اصرار کیا۔ وہ بڑے دل کے افسر اور مخلص دوست تھے۔ انہوں نے اطمینان دلایا اور وعدہ نبھایا۔ تاہم ڈاکٹر ایم آئی حسین نے اعجاز راہی سے میرے انہی پرخلوص تعلقات اور دوستی کی بنا پر مجھے تعزیتی پیغام بھجوایا۔ ان کا ایک بار پھر شکریہ۔

ضمیر جعفری صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ میں نے اعجاز راہی

کو جب پہلی بار حلقہ میں تنقید کرتے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا جیسے غصے میں بھرا ہوا کوئی پٹھان درخت پر کلہاڑا چلا رہا ہو اور اسے یہ بھی پتہ نہ چلے کہ درخت کب کا گر چکا ہے۔ لیکن اعجاز راہی تو کلہاڑا چلاتے چلاتے خود درخت بن گیا۔ اس پر زمانے نے بہت کلہاڑے چلائے مگر وہ ہمیشہ ثابت قدم رہا۔ ہم سب دوستوں میں صرف ایک وہی تھا جس نے قید و بند کی صعوبتیں جھیلی تھیں اور اسی میں یہ جرات تھی کہ وہ فوجی ڈکٹیٹرشپ کے دور میں مزاحمتی افسانوں پر مشتمل ”گواہی“ جیسا مجموعہ مرتب کر کے شائع کرے اور اس گواہی کا اعلان کرے جو سچے ادیب اپنے اپنے عہد میں دیتے آئے ہیں۔ مجھے یاد ہے میں اور رشید امجد اسے ڈرتے ہوئے تھے کہ ہر روز ایک دوسرے سے پوچھتے کوئی پوچھ گچھ کرنے تو نہیں آیا مگر اعجاز کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔

اعجاز راہی تھوڑا زود رنج بھی تھا اور جہاں زیادہ پیار ہو وہاں ناراضی بھی جلدی ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ تو کبھی خفگی نہیں ہوئی مگر ایک بار ڈاکٹر ایوب مرزا کی وجہ سے ان کی رشید امجد سے سخت ناراضی ہو گئی۔ اس خفگی پر بہت سے دوستوں نے تیل ڈالنا ضروری سمجھا۔ بڑھتے بڑھتے یہ سلسلہ کی سختیوں تک پھیل گیا۔ وہ دونوں میرے پرانے دوست اور ساتھی تھے۔ میں نے ایک روز کسی فنکشن کے بہانے انہیں اپنے گھر بلایا۔ دونوں نے آنے کا وعدہ کرنے سے پہلے اطمینان کرنا چاہا کہ ان کا ایک دوسرے سے سامنا نہ ہو۔ میں نے دونوں کو فرداً فرداً یقین دلایا کہ صرف اسے ہی مدعو کیا ہے۔ پہلے رشید آیا۔ میں نے اسے دوسرے مہمانوں کے ساتھ بٹھایا اور گیٹ پر نظر رکھی۔ جونہی اعجاز آیا میں باہر نکل کر اسے گیراج میں لے گیا اور اپنے سوزوکی ڈبے میں بٹھا دیا۔ پھر میں رشید کو بلا لایا اور اسے ڈبے کے اندر دھکیل کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا تم دونوں میرے سامنے ایک دوسرے سے لڑو جھگڑو ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ کر غصہ نکال لو مگر جب تک تم دونوں گلے نہیں ملتے، میں دروازہ کھولوں گا نہ ہی کھانا ملے گا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ خوب لڑے جھگڑے ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کیں۔ پتہ چلا اعجاز راہی کی رشید امجد کے ہاں پایوں کی دعوت تھی جس میں وہ اپنے ساتھ ڈاکٹر ایوب مرزا کو بھی لے آیا کیوں کہ وہ دونوں کے مشترکہ دوست تھے۔ اس پر کہیں رشید امجد نے کہہ دیا کہ فوارہ چوک میں بہت لوگ ہوتے ہیں وہاں سے کچھ اور ساتھ لے آتے۔ اس پر وہ بھڑک اٹھا اور ایوب مرزا کو بغل میں داب وہاں سے روٹھ کر نکل پڑا۔ بات یہاں پر ختم ہو جاتی تو خیر تھی مگر ستم یہ ہوا کہ رشید امجد ان کے پیچھے آیا۔ وہ سمجھے منانے کے لیے آ رہا ہے مگر اس نے ان کے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ سارا جھگڑا دروازے کو زور سے بند کرنے کا تھا۔ میں نے کہا یار گوردوارے کا وہ دروازہ ہو سکتا ہے آہستہ بند کریں تو بھی لگتا ہے بہت زور سے بند کیا گیا ہے۔ جانے دو۔ اندر مہمان پریشان ہو رہے تھے کہ میزبان سمیت یہ لوگ کہاں گئے اور یہ لڑنے بولنے کی آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ لیکن پھر آخر کار ان دونوں کی صلح ہو گئی۔

اعجاز راہی کا حلقہ ارباب ذوق سے پرانا اور گہرا تعلق تھا۔ وہ حلقہ اسلام آباد کا ہو، پنڈی کا یا نیو یارک کا۔ اس نے ہر جگہ بہت مثبت اور فعال کردار ادا کیا۔ دو برس پہلے میں نیو یارک کے حلقہ میں پہنچا تو وہاں ہر طرف اعجاز راہی کا طوطی بول رہا تھا۔ جوہر میر سے تو اس کی بہت ہی گہری دوستی تھی۔ اشرف میاں، جاوید پاشا اور نصرت انور سب ہی اس کے گن گاتے تھے۔ بلکہ اب حسن عباس رضا بھی ان میں شامل ہو گیا تھا۔ اعجاز راہی میں بے شمار خوبیاں تھیں لیکن یہ خوبی ان سب پر بھاری تھی کہ وہ کبھی جھوٹ اور تصنع سے کام نہیں لیتا تھا۔ کسی سے حسد نہیں کرتا تھا۔ وہ اندر باہر سے ایک جیسا روشن اور منور تھا۔ بے حد محبت کرنے والا اور مہمان نواز اور دوسروں کے کام آنے والا۔

مجھے یاد آ رہا ہے۔ دو سال پہلے کی بات ہے۔ میری چھوٹی بہن کا جدہ، سعودی عرب میں انتقال ہو گیا۔ اس کا تابوت پی آئی اے کے ذریعے اسلام آباد پہنچ رہا تھا اور ہم نے اسے فوراً گاؤں لے کر جانا تھا۔ خیال تھا کہ ائرپورٹ پر جنازہ پڑھ لیا جائے تاکہ یہاں کے عزیز رشتہ دار بھی شامل ہو جائیں۔ لیکن ان دنوں سیکیورٹی کی وجہ سے ائرپورٹ اتھارٹیز اس کی اجازت نہیں دے رہی تھیں۔ میں نے فون پر اعجاز راہی کو اطلاع دی اور مدد چاہی۔ اگلی صبح وہ نہ صرف ہم سب سے پہلے خود ائرپورٹ پر موجود تھا بلکہ میرے ایک ایک عزیز کو گلے لگا کر تعزیت کا اظہار کرتا رہا اور ہمیں گاؤں روانہ کرنے کے بعد وہاں سے لوٹا۔

ایک بار مجھے اس کی ایک لیڈرانہ تقریر سننے کا بھی اتفاق ہوا۔ ان دنوں سی ڈی اے میں پی آر تھا اور سی ڈی اے کی یونین کا کوئی بہت بڑا اجتماع تھا جس میں سیاستدان اور دوسرے محکموں کے یونین لیڈران بھی حصہ لے رہے تھے۔ اعجاز راہی جب ایک مزدور لیڈر کی حیثیت سے مائک پر آیا تو اس کا جوش و جذبہ دیکھ کر اور اس کی تقریر سن کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیوں زیرِ عتاب رہتا ہے اور کیوں اسے بار بار نوکری سے برخواست کیا جاتا ہے۔ وہ ایک روشن خیال اور ترقی پسندانہ سوچ کا حامل کومٹڈ ادیب تھا اور میں سمجھتا ہوں ہر وہ شخص جس نے زندگی کے دکھ اٹھائے ہوں، آگے بڑھنے کے لیے ٹھوکریں کھائی ہوں اور جسے عملی جدوجہد کرنا پڑی ہو اسی طرح روشن خیال، انسان دوست اور ترقی پسندانہ نظریات کا حامل ہوتا ہے جیسا اعجاز راہی تھا۔ اللہ اسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اس کے اہل خانہ اور عزیز و اقارب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اعجاز راہی خوبصورت شخصیت اور حسنِ سلوک کی وجہ سے عزیزوں اور دوستوں کے دلوں میں ہی نہیں، اپنی بیش قیمت تصنیفات کی وجہ سے علم و ادب کی دنیا میں بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔

تخلیقِ عصر

تازہ تصانیف کا تعارف

عطیہ سکندر علی

نورِ علی نور

مجھ میں بیدار آرزو رکھیو　　حشر تک تو جستجو رکھیو
دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں میں　　یا خدا میری آبرو رکھیو

خطۂ پوٹھوار بالخصوص راولپنڈی، اسلام آباد اپنے جن چند فرزندان زمین پر مدت تک فخر کرے گا اُن میں جناب جمیل ملک کا نام نامی سرِ فہرست ہوگا۔ جناب جمیل ملک مرحوم فنی طور پر ایک بڑے قلم کار اور شخصی طور پر ایک عظیم انسان تھے۔ دولت، شہرت، ناموری کے بے شمار مواقع اُن کی دسترس میں ہوتے ہوئے بھی اُنہوں نے نہایت سادہ، مہذب اور باوقار زندگی گزار کر لہو لعب کے اس دور میں ایسی عمدہ مثال قائم کی ہے کہ اردو ادب نہایت اعتماد اور احترام سے جناب جمیل ملک کی ذات کو رول ماڈل کے طور پر پیش کر کے نئے اور نوجوان لکھنے والوں کو جناب جمیل ملک کی پیروی کے ذریعے اعلیٰ انسانی روایات کا پاسدار بنا سکتی ہے۔ جناب جمیل ملک نے حمد، نعت، غزل، نظم، ہائیکو اور تنقید کے ذریعے ادب کی بے پناہ خدمت کی ہے۔ کسی طرح کی گروہ بندی، تعصب، تنگ نظری اور نمود و نمائش جناب جمیل ملک کو چھو کر بھی نہیں گزرا۔ اُن کی اچانک وفات کے باعث اُن کے بہت سے ادبی کام نامکمل رہ گئے ہیں۔ اُنہوں نے جس قدر بھی غیر مطبوعہ ادبی ورثہ چھوڑا ہے اُن کے لائق ہونہار اور شریف النفس صاحبزادے جناب نوید جمیل آہستہ آہستہ اسے طباعت کی شکل دے رہے ہیں۔ "نورِ علی نور" جناب جمیل ملک کے حمد، نعت اور منقبت پر مشتمل کلام کا مجموعہ ہے جس کے فنی مقام کی بابت ہم کوئی بات کرنے کے قطعی اہل نہیں۔ ایک زمانہ بلکہ کئی زمانوں کے بلند قامت اہلِ قلم جناب جمیل ملک کی بلند قامتی کو خراج پیش کر چکے ہیں۔ ہم بھی "نورِ علی نور" کے اس تعارف کے ذریعے ایک طرح سے جناب جمیل ملک مرحوم کو خراجِ تحسین اور خراجِ عقیدت ہی پیش کر رہے ہیں۔ مرحوم کے بڑے پن کے باعث ہم بھی اُن کی محبت اور صحبت سے مستفید ہوتے رہے ہیں اور اپنے پروردگار سے ہر وقت یہی دعا کرتے ہیں کہ ہمیں بھی جناب جمیل ملک مرحوم کی بے شمار صفات میں سے چند ایک عطا فرمادے۔ آخر میں جناب جمیل ملک مرحوم کی تخلیق "نورِ علی نور" کی دستیابی اور قیمت سے آپ کو آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ "نورِ علی نور" ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور اندرونِ ملک دو صد پاکستانی اور بیرونِ ملک 10 ڈالر میں دستیاب ہے جسے حاصل کر کے آپ نہ صرف اعلیٰ شعری ذوق کی تسکین کر سکیں گے بلکہ ایک بڑے قلم کار اور عظیم انسان کو خراجِ عقیدت بھی پیش کر یں گے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ "اردو ادب" میں اب بڑوں کے بجائے بونوں کا راج ہے۔

چنار کے نیچے

تعصب، بغض، حسد اگرچہ ناپسندیدہ عمل گردانے جاتے ہیں مگر ان جذبات کا اظہار اگر مثبت معنوں میں کیا جائے تو یہ احساسات لائقِ توجہ گردانے جاتے ہیں۔ جب بھی ہم کسی خوش شکل، خوش فکر، خوش خیال، خوش احساس اور خوش عمر شخص کو بالخصوص ہندوستان کے کسی حصے میں اردو زبان و ادب کے عشق میں گرفتار دیکھتے ہیں تو ہماری ناامیدی خوش امیدی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جناب دیپک بدکی اردو زبان و ادب کے حوالے سے بڑی قوت اور امکانات کے حامل قلم کار ہیں۔ اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ ملازمت اور اعلیٰ معاشرتی مقام کے باوصف اردو زبان و ادب بالخصوص اردو افسانے سے اُن کی والہانہ وابستگی بہت سے روشن امکانات کا پتہ دے رہی ہے۔ "چنار کے نیچے" اُن کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے جس میں کُل تیس کہانیاں شامل ہیں۔ یہ کہانیاں برائے کہانیاں ہرگز نہیں ہیں۔ ان کہانیوں میں جیتے جاگتے، چلتے پھرتے انسانوں کے روز و شب اس ہنرمندی اور مشاقانہ طرز پر منعکس کئے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کو کہیں بھی کہانی کا گمان گزرتا ہے اور نہ ڈرامائی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ کہانی خود بڑی سبک روی سے اپنا راستہ تلاشتی اور تراشتی ہوئی قاری کے رگ و پے میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بقول جناب شفیق الرحمن: دیپک بدکی کے افسانے دراصل افسانہ نگار کے اندر کی آواز ہے۔ افسانہ نگار زندگی کے مختلف مراحل میں جن تجربات سے گزرا ہے اُس نے اُن تجربات و مشاہدات کو ادب کے سانچے میں ڈھال کر خوبصورت گلدستہ بنایا ہے۔ فتح شفائی صاحب فرماتے ہیں: دیپک بدکی کے افسانے اپنا الگ انداز رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے پڑھ کر بلاجھجک اُن کے شاندار مستقبل کی بشارت دی جا سکتی ہے۔ سیدہ نسرین نقاش کشمیر بھارت سے رقم طراز ہیں: اس کتاب کا اسلوب بالکل نیا ہے۔ دیپک بدکی کی تحریروں میں ایک عجیب قسم کی سچائی ہے، تلاش کا ایک مسلسل عمل ہے جس میں اس کو اچھے ادب کی روح سے تعبیر دیتی ہوں۔ ان کے افسانوں میں حقائق اور نفسیاتی جنگ کا عمدہ نمونہ ہوتے ہیں۔ دیپک بدکی قاری کی فکر کو محدود نہیں کرتے بلکہ ایک نئی آزادی اور تعبیر و توضیح کے نئے امکانات سے آشنا کرتے ہیں۔ بلاسبب اور بے موقع الفاظ کا طور مار

باعث ہے حقیقت اور سچائی کسی قدر سب جلا کرتی ہے لہٰذا ہم نے الفاظ کا ضیاع کئے بغیر آپ کی توجہ جناب دیپک بُدکی کے تازہ افسانوی مجموعے "چنار کے پنجے" کی جانب مبذول کرا کر ادب کے ایک باہنر فنکار کو آپ کے روبرو کرنے کی سعی کی ہے آپ کا اشتیاق، آپ کی لگن اور آپ کا ذوقِ سلیم "چنار کے پنجے" کی نسبت آپ کو تحریک دیتا ہے تو حق بہ حق دار رسید کے مترادف ہوگا لہٰذا اولین فہرست میں! امر جیت سنگھ، اردو بیلی کیشنز، 922، کوچہ روہیلا خان، دریا گنج دہلی بھارت سے رجوع کیجئے۔

سب سے پہلے پاکستان

"مجاہد کی تعریف یہ وہ مسلمان فرد (فرد کا لفظ یا معاملہ) جو اللہ کی خوشنودی کی خاطر حق کے لئے سچ سے اپنے جان و مال کی قربانی دیتے ہوئے باطل اور کفر کے خلاف جنگ لڑتا ہے مجاہد کہلاتا ہے یہ جنگ جو کسی مسلمان کو پنجہ استبداد اور مکمل استحصال سے آزادی دلائے جنگ آزادی یعنی جہاد کہلاتی ہے اور جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے اب یہ کہ حق سچ کیا ہے یہ قرآن و حدیث اور دنیا کے تمام مذاہب، نظریات، افکار اور فلسفوں کے ذریعے صاف طور سے بتا دیا گیا ہے کہ حق وہ ہے جو ایک اللہ کا سچ ہو اور سچ وہ ہے جو ہر انسان کی ذات سے بالاتر ہے اس طرح مجاہد وہ ہے جو اللہ کی رضا اور خواہش کے مطابق حق اور سچ کے لئے لڑتا ہے"

درج بالا اقتباس کرنل دل نواز دل کی تازہ تصنیف "سب سے پہلے پاکستان" سے لیا گیا ہے جس میں کرنل صاحب نے سچے مجاہد کی تعریف بیان کی ہے۔ افواج پاکستان کے ذمہ دار افسر محبِ وطن پاکستانی اور شاعر و ادیب کے طور پر کرنل صاحب اچھی شہرت اور حیثیت کے مالک ہیں۔ پاکستان بالخصوص موجودہ عالمی منظرنامے کو سامنے رکھتے ہوئے کرنل صاحب نے بہت سے اہم موضوعات کو اپنے انداز میں استراحت سے پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے کتاب کا عنوان "سب سے پہلے پاکستان" ہی وطن سے اُن کی محبت کا خاص مظہر ہے۔ ہر سچے پاکستانی کی طرح کرنل صاحب بھی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہماری سلامتی ہمارے وطن کی سلامتی سے مشروط ہے لہٰذا ہمیں ہر حال میں اپنے وطن کی سلامتی کو اولیت دینا چاہئے۔ بہرحال کرنل صاحب نے ایک مجاہد کی تعریف، ایک دہشت گرد کی تعریف، اسلام، سب سے پہلے پاکستان کیوں، اعتدال پسند روشن خیالی، تہذیبوں کا ٹکراؤ اور قیامت، تنازعہ کشمیر اور اس کا حل، حرفِ تحریر، بھارت کا اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مستقل نشست کا سوال، جنگ نہ ہونے دیں گے، ہم ہوں گے کامیاب، اسلام آباد اور دہلی کے درمیان مجوزہ بات چیت، حمود الرحمٰن رپورٹ، دینی مدارس، پاکستان وقت کے فیصلہ کن دوراہے پر، موجودہ حکومت کی اولین و آخری ترجیح، پاکستان میں بحالی جمہوریت کا نامکمل سی ٹی بی ٹی پر دستخط، کیا مارشل لاء لگانا ضروری تھا وغیرہ جیسے اہم اور نازک معاملات پر اپنے نقطہ نظر سے بحث بھی کی ہے اُن کے خاص زاویوں پر روشنی بھی ڈالی ہے اور کچھ معاملات پر فیصلہ کُن رائے بھی دی ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان، قائداعظم، علامہ اقبال، چوہدری رحمت علی جیسے قومی زعما کے لئے منظوم خراجِ عقیدت اور کئی اہم قومی موضوعات کو بھی منظوم شکل میں عمدگی سے پیش کیا ہے۔ ہمارے خیال میں کرنل دل نواز دل کی یہ کوشش صائب اور بارآور ہی تصور کی جائے گی۔ مگر موجودہ قومی اور بین الاقوامی حالات کا تقاضا نیا دور اتنا کہ لبرل، سائنٹیفک اور جدید عالمی تقاضوں اور چیلنجوں کو پیشِ نظر رکھنا اور تصورات کی دنیا سے باہر نکل کر حالات کا مقابلہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ بہرحال کرنل صاحب نے بھی لبرل سوچ اپنانے کی کوشش کی ہے مگر وہ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر افواج پاکستان اور موجودہ حکمرانوں کی وکالت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر آدمی کا اپنا نقطہ نظر اور زاویۂ نگاہ ہوتا ہے ہم نے اپنی رائے پیش کر کے دل تھام کر کرنل صاحب کی تازہ تصنیف پر دعوتِ مبارکت دی ہے اس طرح ڈائیلاگ کی ابتدا ہوگی اور ڈائیلاگ ہی ہمارے خیال میں مہذب قوموں کا مسائل کو جانچنے پرکھنے اور حل کرنے کا بہترین طریقہ ہے اور "سب سے پہلے پاکستان" تین سو تین صفحات کی مجلد کتاب ہے جس کی قیمت صرف -/650 روپے نہایت زیادہ مگر دستیابی کا پتہ مندرجہ ذیل ہے۔ تحریر، کیر امتزیت، اُرد بازار لاہور۔

سیریا میں دس روز

نامور شاعر، افسانہ نگار، نقاد، سفرنامہ نگار، مترجم اور منفرد مزاج کے حامل جریدے "انشا" کولکتہ کے مدیر جناب ف۔ س۔ اعجاز ہشت پہلو شخصیت، دو تین نسلوں کے مالک اور تجزیہ و مشاہدے کے قلم کار ہیں۔ کم و بیش پندرہ کتابوں کے مصنف جناب ف۔ س۔ اعجاز بے شمار تخلیقی اور تنقیدی کارہائے نمایاں سرانجام دینے کے باوجود نامِ نامی نہ ہونے اور تازہ خیال کے مالک ہیں۔ "سیریا میں دس روز" کے عنوان سے عرب دنیا کے انتہائی اہم اور قدیم ملک کے دورانِ دورے کے دوران جس قدر تفصیل اور ترتیب سے انہوں نے اس اہم عرب ملک کی بابت معلومات فراہم کی ہیں اُس سے جناب ف۔ س۔ اعجاز کے تجسس اور اشتیاق کا پتہ لگتا ہے اس سفر میں جناب ف۔ س۔ اعجاز نے ملک شام کی بابت وہ تمام معلومات مع اپنے تاثر کے اس طرح اپنے قاری تک منتقل کی ہیں کہ کتاب کے مطالعے کے دوران قلم کا ساحر آپ کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اگر وقت آڑے نہ آئے تو "سیریا میں دس روز" کو ایک ہی نشست میں مکمل پڑھے بغیر قاری کے لئے کوئی چارہ نہیں رہتا۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ ہر ملک کا محکمہ سیاحت اپنے ملک کی بابت نہایت بہیود کتابچے اور دیگر معلومات تفصیل سے فراہم کیا کرتے ہیں جن کی مدد سے زیرِ بحث ملک کی تاریخ، مختصر جغرافیہ، محلِ وقوع

رقبہ، آبادی، موسم اور مذہب و زبانوں کی بابت آسانی سے معلومات فراہم کی جا سکتی ہیں۔ چونکہ جناب ف۔س۔ اعجاز ایک جینوئن تخلیق کار ہیں لہٰذا انھوں نے ناول، افسانہ، سفرنامہ کی تکنیک کی باہمی آمیزش سے نہایت دلچسپ اور دلآویز منظر کشی کی ہے۔ تمام اہم معروضات کو الگ باب سے موسوم کر کے کچھ اس طرح سپردِ قلم کیا ہے کہ قاری کو ذہنی آسودگی کے ساتھ بصری لذت کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔ تمام کے تمام تاریخی مقامات اور ثقافتی نمونہ جات کے ہمراہ دس دنوں پر مشتمل تمام اہم ایونٹ کا رنگین عکس سفرنامہ بھی کتاب کو زیادہ اہم بنا رہا ہے۔ کاغذ، کمپوزنگ اور طباعت کے اعلیٰ معیار کی حامل یہ نادر کتاب ایک سو چھہتر صفحات مجلد پر مشتمل ہے جو ہندوستان کے قاری کے لئے دو سو پچاس، پاکستان کے قاری کے لئے تین سو روپے، برطانیہ کے لئے دس پونڈ اور امریکہ کے لئے پندرہ ڈالر میں انشا پبلیکیشنز، 25۔ زکریا اسٹریٹ کولکاتہ 70073 بھارت سے بآسانی دستیاب ہے۔

آئینے کا آدمی

احتجاجی ادب ایک طرح سے اپنے عصر کی بدصورتیوں اور ناہمواریوں کو نشان زد کرنے کا بہترین طریقہ تصور کیا جاتا ہے۔ اول اُردو ادب میں اس کی مثال اس طور نہیں ملتی جس طرح حقیقت کا تقاضا اور حالات کا جبر، گھٹن کا ماحول پیدا کئے ہوئے ہیں۔ کچھ بیدار مغز اور مضطرب قلب کے حامل قلم کار اس طرح کی کوشش کرتے ہیں تو مصلحت پسند لوگوں کو اس کا نوٹس لینے اُس کی پیروی اور پردہ پوشی سے باز رکھتی ہے۔ جناب صبا اکرام کی تازہ شعری تخلیق "آئینے کا آدمی" اپنے دور کی لاوارث جس کو اس قدر نمایاں اور آویزاں کر رہی ہے کہ سرورق سے لے کر پس ورق تک چیخ چیخ کر قاری کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ رہا ہے۔ قلت صفحات کے پیشِ نظر ایک نظم صرف ایک نظم جناب صبا اکرام کے تازہ شعری مجموعے سے ملاحظہ فرمایئے۔ اور ہماری رائے سے ہم آواز ہو جایئے!

دوستو آج بھی کوئی اصدائے ولادت آئی / آخر لپک کی خوشی / نہ ہونٹوں پہ ہوتی روشنی / نہ ہاتھوں میں / دعاؤں کے کنول کھلے / وہاں تو آج / ہونٹوں پہ اُگے تھے / خاندروں کے کالا ورثن کے ہاتھوں میں / پتھر تھے / نہ جانے کس جنوں میں / آج اپنے گھر سے نکلے تھے / کہ شیطان پہ کنکر پھینکنے والے / خدا کے گھر پہ ہی / پتھر ہو کر بیٹھے / دوستو آج بھی کوئی آخر کو نو میں کوئی آدمی گھر سے نہیں نکلا!

"آئینے کا آدمی" میں شامل کوئی بھی نظم ایسی نہیں ہے جسے پڑھتے وقت سرسری طور پر گزر جایا جائے۔ ہر نظم، خیال، احساس اور الفاظ کی ندرت کے باعث بار بار پڑھنے، سوچنے اور کچھ کر گزرنے پر مجبور کرتی ہے بقول شمس الرحمن فاروقی صاحب "صبا اکرام نے عام لوگوں سے بہت زیادہ مختلف زندگی گزاری ہے

ہجرت کے دوہرے تجربے، مصائب اور جدوجہد نئے ماحول کو اپنانے اور ازسرِ نو تعمیر کرنے کی کوششوں نے ان کے شعر پر گہرے نشان چھوڑے ہیں۔ اپنے حوادث اور تجربات کو وہ اہلِ جہاں کی خدمت میں من و عن واپس نہیں کرتے بلکہ انھیں اپنی روح میں اتار کر تخیل کے استحالاتی عمل سے گزار کر تمثیل و علامت کا رنگ دے کر نئی زندگی عطا کرتے ہیں...... ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کا فرمان ہے: صبا اکرام کی شاعری اس اعتبار سے علامتی ہے کہ اس نے اشیا کو محسوسات کے ہالے میں لے کر انھیں اس قدر منقلب کر دیا ہے کہ ان میں ارد گرد کی دنیا کے سائے تیر آئے ہیں۔ آئینہ اسی لیے صبا اکرام کا خاص امیج ہے کہ آئینہ اپنا ہاتھ بڑھا کر اشیا کو نہیں چھوتا بلکہ ارد گرد کی اشیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے...... "آئینہ کا آدمی" ایک سو ساٹھ صفحات کا ایک ایسا قیمتی نسخہ ہے جس کے عوض محض ایک صد ساٹھ روپے نہایت حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ "آئینے کا آدمی" مندرجہ ذیل پتے پر دستیاب ہے۔ C-102 روفی سن سیٹ، ہوم گلشن عمیر، زلیس کلب، کراچی 75280۔

نئے عہد کے گیت کار

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی جس توانائی اور تیز رفتاری سے اُردو ادب کا ذخیرہ کتابوں کا تحفہ دے رہے ہیں۔ اُس سے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شاید ہی مگر اردو ادب میں یقیناً کثیر التصانیف مصنف کے طور پر یاد کئے جائیں گے۔ "ابراہیم اشک ۔ نئے عہد کے گیت کار" اشک صاحب کی بابت لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق صاحب کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے نئے نئے طرز کی انداز میں مضامین کی یکجائی کے بعد فن کی ترتیب اور تدوین میں ہنرمندی کو بروئے کار لاتے ہوئے ذاتی اور تاثراتی افکار کے ساتھ اپنے عہد کے نامور شاعر، افسانہ نگار، گیت نگار، صحافی اور نقاد جناب ابراہیم اشک کے مشہور و معروف فلمی گیتوں اور غزلوں کی نسبت احباب کے افکار و خیالات کو ایک جلد میں مہیا کر کے جناب ابراہیم اشک کے چاہنے والوں کے لئے مستحسن کام کیا ہے۔ کم و بیش تیس سالوں پر محیط جناب ابراہیم اشک کی فلمی و غیر فلمی جد و جہد کی نسبت احباب کے تاثرات کچھ اس نوعیت کے ہیں۔ "ابراہیم اشک کے گیتوں میں معنی و مفاہیم کی سلاستیں ہی نہیں ملتیں بلکہ الفاظ کی قوت سے فکر و خیال کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ابراہیم اشک کا ذہن علم سفینہ اور علم سینہ کا توازن اور خوشگوار امتزاج رکھتا ہے اس لئے ان کے گیتوں میں کائنات اصغر اور کائنات اکبر دونوں محیط ہیں۔" ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ...... ابراہیم اشک کے گیت ہندوستانی مزاج میں پوری طرح رچے بسے ہوتے ہیں وہ چاہے کرشن رادھا کی بات کرے یا پھر حمد گیت کہے یا پھر ہندوستانی لڑکی کے ہونٹوں پر بکھر اٹھتا "بابا اب آئیں گے" کی بات کہے۔ ہر

جگہ زندگی کی سچائی اُبھرنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر عزیز اندوری...... بلاشبہ ابراہیم اشک آج ہندوستان کے اہم گیت کاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے گیتوں میں وہ تمام خوبیاں اور خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں جو ایک اچھے گیت کار میں ہونا چاہئے۔ جاوید اختر اور ندا فاضلی کے ساتھ اُن کا شمار اُن گیت کاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے گیت کے اعلیٰ معیار کو اسی روح کے مطابق سنبھالا اور سنوارا ہے۔ ڈاکٹر سیفی سرونجی...... ابراہیم اشک اپنے گیتوں میں اعلیٰ خیالات، انسانی عظمت اور بڑائی کی بات ہی نہیں کرتے بلکہ بڑے پتے کی باتوں کو لفظوں کی عظمت اور خیال کی ندرت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر امر پندر...... اشک کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو فلموں تک محدود نہیں رکھا بلکہ علم و ادب، تنقید، گیت نگاری، مرثیہ نگاری اور افسانہ نگاری میں بھی زورِ قلم دکھایا ہے۔ اُردو شاعری میں نئے تجربات کرنے نئی اصنافِ سخن ایجاد کرنے کے باوجود انکساری کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ قاضی مشتاق احمد...... قریب دو درجن مضامین میں سے چند مضامین سے اقتباس پیش کرنے کا مقصد جناب ابراہیم اشک کے فنی مقام و مرتبے سے قاری کو آگاہ کرنا ہے۔ فلم کے حوالے سے دلچسپی کے حامل قارئین کے لئے ہم اُن چند مشہور فلموں کے نام تحریر کر رہے ہیں جن کے گیت جناب ابراہیم اشک نے تحریر کئے ہیں۔ "کہو نا پیار ہے، کوئی مل گیا، جانشین، اعتبار، آپ مجھے اچھے لگنے لگے، کوئی میرے دل سے پوچھے، دھند وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے صفِ اوّل کے گلوکاروں نے جناب ابراہیم اشک کے کم و بیش ایک ہزار گیت، غزلیں اور نظمیں گا کر بہت نام اور پیسہ کمایا ہے۔ "نئے عہد کے گیت کار" ایک سو چونسٹھ صفحات پر محیط ہے جو ہر اعتبار سے معیاری اور ظاہری لحاظ سے قابلِ رشک اور قابلِ دید ہے۔ قیمت ایک سو پچیس ہندوستانی روپے اور دستیابی کا پتہ مندرجہ ذیل ہے: نئی دنیا، پبلی کیشنز A-358، بازار دلی گیٹ، دریا گنج، دہلی 110002 بھارت۔

چہرہ در چہرہ

تیسری دنیا کے تخلیقی ادب میں اُردو زبان و ادب کی شناخت جس قدر گہری، مضبوط اور توانا ہے اُس قدر یہ زبان اور اس کا ادب ترقی کی منازل طے نہیں کر رہا۔ بہت سے اسباب کے علاوہ ایک اہم سبب سب اچھا، بہترین اور لاجواب کا تاثر ہے۔ ہمارے پیشِ نظر جو کتاب اور مصنف اس وقت موجود ہے اُس میں نا تو سب اچھا ہے، نا بہترین اور لاجواب ہے۔ اس کے باوجود اس کتاب اور اس کے مصنف میں آپ کی توجہ حاصل کرنے کے تمام اوصاف اس طور واضح ہیں کہ اس میں مصنف اور اس کی تخلیقات کی بابت بہت سی امیدیں باندھنا قرینِ قیاس ہے۔ ڈاکٹر عمران مشتاق صاحب اس سبب بھی لائقِ توجہ اور احترام ہیں کہ جہاں اپنے وطن میں لوگ بالک اپنی زبان، اپنی ثقافت اور اپنے قومی ورثے سے بے اعتنائی برتتے ہوئے بیرونی زبان، ثقافت اور کلچر سے مرعوبیت میں مبتلا ہوں وہاں ڈاکٹر عمران مشتاق جیسا دردمند اور ہوش مند انسان اعلیٰ تعلیم اور جدید مغربی علوم سے آراستہ و پیراستہ ہونے اور ایک ماہر و معروف معالج ہونے کے باوجود مغرب میں بیٹھ کر اپنا وہ وقت جس میں بہت نام اور بہت پیسا کمایا جا سکتا ہے اگر اپنی زبان، اپنے ادب اور اپنی شناخت کی تلاش پر صرف کرے تو سب کچھ اچھا نہ ہونے کے باوجود بہت اچھا کہنے کو جی چاہتا ہے۔

"چہرہ در چہرہ" ڈاکٹر عمران مشتاق کے تازہ افسانوی مجموعے کا نام ہے جس میں مشرق و مغرب کے امتزاج میں گندھی ایسی کہانیاں شامل ہیں۔ ہر چند ڈاکٹر صاحب کی زبان و بیان میں ایک طرح کی سادگی، سچائی اور شرمیلا پن نمایاں نظر آتا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اُن کے ہاں چیزوں کو دیکھنے جانچنے اور پرکھنے میں بھی اسی طرح کی سادگی ہوتی ہے جس طرح وہ اُن کا بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بچوں کے جسمانی اور ذہنی ماہر کے طور پر قریب پندرہ سالوں سے برطانیہ میں مصروفِ کار ہیں۔ اُن کی کہانیاں پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ اُن کا ہاتھ بچوں کی نبض اور اُن کی مشاق نگاہیں بڑوں کے چہروں سے ہوتی ہوئی اُن کے بطون کی گہرائی میں مصروف ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے تجربات و مشاہدات ٹھنڈے میٹھے اور گداز لہجے میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا کسی طرح کی حیرت کدائی کے بجائے خاص طرح کی لذت سے دوچار رہتا ہے۔ کہانی قاری کے اندر جھنجھی، چٹکی اور بھیتی محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عمران مشتاق "چہرہ در چہرہ" میں سادہ اور یک رو نظر آتے ہیں تو بیان کی روایتی اور خاندانی تربیت کا اثر ہے۔ ہمارے خیال میں وقت گذرنے کے ساتھ ڈاکٹر عمران مشتاق کے جوہر کھلتے، اوصاف نکھرتے جائیں گے اور اُردو ادب کو ایک مہذب، شائستہ اور مدبر افسانہ نگار میسر آ جائے گا جو مشرق و مغرب کے درمیان عمدگی سے پل کا کام دے سکے گا۔ ہم نے دانستہ ڈاکٹر عمران مشتاق کی چند کہانیوں کے روایتی طرز پر نام گنوانے سے گریز اس لئے کیا ہے کہ "چہرہ در چہرہ" کی سبھی کہانیاں لائقِ توجہ اور خود کو پڑھوانے کے وصف سے مالا مال ہیں۔ لہٰذا اولین فرصت میں کاغذی پیرہن تنظیم، سٹیشن روڈ، پارک لاہور سے رجوع کیجئے جہاں "چہرہ در چہرہ" ایک صد پاکستانی روپے کے عوض آپ کی منتظر ہے۔

لاشعور

اس شان کی غزل لکھنے والے اُردو میں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں: ڈاکٹر محمود الحسن...... اس عمر میں جب شاعر تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ غلام مرتضیٰ راہی نئے مرحلے سر کر رہے ہیں: شمس الرحمٰن فاروقی...... غلام مرتضیٰ راہی کا میں تیس سال سے قائل ہوں اُن کی غزلوں میں اب بھی وہی آب و تاب ہے اور

کبھی سے تھکن کے آثار نہیں ہیں۔ تازہ دمی کی ایسی مثال رہی کے ہم عصروں میں شاید ہی کسی کے ہاں مل سکے۔ مظہر امام .... میں غلام مرتضیٰ راہی کو اس دور کا اہم شاعر تسلیم کرتا ہوں اور ان کے دانشوروں میں خود کو شامل کرنا باعث فخر سمجھتا ہوں۔ پروفیسر وارث علوی .... تخلیقی ہو اور وقتوں میں ان کا شعور رچا ہوا اُن کی حیثیت اپنے عہد سے مشروط اُن کا لہجہ منفرد اور ان کی زبان تربیت یافتہ: ڈاکٹر شمیم حنفی ....

دماغ والے لاتے ہیں کچھ خیال سے اس کا - عروج ایک نشہ لا زوال ہے اس کا
کہاں تک اس سیاق کا شمار کریں - جہاں ہے زخم وہیں اندمال ہے اس کا

☆

آدمی چلتا ہے اب جو خلا میں رہتا - دیکھیں بنیاد ثبات کی کہاں رکھتا ہے
ایک پل کو بھی توجہ نہیں تھی میری - ایسا لگتا ہے ہوئے اپنا سال رکھتا ہے

☆

کمال کرتے گئے جان پہ کھیل کھیل کے ہم - جو دیکھتے رہے اُن کے لئے تماشہ تھا
وہ جس کے کھلنے کا رہتا تھا انتظار مجھے - رہا جو بند ہمیشہ وہی دریچہ تھا

☆

یہ اک حبیب خاک اس قدر ہے کہ اس کو - کوئی بھی اُڑا کر ہمہ گیر کر لے
کبھی اپنے بارے میں کہتا ہے مجھ کو - جو تو جانتا ہے وہ تحریر کر لے

جناب غلام مرتضیٰ راہی 1937 میں یو۔پی کے مردم خیز تہذیبی گہوارے فتح پور میں پیدا ہوئے۔ بی۔اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد "سیاست جدید" کانپور کے مدیر معاون بنے۔ ازاں بعد یو۔پی گورنمنٹ سے منسلک ہو کر 1995 میں بطور اکاؤنٹ آفیسر ریٹائر ہوئے۔ راہی صاحب نے 1960 میں نظم گوئی کے ذریعے اردو شاعری میں قدم رکھا۔ اس سے قبل آپ کے چار مجموعے منظر عام پر آ کر امتیازی مقام حاصل کر چکے ہیں۔ راہی صاحب نے بے شمار انعام و اعزازات بھی حاصل کئے ہیں اور حیدرآباد کے نوجوان شاعر حسن فقانی صاحب، راہی صاحب کی شخصیت و فن پر پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ تحریر کر رہے ہیں۔ تمام آثار اشعور کا کلام اور راہی صاحب کی نسبت دستیاب معلومات بلا کم و کاست بیان کر کے راہی صاحب کے تازہ شعری مجموعے "لاشعور" کو شعوری طور پر آپ سے متعارف کرا کر ہم نے اپنا فرض ادا کیا اگر آپ قرض واجب ادا کرنا چاہیں تو ایک سو پچاس ہندوستانی روپے یا دس امریکی ڈالر کے عوض مندرجہ ذیل پتے پر رجوع کر سکتے ہیں۔ راہی منزل، پنی، فتح پور (یو۔پی) 212601 انڈیا۔

آنکھوں سے دل تک

جس زمانے میں جب ہندوستان اُردو زبان و ادب کی بہار دکھلا رہا تھا اس دور میں بھی ہندو گھرانے کی خواتین اُردو زبان کی طرف راغب تھیں اس کی وجوہات تلاش کرنا فی الحال ہمارا موضوع نہیں، ہمارا موضوع اس وقت ایک ایسی خاتون محترم ہیں جنھیں ہندی، انگلش جیسی متعول زبانوں پر عبور اور اسی صلاحیت کی بنیاد پر اعلیٰ عہدے پر متمکن ہوتے ہوئے اُردو زبان و ادب کے عشق میں گرفتار ہونے پر نا صرف فخر بلکہ اس کی ترقی و ترویج کی کوشاں بھی ہیں۔ انھوں نے دیگر دونوں زبانوں پر مکمل دسترس کی موجودگی میں ایک ایسی زبان کو تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنایا جو میر و غالب کی محبوب ہوتے ہوئے بھی اُن کے گرد و پیش اور اُن کے لیے نامانوس تھی۔ ڈاکٹر رینو بہل نے ایم اے پولیٹیکل سائنس، ایم اے (پبلک ایڈمنسٹریشن) کی موجودگی میں اپنے اشتیاق کی تسکین کے لئے ایم اے (اُردو) ازاں بعد پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے بعد بطور افسانہ نگار اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ "آنکھوں سے دل تک" سے قبل اُن کا ایک افسانوی مجموعہ "آئینہ" منظر عام پر آ کر قارئین ادب اور ناقدین ادب سے داد کے ساتھ انعام سے بھی سرفراز ہو چکا ہے۔ "آنکھوں سے دل تک" میں کل اٹھارہ کہانیاں ہیں۔ ہر کہانی کسی نہ کسی معاشرتی الجھن، بغاوت یا صورتِ حال کا احاطہ کئے ہوئے ہے جن کی بابت ڈاکٹر سلطان انجم صاحب کا فرمان ہے! "ڈاکٹر رینو بہل کے یہ افسانے سادہ بیانی کے خوبصورت مرقع ہیں اور اپنی خوش بیانی کی بدولت سکون و اطمینان کی ہواؤں کے فرحت بخش جھونکوں کی طرح آپ کو تازہ دم کریں گے۔ جناب شرون کمار ورما فرماتے ہیں: "رینو بہل مکمل طور پر باغی عورت تو نہیں لیکن اپنی شخصی آزادی، سماجی برابری اور الگ پہچان کے لئے 'ورکنگ وومن' کے روپ میں زندگی گذارنے میں یقین رکھتی ہیں۔ گھریلو فضا اور دفتری تقاضوں نے انہیں دیکھنے سوچنے اور سمجھنے کا نیا انداز دیا ہے جو ان کی کہانیوں میں بار بار ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جہاں اُن کے نسوانی کردار محبت، خلوص، ایثار کا لافانی جذبہ رکھتے ہیں، وہیں ذہنی، اقتصادی اور سماجی آزادی کے لئے کوشاں بھی ہیں۔ اُن کے کردار متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کی اپنی کچھ مجبوریاں کی بنا پر دھیمی چال ہوا کرتی ہے۔ رینو جی کی یہ کہانیاں بھی دھیمی چال سے چلتی ہیں ایک طے شدہ منزل کی طرف۔ یہ کہانیاں نہ تو شور مچاتی ہیں نہ ٹریفک جام کرنے کا کام کرتی ہیں۔ اسی لئے یہ زندگی سے نزدیک رہتی ہیں۔ چونکہ مصنفہ خود ایک عورت ہے اس لئے کہانیوں کا رخ عورت کی جانب ہونا بھی فطری ہے جس میں قدم قدم پر مصنفہ عورت کو تباہی سے بچانے کی خاطر نیک ارادہ اور صالح پیغام سے دیتی ہیں۔" ہمارے خیال میں اس مختصر تعارف اور تبصرے میں ہر دو فاضل مبصروں نے ڈاکٹر رینو بہل کے تخلیقی انداز فکر پر وضاحت سے روشنی ڈال دی ہے جس کے بعد آپ کا اشتیاق "آنکھوں سے دل تک" کی بابت فطری ہے جس کی تکمیل کے لئے 1505 سیکٹر B-49 چنڈی گڑھ 160047 بھارت سے رجوع کیا جا سکتا ہے جہاں "آنکھوں سے دل تک" ایک سو پچاس ہندوستانی روپے میں دستیاب ہے۔

رس رابطے

ترتیب و تدوین

اعجاز کھوکھر

گلزار جاوید صاحب۔ سلام مسنون!

ادارہ ''چہارسو'' نے اس حقیر کو جو اعزاز بخشا اُس کا شکریہ! عجلت میں کی گئی کچی پکی باتیں مطبوعہ صورت میں اچھی لگیں۔ مصطفیٰ ملک صاحب نے اس حقیر سے متعلق بکھری ہوئی معلومات کو خوبی سے سمیٹا۔ ہم کہاں کے دانا تھے۔ ادھر میں نے کہا جوگندر پال ایک مدت سے خاموش ہیں۔ اُدھر پال صاحب نے افسانہ ''قیاس'' آپ کو روانہ کر دیا۔ میرا کہا غلط ثابت کرنے کی خوشی ہوئی اُن کا تازہ ترین افسانہ پڑھ کر۔ متعدد بار کے مستعد قلم کاروں میں میں ستیہ پال آنند صاحب کا ملنا بھول گیا تھا۔ انہوں نے بھی اپنی نظم اور افسانہ اسی شمارے میں شائع کروا کر وہی جوگندر پال صاحب والا کام کیا۔ اُن کی نظم ''ذہانی سے عقل مشکل تھا'' کشادہ نظری کا ثبوت ہے۔ حصہ غزلیات میں بطور خاص مجھے شمیم شکیل اور اکبر حیدری کی غزلیں اچھی لگیں۔ جگنو وال اعجاز صاحب کی ''روز نامہ'' سلسلے کی ''سچ مچ'' کا جواب نہیں۔ اُن کی یاد آتی ہے تو جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی کی وہ شام یاد آ جاتی ہے جب اُن کی کلائی جیب میں ایک مختصر سا سفر مشاعرہ گاہ تک جاتے ہوئے کیا تھا۔

حمیدہ معین رضوی کا مضمون حوالے کی چیز ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ اُن کی تحریریں دوبارہ پڑھنے کو مل رہی ہیں۔ آپ کے افسانہ ''مفروریں'' میں برتے گئے طویل جملوں کی تعریف کروں گا تو احباب کہیں گے کہ مدیر کی تعریفیں لکھتا ہے۔ دیکھیں یہ تصلات ہوتے ہیں تحریر طاپ اعزاز شائع کرنے کے۔

(مرزا حامد بیگ)

عزیزی گلزار جاوید خوش رہیے!

''چہارسو'' کا نیا شمارہ (جنوری فروری 2006ء) مل گیا تھا۔ شکر گزار ہوں۔ آپ نے مجھے اپنی کہانی پر رائے بھیجنے کو لکھا تھا مگر چونکہ آپ میرا خط اکثر چھاپ دیتے ہیں اور یوں ''چہارسو'' کے قارئین بھی خط میں شامل ہو جاتے ہیں اس لئے یہی مناسب لگا کہ ساری کہانیاں پڑھ کر ہی آپ کو لکھوں: بعض لوگ شاید پڑھتے ہی جج کرنے کے لئے ہیں مجھے کہانیوں میں صرف شریک ہو پانا ہی اچھا لگتا ہے اور شریک ہو پانے پر بس جی ہی جی میں نہال ہو لیتا ہوں۔ آپ مجھے یہ اجازت دے دیجئے کہ آپ کو اور آپ کے دیگر لکھنے والوں کو پڑھ پڑھ کے چپ چاپ خوش ہو لیا کروں۔

نامکمل سچ پر ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی تصویر کو غور سے دیکھئے۔ کیا وہ ہو بہو اپنی طرح نظر آنے کی بجائے جنرل مشرف معلوم نہیں ہوتے؟ اُن کے انٹرویو میں بھی جنرل صاحب کے مانند منصفانہ وضاحتوں اور تصحیحوں کا رنگ غالب ہے.... اور اُن کی کہانی ''جا گی وا اس کی مرضی''؟...... یہ کہانی تو صرف اُن کی بلکہ اردو کی ایک بہت اچھی کہانی ہے۔ میں نے پہلے بھی پڑھ رکھی تھی اور اب دوبارہ پڑھنے پر تو جھوم سا گیا ہوں۔ ''دھنک قزح'' میں یہ دیکھ کر بھی مسرت ہوئی کہ اتنے اچھے کہانی کار کا ایوارڈ بھی کتنا بھاری بھرکم ہے۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے تو کینیا سے لوٹنے پر عثمانیہ یونیورسٹی نے ۲۸، ۲۹ کی عمر میں بھی اس لئے لیکچرار بنانے سے انکار کر دیا کہ اپنے بی اے میں میں تھرڈ کلاس سے اوپر نہ اٹھ پایا تھا۔ خدا ہمارے مرزا صاحب کو اسی مانند سدا شاد کام اور آباد رکھے۔ دیگر کہانیوں میں ستیہ پال آنند کی ''سانپ اور سانپ'' کے استناد (Authenticity) نے اسے اتنا اثر کار بنا دیا ہے کہ لفظوں میں جوں کے توں زندگی کر لینے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ہماری زبان میں ایسی ایسی کہانیاں بہت کم ہیں مگر یہ بھی ہے کہ ستیہ پال آنند کا یہ طویل مختصر افسانہ بڑے فنکارانہ انداز میں پھیل پھیل کر ایک بھرپور ناول کے تیور اختیار کر گیا ہے اور قاری بے اختیار چاہنے لگتا ہے کہ آنند اسے آخر آخر میں اپنی طرف سے اطلاعی طور پر ختم کرنے کے بجائے اور بھی تیور میں پورا ناول بنا کر پیش کرتے۔ شاید انہوں نے بھی ایسے ہی سوچ کر بعد میں اسے ناول بنا لیا ہو۔ بہر حال موجودہ حالت میں بھی میں یہ کہانی جی لیا ہوں۔ ''چہارسو'' میں ستیہ پال آنند کے خط میں بھابی کی علالت کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ خدا اُن کی مدد کرے...... جتیندر بلو کی ''فاصلے'' بڑی محنت سے ہوئی پسندیدہ کہانی ہے اور آپ ہی آپ موضوعی تجزیے کے سارے اسباب پیدا کرتے ہوئے اپنے مقام پر آ پہنچی ہے۔ مشتاق اعظمی کی ''مکمل نامکمل'' کا موضوع بڑا الجھا ہے جسے انہوں نے حساس فہم سے نبھایا ہے۔ ایک آدھ جگہ اُن کی عبارت آرائی کا عمل ذرا ضرب سا کر جاتا ہے۔ کہانی اس طرح جاری اور فل ہو تو معمولی سے عیب سے بچنا بھی ضروری ہو جاتا ہے...... اور اب آپ کی کہانی ''مفروریں''۔ میں نے اسے بڑے انہماک اور شوق سے پڑھا ہے۔ کہانی میں شور و غل لینے کی بڑی ترغیب تھی مگر آپ کے ''خاموش غصے'' کے مخصوص عناصر نے آخر تک کہانی کی فطری لے کو ہر خلل سے بچائے رکھا ہے۔ اس کی شاید ایک اہم تر مثال یہ ہے کہ قاضی صاحب کے ملک چھوڑنے کی خواہش حالانکہ کہانی کے کرائسس کی حامل ہے مگر اس کا ذکر بجا طور پر بس ایک بار مبہم سے اظہار میں آتا ہی ہے کہ قاضی صاحب بھی کاغذات کا پلندہ بغل میں دبائے کسی قطار میں دیکھے گئے تھے۔ ملاحظہ کیجئے کہ اس مبہم سے بیان سے ہی کیکر وضاحتوں کا فکری و فنی اختتام ہو لیا ہے۔ واقعی بہت خوب!

اب اس شمارے میں دیگر دوستوں سے ملاقات کی تدبیر کروں گا۔

خدا کرے آپ سب لوگ بہ مسرت و عافیت ہوں۔ (جوگندر پال)

عزیز گرامی قدر جناب نگار اجالوی۔ السلام علیکم!

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے قرطاسِ اعزاز کے ساتھ تازہ شمارہ چہار سُو ملا۔ آپ کا کمال یہ ہے کہ ہر قرطاسِ اعزاز کے ساتھ کوئی نہ کوئی نئی بات پیدا کر لیتے ہیں۔ ویسے تو ہر شخصیت اپنی ایک جدت لئے ہوتی ہے لیکن اس خوبی کے علاوہ آپ ایک اپنی خوبی بھی ہر شمارہ میں شامل لیتے ہیں..... تازہ شمارہ میں افسانہ کی صنف کے بارے میں جو خود مرزا حامد بیگ کا مضمون اس کے علاوہ دوسرے مضامین جیلانی کامران مرحوم کا مضمون۔ ان سب مضامین کو پڑھ کر صنفِ افسانہ کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

ایک زمانے میں ہم آپ بھی مل لیا کرتے تھے اب تو یہ سلسلہ ایک عرصے سے منقطع ہے حالانکہ میرے برخوردار بریگیڈیئر ڈاکٹر اطہر رضا وہاں موجود ہیں اور ادھر شہر لاہور کی اپنی ایک کشش ہے آپ بھی ادھر آتے ہی ہوں گے۔ میں تو پنڈی کہ اسلام آباد بہت کم جاتا ہوں اور اگر جاتا ہوں تو ایک روز کے لئے۔ دیکھئے سوچ رہا ہوں 19/3 کے بعد اطہر رضا کے پاس آؤں گا تو آپ سے بھی ملاقات ہو گی۔ شاید فون پر اس سے قبل آدھی ملاقات ہی کر پاؤں۔ (مشکور حسین یاد)

نگار جی۔ سلام تے نمسکار!

"چہار سُو" کے تازہ شمارے میں آپ نے مرزا حامد بیگ کا بھرپور گوشہ شائع کر کے تحریر کا حق ادا کیا ہے مبارکباد۔ مرزا حامد بیگ تخلیقی فنکار ہے موضوع، فنی اسلوب اور زبان کے اعتبار سے گوشے کی تمام تخلیقات اہم ہیں۔ خاص طور پر "جانکی بائی کی عرضی" غیر معمولی ہونے کے کارن گہرا اثر چھوڑ گئی۔ یہ اُردو ادب کی بڑی کہانیوں میں اپنا جائز مقام پا چکی ہے لیکن ناقدین کا حامد بیگ پر اکثر اعتراض اور الزام رہا ہے کہ اُس کا فن نوسٹلجیا کے دائروں سے کبھی آزاد نہیں ہو پایا۔ وہ شعوری کوشش کے باوجود ماضی کی بھول بھلیوں سے نکل نہیں پاتا۔ لیکن میرے نزدیک یہ کوئی ادبی عیب نہیں ہے۔ بلکہ نوسٹلجیا تو اپنے ساتھ بے پناہ قوت لئے ہوتا ہے وہ گزرے زمانوں کے کئی ملکی، معاشی، سیاسی اور معاشرتی پہلوؤں کو بیان کرتے ہوئے تاریخ کو دہراتا ہے کبھی کبھار مصنف اپنی فنی گہرائی اور گیرائی کے بل بوتے پر تاریخ کو Recreate بھی کرتا ہے۔

اس بار بھی کہانیاں اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ شاعری کے حصے میں پروفیسر قیصر نجفی، شگفتہ نازلی اور نیل آذر کی نظمیں پسند آئیں۔

رسالہ آپ نے اپنی محنت، شادابی، لگن اور شرزہ حالے اس مقام پر پہونچا دیا ہے کہ اب اس کا شدت سے انتظار رہتا ہے بھگوان آپ کو اپنے مقصد میں سدا کامیاب رکھے۔ (آمین)

(جتیندر بلو)

برادرم نگار اجالوی صاحب۔ السلام علیکم!

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کی محنت اور جنون چہار سُو کی زندگی ہے۔ یہ پرچہ ادبی حلقوں میں اپنا ایک مقام بنا چکا ہے پچھلے دنوں مجھے انڈیا جانے کا موقع ملا۔ وہاں جوگندر پال صاحب سے ملاقات رہی۔ آپ سمیت سب احباب کو سلام دیا۔ میں نے اس ایک ہفتے کی آوارہ گردی کے دوران امرتسر، دہلی، آگرہ دیکھا۔ اور اپنے تاثرات قلمبند کر لیے ہیں۔ بس ذرا نوک پلک درست کرنا باقی ہے آپ کی رائے کے لیے مسودہ ارسال کروں گا۔

(شمشاد احمد)

پیارے نگار۔

چہار سُو کا تازہ شمارہ اور آپ کا خط موصول ہوئے ہمیشہ کی طرح یہ شمارہ بھی بہت خوب ہے بلکہ ہمیشہ سے کچھ زیادہ ہی خوب ہے اس شمارے میں افسانہ ادب کے دوسرے تمام شعبوں پر حاوی ہے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سے شروع کریں اور نگار اجالوی پر ختم کریں تو یہ حقیقت واضح طور پر ابھر کر سامنے آ جاتی ہے قرطاس اعزاز ڈاکٹر مرزا حامد بیگ صاحب کے نام ہے آپ کے الفاظ میں باشعور اردو افسانہ میں شفاف نظر، دوبیں اور بے پناہ توانائی سے لکھنے والوں کی صف میں اس مقام پر فائز ہو چکے ہیں جس کی تقلید اور پیروی ان کا عصر کر رہا ہے۔ ان کے ساتھ آپ کے انٹرویو (براہ راست) اور مضمون "اُردو افسانے کے اسالیب بیان" اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری، جیلانی کامران اور نیل تنہا کے مضامین مرزا حامد بیگ کی افسانوی دُنیا کے دروا کرتے ہیں.... چہار سُو کے اس شمارے میں مرزا حامد بیگ کے افسانے "جانکی بائی کی عرضی" کے علاوہ جوگندر پال، ستیہ پال آنند، جتیندر بلو، مشتاق مظہر اور آپ سمیت پانچ افسانے بھی ہیں۔ یہ تمام نام اردو افسانوی ادب کے معتبر نام ہیں۔ اس شاندار اشاعت کے لئے مبارکباد۔

آپ کا افسانہ "فردوس بریں" اچھا لگا۔ قاضی صاحب کا کردار وقت کے کردار پر گہری چوٹ ہے آپ اچھے افسانے لکھتے رہیے اور..... زورِ قلم اور زیادہ۔

تخلیق عصر کے تحت نئی اشاعتوں کی مفید اور عالمانہ بات چیت ہوتی ہے۔ دیگر اشاعتوں کے علاوہ سہ ماہی "سوچ" کا ذکر اور اس میں شامل "ممتاز نیل قلم" حضرت کا ذکر آپ نے کیا ہے اسی شمارے میں ناچیز کا ایک افسانہ بھی شامل ہے۔ (ڈاکٹر کیول دھیر)

برادرم نگار اجالوی صاحب۔ آداب!

"چہار سُو" کا تازہ شمارہ مل گیا ہے آپ نے گوشے بنانے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے یہ اچھا ہے اب مرزا حامد بیگ کا گوشہ اس لئے بھی قابلِ ذکر ہے کہ مرزا حامد بیگ نے انٹرویو میں خوب کھل کر باتیں کی ہیں جن سے ان کی شخصیت کا پس منظر بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ حصہ غزل بڑا جاندار ہے

جو عام طور پر اکثر رسائل میں کمزور ہوتا ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ آپ پرچے کے ایک ایک گوشے پر نظر رکھتے ہیں۔ آپ کے سوالات اس لئے بھی قابل تعریف ہیں کہ آپ میں براہ راست ہونے کی ہمت بھی ہے جو انٹرویو کے لئے بہت ضروری ہے۔ پرچہ ہر لحاظ سے مکمل اور خوبصورت ہے۔ مبارکباد۔

(اکبر حمیدی)

میرے کرار خوش رہو۔

اس مرتبہ قرطاس اعزاز ڈاکٹر مرزا حامد بیگ پسند آیا۔ اُن کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اُن کا افسانہ "جاگی بائی کی مرضی" کافی دلچسپ ہے شاید میں نے پہلے بھی پڑھ رکھی ہے کب کہاں نہیں معلوم۔ حصہ غزل و نظم پسند آیا۔ شبنم شکیل کی غزل پیاری لگی۔ "کسی کی خاطر تو جھوٹ کا رہتا ہے اے دل کر آرام کہانی ختم ہوئی / گزری عمر کی باتوں کو دہرا لیا / ڈھلنے کو ہے شام کہانی ختم ہوئی" سارے اشعار اچھے لگے۔ اسی انصاری کی غزل کا یہ شعر "خوش پل جو ہم اکثر جیتے ہیں / ایا بھی ہیں پر ست سے چھڑ جیتے ہیں" کرشن کمار طور کی غزل "نہیں ہے پھر بھی ہے اندیشہ ضرر ہر روز / کہ ہوتی جاتی ہے یہ عمر مختصر ہر روز" کس قدر خوبصورت احساس ہے۔ اکبر حمیدی کا یہ شعر "فاصلے تو دلوں کے ہوتے ہیں / اور تو فاصلہ نہیں کوئی" اور کشور زیدی کی غزل بھی خوب ہے "کسے ہے حوصلۂ اختلاف ہماری طرح / یہاں بھی نے محبت کا ڈول ڈالا ہے" مزہ آگیا یہ خیال پڑھ کر "نہ اپنا شوق / نہ اپنی خوشی / نہ اپنا غم / یہ عاشقی نے ہمیں کس ڈگر پہ ڈالا ہے" میرے کرار کس کس غزل کا ذکر کروں مجھے تو ساری اچھی لگیں۔ پی ایس جین جوہر کی غزل کا یہ شعر "نہ جانے کس گناہ کی سزا ہے زندگی میری / ہزاروں آفتیں ایسی کہ ہر آفت پہ دم نکلے" مرزا غالب کے مصرعے کا خوب توڑ نکالا ہے۔ اور پھر خرد رہ "اے جہاں والو قیامت آنے والی ہے کہاں جاؤ گی دنیا گر خدا کے گھر میں ہم نکلے"۔ اور محمد ظہیر کی غزل کا یہ شعر "کب آنکھ بھر کے مجھے کوئی دیکھتا نہیں / وہ کیا نظر تھی جو ہوتی تھی آر پار میرے" جی تو چاہتا ہے ایک ایک غزل کے اشعار quote کروں مگر پھر بھی اتنا لکھنے پر اکتفا کر رہا ہوں۔ ماجد سرحدی کی "آزادی" دعا پروین قیصر مجتبیٰ کی نظم "مجھے کچھ بھی نہیں کہنا" پسند آئی اور "رقص کرتی تھی ہوا شعلوں کی پائل باندھ کر / آج تک بھولا نہیں ہوں وہ منظر رات کا" کتنا کرب ہے دل دہل جاتا ہے۔ اور ستیہ پال آنند کی نظم "ذہانی" بے عقل شکل کتنا "اس روانی سے ساری نظم چل رہی ہے "مگر اس بت کی آنکھوں میں کئی ناگفتہ شکوے ہیں"۔ ایسی نظم کہنا آنند صاحب کا ہی حصہ ہے۔ اور پھر جب کوئی دل کی گہرائیوں سے عالم وجد میں نکلے اس کا کہنا ہی کیا۔ ذرا لے پر کہی گئی نظمیں پسند آ گئیں۔ ماجد سرحدی کی نظم "انہیں یاد کر کے جیا کرو" اور دل نواز دل کی طویل نظم ایک خوبصورت کاوش ہے اور تحلیل ستائش ہے۔ غالب عرفان کا "لاشعور ادب کا دور" طلب ہے۔ حمیدہ معین رضوی کا "فیمنسٹ تحریک کا ادبی منظرنامہ" بہت اچھا مضمون ہے خوب لکھا ہے پسند آیا۔ مادام بواری کا ناول 1952 میں پڑھا تھا۔ اس وقت زیادہ کچھ تو سمجھی نہیں پھر بھی اُس وقت کا الگ قسم کا ناول تھا۔ اور مادام بواری کا کریکٹر اچھا لگا تھا۔ اور گلیں چاؤ میں پروفیسر محمود احمد صاحب کا انٹرویو پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ آپ کی سیاسی معاملات میں بھی خوب دسترس ہے آپ سوالات میں مقابل والے کو اس طرح گھیر لیتے ہیں کہ وہ سب کچھ صاف صاف کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس طرح آپ قاری کے سامنے ایک تاریخ کھول کر رکھ دیتے ہیں اور جو باتیں عوام کو معلوم نہیں ہوئیں وہ بھی کھل کر سامنے آ جاتی ہیں۔ محترم جوگندر پال صاحب کا افسانہ قیاس۔ ایک نابینا کے مرض کی کیفیت خوب بیان کرتی ہے۔ ستیہ پال آنند کا سانپ اور سانپ۔ ماضی کی یاد پھر تازہ کر دیتا ہے اور اس طرح اُن گلیوں کوچوں میں لے جاتا ہے کہ آپ از خود محسوس کرنے لگتے ہیں کہ آپ اُس وقت کا حصہ ہیں اور اپنے یار دوستوں احباب سے بولنے کھیلنے لگتے ہیں۔ جتندر بلو کا "فاصلہ" اپنی طوالت کے باوجود دلچسپی نہیں کھوتا۔ اور مکمل با مکمل" مشتاق اعظمی صاحب کا طرز بیان بہت پیارا لگا۔

"وقت کافور کی طرح اُڑتا رہا" پھر دو تین روز بعد وہ کسی بدروح کی طرح قبر سے نکلتی اور رات گزار کر صبح سویرے آجاتی اور "تمہاری آنکھوں میں خوف آ گیا ہے یعنی تم وہ سمجھ گئے ہو جو میں کہہ رہی ہوں" اور آپ کا فردوس بریں بھی خوب ہے یعنی آپ قاضی صاحب خود ہی ہوتے جب بھی اپنا بیان اس خوبصورتی سے نبھا سکے۔ خاص کر وہ جگہ جہاں سیاسی شخص گڑگڑا رہا ہے اور پھر وہی مقابل میں کرسی پر براجمان ہوتا ہے اور اس کے چہرے پر شرمندگی تک نہیں اور پھر طرہ کی قاضی صاحب سے گفتگو کا انداز "مگر دو بھائی" جواب نہیں ایک ایک لفظ خوب تراشا ہے۔ اور پھر نہیں تو معلوم ہے کہ آپ میرے استاد ہیں ورنہ یہ تو لُولی لنگڑی باتوں تک محدود رہتے ہو نہیں..... آپ کا طرز بیان خوب ہے کہ پڑھنے والا متاثر رہا نہیں جاتا۔ اور میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ جب آپ اس قسم کا کریکٹر describe کر رہے ہوتے ہیں تو آپ محض وہیں رہتے بلکہ اسی ماحول کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اور ان حالات کی مکمل گرفت میں ہوتے ہیں جس سے شخص مذکور گزر رہا ہوتا ہے۔ زیادہ کیا لکھوں فردوس بریں بے حد پسند آیا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر آپ سے کہا جائے کہ تاریخ لکھو اور لکھنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو یقیناً آپ اپنا الگ نام قائم کر دیں گے۔

"اور آخر میں پی ایس جین جوہر کا کلام "ترا انتظار" بے حد سلیس اور خوبصورت "محمود دہلوی کی یاد تازہ ہو گئی وہ بھی کچھ اسی طرح سادگی اور سلاست سے اپنی بات شعر میں ڈھال دیتے تھے۔ اور جوہر صاحب کو بھی اسی چابکدستی سے اپنی بات کہنے میں مہارت حاصل ہے صاف و شفاف طور سے: اگر آدمی کچھ سمجھدار ہوتا / تو دنیا میں بس پیار ہی پیار ہوتا / مصیبت میں کوئی مددگار ہوتا / تو جینا بھی اتنا نہ دشوار ہوتا اور زندگی کتنی بے وفا نکلی / موت کی بھی وفا شناس نکلی / کر کے ہمیں پیر دغا کے وہ کتنی / گھر کسی غیر کے وہ جا نکلی۔

میرے کرار پروردگار سے دعا کروں کہ وہ آپ کے قلم میں یونہی

دعائیہ قرار دے گا (آمین)۔
(یوگیندر بہل تشنہ)

مکرم و محترم ارشد خالد صاحب و حیدر قریشی صاحب السلام علیکم!

مزاج بخیر۔ جنوری/فروری ۲۰۰۶ء کا ''چہارسُو'' ملا۔ بہت پسند آیا۔ اس دور گلشن میں ایسا پرچہ نکالنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ حمد و نظم و نثر خوب ہیں۔ آپ نے قرطاسِ اعزاز ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے نام منسوب کر کے خوب کیا۔ ان کی ادبی کاوشیں یقیناً قابلِ ذکر ہیں۔ فردوس بریں' اور 'رہ داست' اچھا رہا۔ جوگندر پال' جتیندر بلو اور ستیہ پال آنند کی تخلیقات بہت پسند آئیں۔ ستیہ پال آنند جب پشاور آتے ہیں تو یاد کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھار خط بھی لکھ دیتے ہیں۔ ہماری قلبی دعاؤں کو قبول کرتے ہوئے بھابی صاحبہ (بیگم ستیہ پال آنند) کو مکمل صحت اور طویل ساتھ عطا فرمائے (آمین)۔ یونس صاحب بہت والا بندہ ہے۔ دوستوں کی طرف سے تابعداری کرتا رہتا ہے۔ پشاور میں 'تحقیق اور ترجمہ کل'' کی ادبی اور ملکی خدمات جاری ہیں۔
(ماجد سرحدی)

محترم ارشد خالد و حیدر قریشی صاحب تسلیمات!

خط تحریر کرتے وقت 'چہارسُو' کے نومبر/دسمبر ۲۰۰۵ء کے شمارے کا مطالعہ جاری تھا اس لئے اس پر زیادہ کچھ نہ لکھ پایا۔ آج آخری سطر پڑھ لی تو اپنے تاثرات قلمبند کرنے بیٹھ گیا۔ آپ نے چہارسُو میں دو منفرد ہستیوں جناب اندر کمار گجرال اور جناب یوگیندر بہل تشنہ کے گوشے شائع کر کے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ گجرال صاحب کی شخصیت کی بوقلمونی تو مسلم ہے۔ سیاست داں' زباں داں اور ان سے بھی بڑھ کر اعلیٰ انسان' سن ۲۰۰۰ء میں جب اس ناچیز نے سابق وزیر اعظم کو اپنا پہلا افسانوی مجموعہ بھیجا تو انہوں نے بقلم خود اس کی رسید بھیج دی جبکہ کئی اور لوگوں نے پایا تو جواب دینے کی زحمت ہی نہ اٹھائی یا پھر اپنے پی اے سے رسید بھجوائی۔ معروف روزگار تو خیر میں بھی ہوں اور شاید ایسے لوگوں سے زیادہ آفس میں کام کرتا ہوں مگر ہر ایک کے مدعا کا اس کی شخصیت میں جوڑ کر آتے ہیں۔ گجرال صاحب پر جتنے بھی مضمون اس شمارے میں چھپے ہیں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں حالانکہ میں چاہتا کہ ایسی ہمہ گیر شخصیت پر گوشے کے بدلے ایک بھرپور خصوصی شمارہ شائع کیا جاتا اور تصویری البم کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کے مضامین اس میں شامل کئے جاتے۔

یوگیندر بہل تشنہ کا گوشہ بھی بہت اچھا لگا۔ ان کی حرکی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ ان کے یہاں ذاتی اور اجتماعی کرب ملتا ہے' اور عصری آگہی سے جھلکتا رہتا ہے۔ افسانہ 'انتظار' بھی معیاری ہے۔

شمارے میں شامل غزلیں اور نظمیں خوب ہیں۔ البتہ پروفیسر نذیر کچھاوی کی غزل نے خاص طور پر متاثر کیا۔ ایک شعر یہاں نوٹ کر رہا ہوں۔

یہ سادگی ہے دل کی یا وقت کا کرشمہ
مظلوم ظالموں سے انصاف مانگتا ہے

شمشاد احمد کا لکھا ہوا چھوٹا افسانہ ہے۔ یہ المیہ نہ صرف پاکستان کا ہے بلکہ برصغیر کے کبھی ممالک کا ہے۔

بڑا سچا یہ کا سفرنامہ ذہنوں میں یادوں کے چراغ جلانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
(دیپک بُدکی)

محترم مدیر چہارسُو سلام و رحمت!

جنوری تا مارچ کا 'چہارسُو' خواتین کے عالمی دن یعنی ۸ مارچ کو موصول ہوا جس سے جزوی طور پر یہ احساس بھی اُبھرتا ہے گویا اُن کے لئے اپنے تجزیے احتساب اور نکھار کو سال میں ایک ہی دن ہے۔ اس مرتبہ بھی حروف کی حرمت کا اعتبار ہوتا دفتروں ہوا ذہنی ارتباط کی راہیں ہموار ہوئی ہیں اور چہار جانب سے اعزاز و امتیاز کا استحقاق محفوظ ہوا۔ گو دیگر موقر جرائد بھی دوسرے ادیبوں اور دانشوروں کی تحریروں کی نمائندگی کرتے ہیں مگر 'چہارسُو' نے تو ایک لمبی درخشندہ روایت کا احیاء کیا ہے جس کی تابندگی آنے والے وقتوں میں بھی دوامی گواہی دے سکی!

سرورق اور درمیانی ورق نے قرطاسِ اعزاز کی نہایت اہم شخصیت ڈاکٹر مرزا حامد بیگ صاحب اور گزرے برس کے ساتھ کی بکھری یادوں کو پھر سے اُجاگر کر دیا۔ اس پس منظر میں انتساب بہت موزوں اور لمحۂ گزراں سے مربوط کا ربط ہے۔

'رنگ قمر' نے ڈاکٹر صاحب سے اوّل تا آخر تعارف مکمل کروایا اور آپ کے 'رہِ داست' نے ہمیشہ کی طرح زیرِ اعزاز و بحث شخصیت کی تہذیبی و تخلیقی' تحقیقی و تنقیدی زندگی کے کئی پہلوؤں سے شناسائی بہم پہنچائی۔ 'ارتباطِ قلب' نے بیگ صاحب کے تخلیقی و تصنیفی کام کے سلسلے میں معزز و ممتاز ناقدین کی گرانقدر آراء سے نہایت خلوص سے آگہی دی۔ 'دریچے والی' کے حوالے سے اس تصنیف کے مختلف افسانوں کی موضوعاتی' تکنیکی' اسلوبیاتی و تنقیدی زاویوں سے پرکھنے کی کامیاب سعی کی گئی۔ مرزا حامد بیگ کے افسانے' میں نہایت ہمہ گیریت کے ساتھ افسانوی خصائص کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور 'نئے اُردو افسانوی منظرنامے میں یادگار روایت قرار دیا ہے۔ گمشدہ کلمات' میں نہایت تحمل کے ساتھ کہانیوں کے منظر پس منظر' موضوع' تکنیک اور سوچنے و محسوس کرنے کے انداز اسالیب و معیارات کا تجزیہ ملتا ہے۔ اسی طرح بیگ صاحب کی کہانی کے پس منظر میں استعاراتی و علامتی رنگ سے افسانے کے نئے افق کا تعین کیا گیا ہے جس کا ان کو لائقِ تحسین حق ہے۔

'فردوسِ بریں'' کے قاضی صاحب ہمہ صفت و موصوف شخصیت اپنے جملہ فضائل و کمالات کے ساتھ ساعت کی فصیل میں محصور ہو کے بھی ناہمواریوں کے تصور سے دوچار رہے' کہ بھی جس طرح بدلتے دور کے رویوں و تبدیلیوں کے تناظر میں ایک اور 'فردوسِ بریں'' آباد کرکے جمعوں کے لئے تحیر اور تجسس کا سامان بہم پہنچاتے ہیں وہ ان کی دوررس بصیرت و ذہانت کا

اظہار ہے..... مزید برآں اس کہانی میں خاکہ نگاری کا انداز بڑی مہارت و چابکدستی سے جھلکتا ہے۔

مجلسِ چہار سُو میں نائب امیر جماعت اسلامی پروفیسر خورشید احمد صاحب سے آپ کا تفصیلی مکالمہ اس وجہ سے بھرپور لگا کہ اس کے مطالعے سے نہ صرف..... محترم مجلسِ عمل کی فقیدالمثال کارکردگی تک صحیح راہنمائی ہوئی بلکہ مجموعی سیاسی منظرنامے سے بھی ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے مفصل آگہی اور تحرک سوچ ملی۔ آپ کے بہت سی برمحل سوچے سمجھے جانچے پرکھے اور ٹو دی پوائنٹ سوالات نے حاشیوں کو حقائق سے پردہ سرکانے پر مائل کرتے ہیں..... اور..... یوں حقیقی منظرنامہ قارئین تک پہنچانے میں آپ کامیاب ہو جاتے ہیں۔

تخلیقِ عصر میں تبصرے کی صرف اس قدر تصحیح کر دیں کہ ڈاکٹر محمود کیا نہیں محمود کیا تھیں۔

حمدِ شعری بھی متنوع موضوعات کی نظموں اور سلیقے مصرعوں کے ساتھ بہت بھرپور دلپذیر ہے مگر کیا ہے کہ آپ کی نظر طوالتِ مکتوب پر ہے سو اس اختصار پہ اکتفا کرنے میں عافیت جانوں! (شگفتہ نازلی)

پیارے بھائی گلزار جاوید صاحب!

چہار سُو کا جنوری فروری ماہ کا شمارہ برادر گرامی جناب یوگیندر بہل تشنہ کے توسط سے مجھے دستیاب ہوا۔ میں اس عنایت کے لیے آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔

محترمہ علیہ سکندر بہل کا مختصر سا تبصرہ میں نے اپنی کتاب پر پڑھا۔ انہوں نے بڑے خوبصورت انداز میں اپنی بات قارئین کے مدنظر رکھی ہے۔ ان کا شکریہ مجھ پر واجب ہے۔ مجھے بی بی سے صرف ایک بات عرض کرنی ہے کسی تخلیق کی قیمت کا انحصار اس کے صفحات کی کمی بیشی پر نہیں ہوتا اور پھر ہندوستان ہو یا پاکستان کتنے قاری ہیں جو کتاب خرید کر پڑھتے ہیں یہ آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ اعداد و شمار آپ کی نظروں میں ہوں گے۔

باقی رہی اس شمارہ کی بات تو میں اپنے اعتماد اور حقِ نظر کی صداقت کے حوالے سے یہ بات بے کم و کاست بیان کر سکتا ہوں کہ میں چاہتے ہوئے بھی صوری اور معنوی لحاظ سے ایسا بے نظیر شمارہ ترتیب نہیں دے سکتا تھا۔ میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ (کرشن کمار طور)

گلزار جاوید صاحب "براہِ راست" میں آپ کے بے باک سوالات کا میں ہمیشہ سے قائل رہا ہوں کہ آپ شخصیت کی ادبی حیثیت اور مختلف اصناف کے حوالے سے گھسے پٹے سوال نہیں کرتے بلکہ ایسے سوالات کرتے ہیں جو پڑھنے والوں کے ذہن میں جنم لیتے ہیں۔ اور جن سے الجھے ہوئے مسائل سلجھانے میں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ پر جتنے الزامات سامنے آئے میرا خیال ہے کہ منٹو کے سوا کسی اور اردو کے ادیب، نقاد، محقق اور افسانہ نگار کو اس کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام سوالات کے جوابات نہایت تفصیل اور سلیقے سے دیے ہیں۔ ان جوابات میں علمی دلائل اور ادبی حقائق ثبوت کے طور پر موجود ہیں۔ مرزا صاحب نے اپنے بچپن اور لڑکپن کے حوالے سے میر پور خاص کو یاد رکھا جس کے لیے ان کا شکر گزار ہوں۔ مرزا حامد بیگ کے افسانوں اور فن پر پرانے مضامین شامل ہیں مگر مضامین مختصر ہونے کے باوجود بہت اہم اور ڈاکٹر صاحب کے افسانوں کے فہم کو سمجھنے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر توصیف تبسم، جیلانی کامران (مرحوم) اور علی تنہا کے مضامین کا اچھا انتخاب کیا ہے۔ مرزا حامد بیگ کا افسانہ "جاگی بائی کی عرضی" ایک مشکل موضوع اور مختلف پلاٹ کے افسانے کو زبردست طریقے سے پیش کیا ہے۔ علی تنہا صاحب نے درست لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے افسانے "اپنے فکری تاروپود اور تکنیکی خوبیوں کے علاوہ مشاہدہ نفس کے ایک نئے ابعاد کی طرف جاتے ہیں۔" ادب اطفال میں قاری شانے خاصی عرق ریزی سے چیدہ چیدہ چیزیں پیش کی ہیں۔

"مجلسِ چہار سُو" میں جماعت اسلامی کے نائب امیر پروفیسر خورشید احمد صاحب کے جوابات سے تشفی نہیں ہوئی وہ کچھ اکھڑے اکھڑے سے نظر آئے۔ یوں کہیے کہ وہ یہاں بھی ایک "سیاست" کر گئے۔ خیر یہ سلسلہ بہت اچھا ہے جاری رہنا چاہیے۔

میں بن بلائے تو نہیں آ گیا ہوں محفل میں

کہیں سے اذن ملا ہے تو حاضری ہوئی ہے

افتخار عارف کی نعت کے اس شعر میں کیا کیفیت اور پوری ایک داستان موجود ہے۔ مولانا جان اللہ کچھ عرصے سے منظور حسین یا دغزل کی اصطلاحات / علامات، قافیہ ردیف کے حوالے سے تجربات کر رہے ہیں۔ کسی بھی صنف میں تجربہ کرنا اس صنف کی پائیداری کی علامت ہے۔ منظور صاحب کے یہ تجربے آنے والے وقت میں فیصلہ دیں گے کہ یہ درست تھے یا نہیں۔ اکبر حمیدی نے چھوٹی بحر میں اچھی غزل کہی ہے۔ غالب عرفان، انجم جاوید، اکرام تبسم، کرامت بخاری، حنیف ترین، شگفتہ نازلی، شہاب صفدر کی غزلوں سے خوب لطف اندوز ہوا۔ پی ایس چمن جوہر نے غالب کی زمین میں اچھے شعر نکالے ہیں۔ امتیاز دانش کی غزل کا پورا ماحول "محبت اور بھائی چارے" کی کیفیت سے مزین ہے۔ کاوش پرتاب گڑھی کی غزل کوشش کے باوجود ختم نہیں ہو سکی۔ جلیل عالی کی غزل کا مطلع اور مقطع توجہ طلب ہے۔

شوقِ شہرت میں خیالات کو مستانہ کیا

حرمتِ حرف کا ہم نے کبھی سودا نہ کیا

امتحاں تھا وہ رفاقت تھی کہاں بس یہ کہو

بھرم اپنا بھی رکھا اس کو بھی رسوا نہ کیا

"نظمِ عصر" میں شعرا کی نظمیں ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے کے

حوالے سے حقیقی پہلو کے ساتھ ساتھ فکری پہلو کی خوبی سے بھی مزین ہیں۔ نظموں میں احساسات وجذبات کی اچھی ترجمانی کی گئی ہے۔

ستیہ پال آنند کی کہانی ”سانپ اور سانپ“ کی طوالت نے اس کے حسن کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ کہانی پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ہم نارجندر یادو، کشن لال کوہلی اور روپ چند بکروالی کے خاکے پڑھ رہے ہیں۔ آنند صاحب ان کے خاکے لکھتے تو بہتر تھا۔ آنند صاحب نے اس میں چار کرداروں کے لیے ”چنڈال چوکڑی“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہی لفظ یا ترکیب قرۃ العین حیدر نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ”کارِجہاں دراز ہے“ میں بے تکلف دوستوں کے لیے استعمال کی ہے لیکن ہے یہ اصطلاح وہیں سے لی گئی ہو۔ جوگندر پال کا افسانہ ”قیاس“ کو جہاں سے شروع ہوا تھا وہیں ختم ہو گیا۔ اب اس انداز کی کہانیوں کا زمانہ گزر گیا ہے۔ ایسے افسانوں نے قاری کو ادب سے دور کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ”مکمل نامکمل“ ایک عام سی کہانی ہے مگر مشتاق اعظمی نے بڑی چابک دستی سے اسے لکھا ہے۔ آپ کا افسانہ ”فردوس بریں“ تلخ حقیقتوں کا اشاریہ ہے۔ عنوان ہی میں بلا کا طنز ہے۔ اس کہانی میں ہمارے معاشرے کے سیاسی وسماجی بے اعتدالیوں، مَن مانیوں اور شرفا کی عزتوں سے کھیلنے کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔ آپ کے افسانے کی انفرادی خوبی یہ ہے۔ آپ تلخ موضوعات کو سچائی کے ساتھ ادب کا حصہ بنا رہے ہیں۔ جتندر بلو کی کہانی ”فاصلہ“ اچھی ہے۔ ”تخلیقی عصر“ میں عتیق سکندر علی کتب کا تعارف بڑی مہارت سے پیش کرتی ہیں۔ چند سطروں میں کتاب کے موضوع کو سمیٹنا آسان کام نہیں۔ اُن کی محنت اور دیانت لائقِ تحسین ہے۔

اکبر حیدری صاحب کی غزل کا مصرع ... لرزتی ہے کیوں دیے کی لَو "اگر اس طرح ہوتا تو اچھا تھا۔" کیوں لرزتی ہے یہ دیے کی لَو" (اکبر حیدری سے معذرت کے ساتھ ورنہ میں تو اُن کی شاعری کا ایک زمانے سے مداح ہوں)۔ (نوید سروش)

محترم گلزار جاوید بھائی۔ سلام مسنون!

تازہ شمارہ ملا۔ ساتھ میں خط آپ نے جتنے جملے لکھے ہیں قطعی مناسب ہیں۔ آپ کا خلوص اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ آپ مجھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ادھر کچھ مصروفیتوں نے سر اُٹھا لیا جس کے سبب آپ سے خط کے ذریعے گفتگو نہیں کر سکا جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ ڈاکٹر کیول دھیر کے مشاعرے میں مجھے یہ امید تھی کہ آپ موجود ہوں گے مگر انہوں نے بتایا کہ آپ نہیں آ سکے۔ اس مشاعرے میں افتخار نسیم، خضر مسیحا، جنرل رحمان وغیرہ سے ملاقات رہی۔ ہندوستان سے گلزار، گوپی چند نارنگ، شرمیلا ٹیگور (اداکارہ)، راحت اندوری، فاروق انجینئر اور کچھ خواتین نے محفل میں رنگ بھرا۔ اس موقع پر میری کتاب کا اجرا بھی ہوا۔ مشاعرے کی طوالت کے بوجھ نے چور چور کیا خیر....

پچھلے شمارے میں قرۃ العین کا جو interview شائع کیا ہے اُس کی بازگشت ادبی حلقوں میں کافی ہے۔ اپنے سوویت دوستوں تک میرا سلام حسبِ مراتب پہنچا دیں۔ (ملک زادہ جاوید)

محترم گلزار جاوید صاحب السلام علیکم!

یہ شمارہ بھی پچھلے تمام شماروں کی طرح اپنی آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اچھے اچھے مضامین، افسانے، نظمیں اور غزلیں پڑھنے کو میسر آئے۔ ”بالواسطہ“ میں آپ نے اچھے سوالات کر کے مرزا حامد بیگ کے بہت سے پوشیدہ گوشے وا کیے ہیں۔ دوسری جانب مرزا حامد بیگ کا مضمون ”اردو افسانے کے اسالیبِ بیان“ بہت عمدہ اور جامع ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے نئے اور پرانے افسانہ نگاروں کے اسلوبِ بیان کا جامع تجزیہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون ”افسانے کا نیا افق“ اور علی تنہا کا مضمون ”مرزا حامد بیگ کے افسانے“ دونوں مضامین اچھے ہیں اور قاری کے لیے کافی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر توصیف تبسم اور جیلانی کامران کا مرزا حامد بیگ کے افسانوی مجموعوں ”گمشدہ کلمات“ اور ”تار پر چلنے والی“ پر اظہارِ خیال بھی دوسرے مضامین سے کم نہیں۔ افسانوں میں ستیہ پال آنند کا افسانہ ”سانپ اور سانپ“ جوگندر پال کا افسانہ ”قیاس“ اور گلزار جاوید کا افسانہ ”فردوس بریں“ بہت پسند آیا۔ نظموں اور غزلوں کا حصہ جاندار ہی نہیں بلکہ ذہن پر دیرپا اثر بھی چھوڑ جاتا ہے۔ (صابر عظیم آبادی)

محترمی گلزار جاوید صاحب۔ سلام ورحمت۔

’چہار سُو‘ کے تازہ شمارے کے لیے شکر گزار ہوں۔ کوئی شک نہیں کہ ’چہار سُو‘ دوامی اور آفاقی قدروں کے ادب کا ترجمان ہے۔ دنیائے اردو کے ممتاز قلمکاروں کی شمولیت سے ’چہار سُو‘ کے چہار دانگ شہرہ کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کے متنوع اور موثر مشمولات کے مطالعے سے صحیح معنوں میں میرے ادبی ذوق کا لطف ملا۔ مرزا حامد بیگ صاحب کو اُن کے یادگار افسانوں کے حوالے سے پہلے سے جانتا ہوں البتہ ”رفتگاں قلم“ (سوانحی خاکہ) اور ”بالواسطہ“ (باضابطہ ملاقات) کے ذریعہ موصوف کے بارے میں میرے علم میں اضافہ ہوا۔ اس شمارے میں اطراف واکناف کے نامور شعرا وادبا کی یکجائی کے سامنے سرحدیں عاجز نظر آتی ہیں۔ اس صورتِ حال پر راقم کا یہ شعر صادق آتا ہے:

کھلی وہ کون سی سرحد نہیں ہے ان کے لیے
بنائے آشیاں طائر کہاں نہ دیکھیں گے

یہاں امریکہ کے بلند پایہ شاعر وادیب اور محبِ اُردو جناب صفوت علی صفوت کے اس احسان کا ذکر نہ کرنا ناسپاسی ہوگی کہ ہندوستان کے اپنے حالیہ مختصر دورے میں دورانِ ملاقات انہوں نے انتہائی خلوص اور خوشدلی کے ساتھ جناب گلزار جاوید سے اپنے خوشگوار مراسم کا ذکر کیا اور ماہنامہ ’چہار سُو‘ کے معیار ومزاج اور اس کی شہرت ومقبولیت سے مجھے متعارف کرایا۔ جناب

نگزار جاوید نے بھی صفوت صاحب سے اپنے خلوص کا ثبوت اس طرح بہم پہنچایا کہ میرے تازہ شعری مجموعے "کاشور" (۲۰۰۱ء) کا انتساب (جو صفوت صاحب کے نام ہے) کو لیکر "چہار سُو" کی الفوضہ سے اجاری کر دیا۔
"کس حسن سے فکر کیجیے اس لطف خاص کا"
(غلام مرتضیٰ راہی)

بھائی گلزار جاوید!
تازہ شمارے کے تمام مندرجات قابلِ مطالعہ، معلومات افزا اور قابلِ قدر ہیں۔ خاص طور سے "قرطاسِ اعزاز" کا سلسلہ اپنی افادیت کے اعتبار سے بہت ہی وقیع اور اہم ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی شاعر، ادیب یا نقاد کے بارے میں اس کا طرزِ فکر سمجھنے میں آسانیاں فراہم ہو جاتی ہیں۔ آپ صاحبِ کوشش کے بارے میں اتنا مواد فراہم کر دیتے ہیں کہ تشنگی کا احساس باقی نہیں رہتا بالخصوص اس تشنگی کو مٹانے میں آپ کے "براہِ راست" بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آج کی اس مصروف ترین زندگی میں یہ کارِ خیر ایک کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ اس کارِ خیر میں تواتر و تسلسل رہنا چاہئے۔
(مشتاق شبنم)

مکرم جناب گلزار جاوید صاحب۔
خدا کرے کہ آپ مع الخیر ہوں۔ کئی دنوں کے بعد ایک لمبے سفر کے بعد راولپنڈی پہنچا تو ڈاک کی میز پر دیگر ادبی رسائل اور چند خطوط کے ہمراہ "چہار سُو" بھی میرے ادبی ذوق کو شکیبا بنائے ہوئے تھا۔ شمارے کی ترسیل پر بے حد ممنون ہوں۔ "قرطاسِ اعزاز" کے لیے اس بار بھی آپ نے اُردو دنیا کی نہایت فعال اور ہمہ جہت تخلیقی شخصیت کا انتخاب کیا ہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے بلاشبہ افسانہ، تنقید، تحقیق، ڈرامہ نگاری اور بطور مترجم، جس نوع اور جس معیار کے ادبی جوہر نمایاں کیے ہیں ان کی شناخت الگ سے تسلیم کی جاتی ہے اگر انگ، راولپنڈی اور اسلام آباد میں مقیم ادیبوں کو حوالہ بنا کر بات کی جائے تو مجھے پروفیسر فتح محمد ملک، پروفیسر آفتاب اقبال شمیم، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر اعجاز راہی، پروفیسر یوسف حسن اور پروفیسر احمد جاوید کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی تحریریں بھی نظریاتی استقامت کی کسوٹی مثال بن کر اپنے قارئین کے دلوں کی جاگیر بنتی ہیں۔ "سخن تازہ" اور "نظمِ عصر" میں شامل حصہ شعری کاوشیں قابلِ تعریف ہیں۔ پرچہ اس بار بھی جس عنوان سے منسوب کیا گیا ہے وہ آپ کی انسان دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔
(نثار ترابی)

محترمی و مکرمی گلزار جاوید صاحب۔ سلام و رحمت!
"چہار سُو" کا ہر شمارہ اپنی انفرادیت کا نقش مزید گہرا کرتا چلا جاتا ہے اس مرتبہ آپ نے بجا طور پر قرطاسِ اعزاز ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے نام منسوب کیا ہے۔ اُن کا تخلیقی اور تحقیقی کام اس امر کا متقاضی ہے کہ انہیں اس اعزاز سے سرفراز کیا جائے۔ بہت عمدہ اقدام ہے۔
(ڈاکٹر غفور شاہ قاسم)

محترم گلزار جاوید۔
"بیلاگ" "نقشِ اوّل" کی رسید بصورت نوازش نامہ موصول ہوئی مگر نقشِ ثانی کے لیے کوئی شمارہ موصول نہیں ہوا۔ امید ہے مایوس نہیں کریں گے۔ "چہار سُو" کا جنوری، فروری ۲۰۰۲ء کا شمارہ عرصے کے بعد نظر نواز ہوا کیا یہ کرم نوازی مسلسل نہیں ہو سکتی؟ اس شمارے میں محترم قیصر نجفی کا مکتوب قابلِ توجہ ہے اگرچہ انہوں نے پنہاں صاحب کے شعر میں "شمع" پر گرفت درست کی ہے یقیناً یہ وزن "شمع" مدِ جا شمع ہے لیکن ان کا یہ کہنا درست نہیں کہ "ان تمام الفاظ کے آخری حرف کا جزم میں اعلان محلِ نظر ہے یعنی یہ الفاظ دو حرفی تصور ہوتے ہیں اور شعر میں دو حرفی الفاظ کی صورت ہی میں استعمال ہوتے ہیں۔" اور اساتذہ نے دو حرفی کے طور پر استعمال کیا ہے انہوں نے مثال میں جو اشعار بطور ثبوت پیش کیے ہیں وہاں شمع، شمع اور جمع دو حرفی نہیں سہ حرفی استعمال ہوئے ہیں اور یہ ہمیشہ سہ حرفی ہی استعمال ہوتے ہیں۔
(جبران انصاری)

اکرم گلزار جاوید صاحب!
مارچ کی اُداس دوپہر میں قصیدہ شست گاہ کی وساطت مبارک سے مرسلہ "چہار سُو" کا شمارہ نو ہم دست ہوا۔ "چہار سُو" کا نام چہار دانگِ عالم میں بجتا ہے۔ صفحہ بہ صفحہ آپ کی (اور بیٹا جاوید صاحب کی) مدیرانہ تجربہ نمائیوں کے رنگ خوب رنگ لائے ہوئے ہیں۔ اب کی آپ نے "چہار سُو" کے حتذکرہ شمارے کو زلزلہ زدگان کے نام منتسب کر کے انسان دوستی کا ثبوت فراہم کیا۔ مطالعۂ استغراق کے باب میں مرزا حامد بیگ کا گوشہ خاص، گلابِ سیم تخیّل، تازہ نظمِ عصر اور ترسیل رابطے وغیرہ کے حصہ جات بھرپور تھے۔ مرزا حامد بیگ عصرِ حاضر کے ایک نہایت اہم لکھاری ہیں یقیناً وہ ایسی ہی داد و تحسین کے مستحق ہیں۔
(پرویز ساحر)

برادرم گلزار جاوید صاحب!
ماشاء اللہ پرچہ اپنے معیاری مندرجات کی بناء پر لائقِ تعریف و تحسین ہے۔ منتہا پال آنند کا افسانہ "سانپ اور سانپ" بہت پسند آیا۔ پرانے راولپنڈی کی یاد تازہ ہو گئی۔ اُن دنوں پنڈی نے اپنے بازو چاروں جانب نہیں پھیلائے تھے۔ ٹھہرا ٹھہرا پرسکون ماحول اور سبک سبک قدم اٹھاتے وضعدار لوگ یہاں کی پہچان تھے۔
مجلس چہار سُو میں پروفیسر غفور احمد کا انٹرویو ان کے بارے میں اور اُن کے سیاسی رویوں کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح مرزا حامد بیگ کا سوانحی خاکہ، انٹرویو اور ان کا مضمون "اردو افسانے کے اسالیبِ بیان" دلچسپی کا حامل رہا۔ قرطاسِ اعزاز ایک اچھا سلسلہ ہے۔
حمیدہ معین رضوی کا مضمون "فیمنسٹ تحریک کا ادبی منظر نامہ" بہت وقیع مضمون ہے۔ حمد، نظم میں افتخار عارف کی نعت اور شبنم شکیل کی غزل پسند

آئی۔ (طالب انصاری)

محترم و مکرم گلزار جاوید صاحب!

"چہارسو" کا یہ شمارہ بھی ایک یادگار اور انتہائی قابل قدر شمارہ ہے (حسب سابق)۔ اللہ کریم آپ کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے اور آپ اسی طرح اردو زبان و ادب کی سربلندی کے لئے کام کرتے رہیں۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ صاحب کو قرطاس اعزاز سے نواز کر آپ نے ایک بڑا کام انجام دیا ہے۔ بے شک حامد بیگ صاحب اس اعزاز کے مستحق ہیں۔ جوں جوں جریدہ کے صفحات الٹتا جا رہا ہوں نئے سے نئے انکشافات عیاں ہوتے جا رہے ہیں۔ چہارسو کو سرسری طور پر پڑھنا خود اپنی ذات پر ظلم کرنا ہے۔ (عابد انصاری)

جناب گلزار جاوید صاحب۔ السلام علیکم!

آپ کا "چہارسو" تازہ شمارہ جنوری فروری 2006 ملا۔ ماشاءاللہ معیاری تخلیقات سے مزین ہے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ صاحب کے فن اور شخصیت کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع آپ کی کاوش "چہارسو" نے فراہم کر دیا ہے ویسے تو وہ عرصہ دراز تک راولپنڈی/ اسلام آباد کے ادبی حلقوں میں شرکت کرتے رہے اور ان سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہی ہیں۔ بلکہ وہ حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کے سیکرٹری بھی رہے ہیں۔ ان کے کئی مضامین اور افسانے بھی ان سے سنے جو حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی اسلام آباد کے تنقیدی اجلاسوں میں انہوں نے پڑھے تھے۔ لیکن پھر بھی اس قدر آگاہی مجھے پہلے نہیں تھی۔ اس کے علاوہ تمام دوسری تخلیقات افسانے، نظمیں غزلیں دلچسپی سے پڑھیں۔ مجموعی طور پر ایک اچھا شمارہ ہے۔ (صدیق فنکار)

گرامی القدر گلزار جاوید صاحب! سلام و رحمت۔

ممتاز افسانہ نگار مرزا حامد بیگ کے نام "قرطاس اعزاز" "چہارسو" کی ادبی دیانت کی اس روایت کا مظہر ہے، جس پر وہ اپنی اشاعت اول سے قائم ہے۔ امید واثق ہے کہ اس روایت کی بدستور فکری اخلاص سے پاس داری کی جاتی رہے گی۔

"اردو افسانے کے اسالیب بیان" کے عنوان سے شامل اشاعت مقالہ تازہ شمارے کا اختصاص بن کر سامنے آیا ہے، جس نے شمارے کی ادبی اہمیت کو دوچند کر دیا ہے۔ یہ مختصر اور اپنی نوعیت کا منفرد مقالہ مرزا حامد بیگ نے ۲۰۰۵ء میں علی گڑھ (بھارت) میں منعقدہ سارک کانفرنس میں پڑھا تھا۔ اردو افسانے کے اسالیب پر اس نوع اور معیار کی تحاریر کمیاب ہیں۔ یہ تحریر اردو افسانے کا اسلوبیاتی ارتقا بھی قرار دی جا سکتی ہے اور اردو افسانے کا تجزیاتی مطالعہ بھی۔ اردو افسانے پر خصوصاً اسلوب بیان کے حوالے سے اتنی وقیع و جامع تحریر ہماری نظروں سے نہیں گزری ہے۔ البتہ یہ جان کر ہمیں حیرت ہوئی ہے کہ اس مقالے میں ایک عہد ساز افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے اسلوب بیان کو کہیں زیر بحث نہیں لایا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یقیناً ایسا دانستہ طور پر نہیں ہوا ہے بلکہ سہواً ہوا ہے۔

"براہ راست" گلزار جاوید اور مرزا حامد بیگ ہر دو صاحبان قلم کی بالغ نظری کا آئینہ دار ہے۔ سوالات کی معقولیت اور جوابات کی اصابت قاری کو سیاحت کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ دونوں قلم کار اپنی اپنی جگہ پر بھاری پتھر ہیں بقول راقم الحروف:

بھاری ہے اپنی اپنی جگہ پر ہر ایک سنگ
تجھ کو یقین نہ ہو تو کسی کو اٹھا کے دیکھ

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "افسانے کا نیا افق" مرزا حامد بیگ کی افسانہ نگاری کی متنوع فنی جہات کی نشان دہی کرتا ہے۔ ان کے خیال میں بیگ صاحب کی کہانی ان ٹولڈ سٹیٹمنٹ، بکھری ہوئی امیجز، شعری رویہ، علامت و تجرید اور الجھاوے سے ترتیب پاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا تجزیہ مرزا حامد بیگ کے چند ایک افسانوں کی حد تک تو درست ہے مگر اس تجزیاتی مطالعہ کا اطلاق ان کی تمام تر افسانوی دانش پر نہیں ہوتا، جو جدت طرازی اور دستاری کاوشوں سے عبارت ہے۔ جیلانی کامران کی اس رائے سے بھی ہم اتفاق کرتے ہیں کہ مرزا حامد بیگ کی کہانی تجریدی ہے اور تحریک کے راستے ادب میں داخل ہوا دائستہ کتم کھانے کے مترادف ہے۔ جبر تحریک بیچیدہ کاری کے اس عمل کی مظہر ہے، جس کے نتیجے میں فکر و فن کے نازہ بتازہ اور نو بہ نو ذائقے روشناس کرائے جاتے ہیں۔ مرزا حامد بیگ کی افسانہ نگاری تجارب تکنیکی تجربات اور قلم سیکنگ کی دانش کے ارتقا کی ایک عملی صورت میں نمو پذیر ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنے قلم سے کیمرے کا کام لیا ہے۔ ان کے ہاں واقعات کی جت کاری ہو یا کردار نگاری یا پھر ماحول اور فضا کی منظر کشی، ہر عمل میں تلاش سے زیادہ عکس بندی کا تاثر ملتا ہے۔ ایسے تخلیقی تجربے بشریت افسانہ میں بوجوہ قرار نہیں پاتے بلکہ ارتقا و پیش رفت تسلیم ہوتے ہیں۔ مرزا حامد بیگ نے افسانے کے کینوس پر اپنی تکنیکی فراست کو جس گہرے فنی شعور کے ساتھ منتقل کیا ہے، اس کی روشنی میں انہیں افسانے کا دماغ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

اس بات سے ارباب نقد و نظر کو اتفاق ہے کہ بیگ صاحب چند جگے کا روایتی افسانے نہیں لکھتے۔ ان کے افسانے فرسودہ اسلوب اور فنی اعتبار سے یک رخے افسانوں کے خلاف ردعمل کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ ان کے افسانوں کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ حقیقت نگاری کے جدید ادبی رجحانات کے حامل ہیں۔ خاص کر لسانی تشکیلات اور علامت نگاری میں انہوں نے تحیر کن تجربات کئے ہیں۔ وہ نہ صرف گہرا تہذیبی شعور رکھتے ہیں بلکہ اپنے افسانوں میں تہذیبی شعور کو اجاگر کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔

"سخن تازہ" میں سید مشکور حسین یاد، شبنم شکیل، ناہی انصاری، کرشن

کمار، کوثر شاہد، واسطی، جلیل عالی، انجم جاوید اور شہاب صفدر کی غزلیں بھی اچھی لگی ہیں۔

جوگندر پال کا افسانہ "قیاس" ایسی ہی نفسی کیفیات کا ایسا اظہار ہے جس میں بیانیہ اور علامت نگاری نے ایک اکائی کی صورت اختیار کر لی ہے اس افسانے میں ماورائی اور ذہنی حقائق کو اس ہنرمندی سے ہم آہنگ کیا گیا ہے کہ مرئی اور غیر مرئی اشیا کے درمیان خط امتیاز کھینچنا دشوار ہے۔ دراصل جوگندر پال کے ہاں علامت ایک با معنی ابہام کو جنم دیتی ہے جسے سمجھنے کے لئے قاری کو ذہنی مشقت کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ موت سے پہلے موت کا نفسی تجربہ جوگندر پال کے افسانوں کا ایک نمایاں موضوعاتی پہلو ہے جس پر ان سے بہتر افسانوی ادب شاید ہی کسی نے تخلیق کیا ہو۔ "قیاس" اس حوالے سے ایک عمدہ مثال ہے۔

جتیندر بلو نے "فاصلہ" کے عنوان سے ایک ایسا افسانہ لکھا ہے جو اپنی مٹی کی بو باس اور اس سے وابستہ اساطیر کے پرتو سے سرشار ہے انہوں نے شعور کی رو کے تحت اپنے بیانیہ کو بعض مقامات پر ماضی سے اتنی ہی پابندی سے ہم رشتہ کیا ہے کہ ان پر ناسٹلجیا کا شکار ہو جانے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ مغربی ممالک میں آباد افسانہ نگاروں کی یہ قدر مشترک ہے کہ وہ اپنے ماضی میں سانس لیتے ہیں اور مغربی معاشرے کے فکری و عملی نہج پر اس رویے کا ماتم کرتے ہیں جو ان کی تہذیب و معاشرت سے متصادم ہو۔ لیکن جتیندر بلو نے "فاصلہ" میں اس طرز عمل سے گریز کیا ہے۔ انہوں نے عام روش کے برعکس مغربی تہذیب کے حقیقی ناظر کی آغوش میں نشوونما پانے والے تشکیک و توہم کو موضوع بنا کر کہانی کاری کی ایک نئی موضوعاتی جہت کی سمت نمائی کی ہے۔ ایک مغرب زدہ خاتون سے شادی کے بعد بھی اس کی آزادہ روی کے تصور سے دامن چھڑانا مشکل ہے خاص کر کسی ہندوستانی کے لئے مشکل تر ہے یہی وہ نکتہ ہے جسے بنیاد بنا کر جتیندر بلو نے اپنی کہانی کا تار و پود تیار کیا ہے۔ کہانی میں واقعات کی بنت فطری اور حقیقت سے بے حد قریب ہے۔ تیسرے بچے کا رنگ روپ میں ہندوستانی باپ اور اپنے بڑے بھائی سے یکسر مختلف ہونا افسانے کا اہم ترین موڑ ہے جو افسانے کے فنی مطالبات یعنی تصادم اور کشمکش کو بھی جنم دیتا ہے اور افسانہ نگار کے مافی الضمیر کی بھی تشریح و تعبیر کرتا ہے اس نوع کی فنی باریکیوں کا شعور جتیندر بلو کی افسانہ نگاری کا اختصاصی پہلو ہے جو معاصر افسانہ نگاروں میں ان کی انفرادیت اور الگ شناخت کا جواز بنتا ہے۔

جتیندر بلو کا مسلک انسانیت ہے کہانی کاری کے عمل میں ان کی تمام تر توجہ اسی ایک نکتے پر مرکوز رہتی ہے۔ "فاصلہ" میں انہوں نے انسانی اقدار کے تحفظ و فروغ کا احساس اجاگر کرنے میں جو اسلوب اپنایا ہے وہ انہی سے مخصوص ہے۔ ان کا کمال فن یہ ہے کہ اخلاقیات کا درس دیتے وقت بھی وہ ایک افسانہ نگار ہی رہتے ہیں اور کوئی اپدیشک، پنڈت یا مبلغ نہیں بنتے۔ ان کے کردار اصلاح و تعمیر کے جذبے سے سرشار ہونے کے باوصف بھاشن (surm on) دیتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔ جتیندر بلو ایسے مواقع پر نہایت فنی احتیاط سے کام لیتے ہیں اور دیگر اصلاح کار ادیبوں کی طرح مقصدیت کو فن پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ جتیندر بلو کی ابتدائی کہانیوں میں زیادہ تر ہندوستان کی قومی یکجہتی کے لئے سیکولرازم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے لیکن فی زمانہ ان کی فکر و نظر میں جو وسعت اور ہمہ گیری دکھائی دیتی ہے وہ ان کی تخلیقات کی آفاقیت پر دلالت کرتی ہے۔ "فاصلہ" میں وہ ایک بین الاقوامی برادری کا خواب دیکھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ بلاشبہ نسلی امتیاز کے عفریت نے عالمی سطح پر جس نوع کی کدورت اور نفرین کے سائے پھیلا دیے ہیں انہوں نے انسان، زندگی اور کائنات کے survival کو ایک سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔ جتیندر بلو ان سایوں کو اپنے فن کی روشنی میں تحلیل کرنے کے عمل میں مصروف ہیں۔

گلزار جاوید کا افسانہ "فردوس بریں" زبان و بیان پر قدرت، جزئیات نگاری میں مہارت اور رمز و ایما کی تہ داری کے حوالے سے ایک ایسی توانا تحریر ہے جو تخلیقی سطح پر اسلوب بیان کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ گلزار جاوید کے ہاں اسلوب بیان کو کلیدی حیثیت حاصل ہے تاہم وہ لفظی بازیگری میں یقین نہیں رکھتے بلکہ واقعہ، موضوع، ماحول اور کردار کے مناسب حال ایسے الفاظ، تراکیب اور جملے استعمال کرتے ہیں کہ معنی و مفہوم کے حوالے سے ان کا متبادل تلاش کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں تہذیبی رچاؤ جس حسن و کاملیت سے پایا جاتا ہے اس نے انہیں تہذیب و معاشرت کی دستاویزات کی حیثیت بخش دی ہے۔ گلزار صاحب نے "فردوس بریں" میں ہمارے ان تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو ہمارے حقیقی انفراسٹرکچر structure کے بنیادی عناصر ترکیبی ہیں اور جن کا تحت شعوری ہمیں یکجہتی کی لڑی میں برقرار رکھنے کا ضامن ہے۔

"فردوس بریں" موضوعاتی سطح پر ہماری بدلتی ہوئی تہذیبی و معاشرتی اقدار کے خلاف ایک ایسے احتجاج کا احساس دلاتا ہے جس میں قومی درد کی کسک بھی ہے اور انسانی محبت کی حدت بھی۔ گلزار جاوید نے بین السطور میں پیش نظر سیاسی دہشت گردی کو جس جذباتی صداقت سے نشانۂ ہدف بنایا ہے وہ بیک وقت سبق آموز بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ قاضی صاحب کا علامتی کردار آج کے ہر اس انسان کا تمثالیہ ہے جو قومی و بین الاقوامی دونوں سطحوں پر اپنی عزت نفس کے تحفظ کی خاطر برے سے برے حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہے۔

ستیہ پال آنند کی نثر ہو یا نظم ذہنی حقائق بھی سامنے لاتی ہے اور ماورائی اسرار و رموز بھی کھولتی ہے۔ ان کے مشاہدات و تجربات کے اظہار میں کبھی کبھی روحانی لمس spiritual touch کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ہم نے اس سے پہلے بھی کسی تبصرے میں انہیں ایک روحانی شاعر و ادیب قرار دیا

ہے۔ وہ معروف معنوں میں تو صوفی نہیں ہیں لیکن ان کا طبعی رجحان یقیناً تصوف کی جانب ہے۔ ان کی مثال اشاعت دونوں نظمیں ہمارے دعوے پر دال ہیں۔ "موت کا چہرہ" میں موت کو مجسم صورت میں دیکھنا بظاہر ایک واہمہ لگتا ہے جو افکار، ماحول کے تاثر کا شاخسانہ ہے اور جسے ہم Abstract Image بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے یہ تجریدی شکل Abstract Image ایک ٹھوس شکل concrete image کی صورت اختیار کر لیتی ہے گویا موت ماں کے مشفق وجود میں تحلیل ہو کر سامنے آ جاتی ہے اور ماں کی بیمار بیٹی کو یہ پیغام دیتے ہوئے محسوس ہوتی ہے

"...... کچھ ذرا سی دیر رک جاؤ
مری بچی مجھے جلدی نہیں ہے"

یہ وہ مقام ہے جہاں آنند صاحب کی روحانی بیداری شدت سے اپنا احساس دلاتی ہے۔

آنند صاحب کی دوسری نظم "دہائی ہے مشکل کشا علی" کلی طور پر ان کے روحانی ارتقا کی غماز ہے۔ حضرت علی منبع فقر مخزن تصوف ہیں اور ولایت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں ان کے روحانی مراتب و مدارج کی معرفت حاصل کرنا ہر کس و ناکس کی بات نہیں ہے اس کے لئے ایک طویل روحانی مجاہدے کی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ پال جی نے روحانی ریاضت کے کتنے ہفت خواں طے کئے ہیں لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ انہیں محمدؐ و علیؑ دونوں عظیم ہستیوں کی معرفت نصیب ہے۔ قبل ازیں ان کی ایک نہایت اثر انگیز نعتیہ نظم "دھیان میں گم" بھی ہماری نظروں سے گزری ہے۔ جس کی چند لائنیں ہم اپنی روحانی بالیدگی کے لئے یہاں نقل کرتے ہیں۔

تھوڑی سی عمر رہ گئی ہے حضورؐ
ارض طیبہ پہ میں ترا تنہا
منتظر آپ کی شفاعت کا
کلۂ خوں اپنا سر جھکائے ہوئے
اور دست طلب بڑھائے ہوئے
دھیان میں گم کھڑا ہوا ہوں حضورؐ
ہندوام کافرم گنہگارم

پیش نظر نظم "دہائی ہے علی مشکل کشا" کے سرنامے میں آنند صاحب نے مرزا غالب کے ایک معرکۃ الآرا قصیدہ در مدح علی سے دو اشعار نقل کئے ہیں۔ اس قصیدے کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے

نقش لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علی عرض کر اے فطرت وسواس قریں

امیر خسروؒ سے ستیہ پال آنند تک شاید ہی ایسا کوئی شاعر ہو جس کے قلم نے در علی پر سر خم نہ کیا ہو۔ حضرت علی کی شان میں متعدد دعائیے بھی ہیں اور قرآن خدا بھی ان کا رطب اللسان ہے۔ انہیں مستجاب الدعوات بھی تسلیم کیا جاتا ہے اور مشکل کشا بھی۔ آنند صاحب کے اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بھی ان کی دعا جناب علی کے توسل سے مستجاب ہو چکی ہے۔

علی مشکل کشا، اس بے نوا شاعر کی بیوی کو
کرم کی بھیک سے اپنی نوازو پھر سے صحت دو

ڈاکٹر سوامی شیلا نند کی رباعیات' کاوش پیا گھوشی کے دوہے' بھگوان داس اعجاز کا رنج گنجی (دلی نامہ) اور مشتاق شبنم کی نظم بھی لائق تحسین ہیں۔

نا ای انصاری ایک صاحب طرز تخلیق کار ہیں۔ میرے کلمۂ خیر کا شکریہ ادا کرکے انہوں نے اپنی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے۔

(قیصر تجنی)

عزیزی گلزار جاوید! خوش رہو۔

تمہیں خط لکھتے ہوئے بھی ایک عجیب احساس گناہ ہوتا ہے تمہاری محبت اور خلوص کا میں نے صحیح جواب نہیں دیا۔ اس عرصہ میں راجندر سنگھ بیدی پر میں نے اپنی کتاب مکمل کی۔ مضامین کی ایک اور کتاب بھی چھپ گئی۔ بہت سے مضامین لکھے، بہت سے لیکچر دیے اور اب میں اتنا تھک گیا ہوں کہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیا کروں کیا کہا ہے کمر کا درد باقی ہے ابھی مجھے دو تین مہینے کا وقفہ درکار ہے اس کے بعد ہی کچھ مستقبل کے منصوبے بنا سکوں گا۔ میری ۱۸ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ بہت سی اب دستیاب بھی نہیں۔ جو کچھ دستیاب ہیں وہ آپ تک کیسے پہنچاؤں اسی تردد میں رہتا ہوں۔

مجھے اپنے پر مضمون لکھوانے یا نمبر نکلوانے کا قطعی شوق نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس خیال سے باز آ جاؤ۔ میں دراصل اتنا اہم آدمی نہیں ہوں کہ اس پر نمبر نکالا جائے۔ من آنم کہ من دانم۔ میں اپنی حیثیت کے مطابق جینے میں خوش ہوں۔ آپ نے بہت اچھے نمبر نکالے لیکن جن پر نکالے وہ اس کے مستحق بھی تھے۔ میں خود کو مستحق نہیں سمجھتا۔ تھوڑی بہت گمنامی میں رہنے کے جو مزے ہیں ناموری کی قیمت پر ان کا سودا گھاٹے کا ہے۔

میں تمہیں بھولا نہیں ہوں اور تمہیں بہت عزیز بھی رکھتا ہوں۔ لیکن بر دست تمہارے تقاضوں سے نپٹنے کی مجھ میں سکت نہیں۔ دو تین مہینوں کے بعد ان مسائل پر سوچنے کی فرصت نکال سکوں گا۔

خدا تمہیں خوش رکھے، تندرست رکھے، میری کوتاہیوں کو درگزر کرنا۔ اور میرے متعلق اپنے دل میں کوئی کھوٹ نہ آنے دینا۔

(پروفیسر وارث علوی)

محترم گلزار صاحب! السلام علیکم۔

آپ کی بڑی ہمت ہے کہ بغیر اشتہارات کے تعاون سے "چہار سو" نکالے جا رہے ہیں۔ کیا کوئی آپ کا ہاتھ بٹانے والا نہیں ہے؟ اتنی

آپ کو بھیجا تھا۔ پاکستان میں بہتوں کو ملا۔ سنا ہے آپ کو شمارہ نہیں ملا۔ دوبارہ بھیج رہا ہوں۔ اس میں آپ کا انٹرویو شامل ہے۔ اس انٹرویو پر خوب خوب ردعمل آیا ہے۔ بہتوں نے ناپسند کیا ہے کہ آپ کے جواب مبہم ہیں۔ لیکن تعریف میں بھی خطوط آئے ہیں۔ چند شائع کروں گا۔

میں نے فنکاروں سے جتنے انٹرویو لئے تھے وہ دو جلدوں میں قبل شائع ہو چکے ہیں۔ ''روبرو'' اور ''آمنے سامنے'' کے نام سے ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی والوں نے دونوں جلد شائع کی تھیں۔ اب تیسری جلد کا مسودہ تیار ہو چکا ہے۔ ''روبرو'' کے نام سے شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ آپ کا انٹرویو شامل رہے گا۔

۲۰۰۶ء کی نئی کتاب ملاحظہ کریں۔ ایک کتاب لاہور کے ڈاکٹر طاہر سعد ہارون صاحب بھیجیں گے۔ ان کی دوہا نگاری پر میری کتاب آپ یقیناً پسند کریں گے۔ اگر کتاب نہیں ملی ہو تو خط لکھ کر منگوالیں۔

(ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی)

جنابِ گلزار جاوید!

آپ کے ذریعے ''چہار سُو'' کے تمام شمارے حوالہ بنتے جا رہے ہیں جسے ادب کے شیدائی اور تحقیق کرنے والے اپنے لئے ایک خزانہ سمجھیں گے۔ آپ نے اس مشکل دور میں جو آسانیاں ایک قاری کے لئے مہیا کی ہیں وہ قابلِ صد ستائش ہیں۔ جو جرأتِ فرزانگی آپ شعر اور ادبا کی اس ناقدری کے دور میں کر رہے ہیں اُس کی قدر کرنے سے یہ جہانِ خرابی قاصر ہے۔ اور کیونکہ ایسا آپ بغیر کسی صلہ کے کر رہے ہیں اس لئے میں اس کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ خدا آپ کو اس کارِ خیر کے لئے لمبی عمر عطا فرمائے۔ (دل نواز دِل)

محبّ گرامی جناب گلزار جاوید صاحب! آداب و نیاز۔

''چہار سُو'' کے شمارے باقاعدہ ملتے رہے۔ میری خاموشی کے بارے میں آپ کی شکایت درست ..... لیکن شاید آپ کی نظر سے (نومبر کے اول ہفتے میں شائع ہونے والی) خبر نہیں گذری کہ عید سے ایک دن قبل میری ایک نوعمر بیٹی کہ جو روزے سے تھی غشی کی کیفیت میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اور میں آج تک ذہنی طور سے اور جسمانی طور سے اس صدمے کے حصار سے باہر نہیں نکل سکا ہوں۔ اس کی موت کی خبر راولپنڈی کے اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی اور کچھ دوستوں کے تعزیتی پیغامات بھی....

اس دوران ایک بار راولپنڈی بھی آیا ہوں اور آپ کی رہائش کے بالکل قریب ویسٹرج کی اسٹریٹ نمبر 4 میں اپنے بھتیجے کے گھر قیام بھی کیا لیکن باوجود خواہش آپ سے ملاقات نہیں کر سکا۔ اب 30 مارچ کو بحرین ایک مشاعرے کے سلسلہ میں بیرونِ ملک جا رہا ہوں۔ انشاءاللہ اپریل کے وسط تک واپس آؤں گا۔ واپسی پر جب بھی راولپنڈی آنا ہوا تو انشاءاللہ ملاقات بھی ہوگی۔

''چہار سُو'' کے بارے میں یقیناً کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ ذرا بڑی ادبی دنیا میں بہت سے لوگ صاحبِ حیثیت ہیں مگر کسی کی شاید اس پر نظر نہیں پڑتی۔ مخلص احباب کو معلوم ہے کہ گجرال صاحب دولت میں فواسس کے بعد دوسرے نمبر پر ہیں۔ گجرال صاحب کی شخصیت ان کے شجرے سے آخر تک پڑھی۔ مزا آیا۔ کمال کی بات تو یہ ہے کہ گجرال صاحب نے اپنا شجرہ تک دے دیا۔ گجرال صاحب پر بھرپور لکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ پر قرطاسِ اعزاز بھی خوب ہے۔ نظم کا حصہ بھی خوب ہے۔ چہار سُو کی لکھائی چھپائی خوبصورت ہے۔ ''چہار سُو'' یقیناً تاریخی دستاویز بنتی جا رہی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی بدولت بھولی بچھڑی اور بچھی ہوئی شخصیات پڑھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ میں ان کے سب قلمکاروں کو سلام اور مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ (آفق دہلوی)

محترمی! السلام علیکم۔

میں چھ ماہ تک امریکہ اور برطانیہ کے مختلف شہروں میں علمی ادبی نشستوں اور مشاعروں میں شرکت کے بعد حاضر ہوا تو آپ کا خط ملا تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے علی گڑھ ملتانی ایسوسی ایشن نے زلزلہ زدگان کی امداد کے سلسلے میں منعقدہ مشاعروں میں شرکت کے لئے مدعو کیا تھا۔ تقریباً 19 شہروں میں مشاعرے منعقد ہوئے جن میں نیویارک، بوسٹن، واشنگٹن، آرلینڈو، کلیولینڈ، شکاگو، ڈیٹرائٹ، اٹلانٹا، ہیوسٹن، سان فرانسسکو اور کئی دوسرے شہر شامل تھے۔ سفر اور مشاعرے بے حد مصروف اور کامیاب رہے۔ صدراتی فنڈ کے سلسلے میں کافی ٹکٹ بھی فروخت ہوئے جو زلزلہ زدگان کے امدادی فنڈ میں جمع کرادی گئی ہے۔ بہت سے احباب سے ملاقاتیں بھی ہوئیں سفر بھی دلچسپ گزرا اور ہم سفر بھی خوب رہے۔ امریکہ میں ملاقاتوں کے بعد برطانیہ آ گیا جہاں برمنگھم، بریڈفورڈ، لندن، مانچسٹر وغیرہ میں تقریبات تھیں۔ یہاں بھی احباب نے بہت خیال رکھا اور محبتوں سے پذیرائی کی۔

''چہار سُو'' کا تازہ شمارہ مل گیا۔ اپنی دیرینہ روایات کے مطابق یہ پرچہ بھی خوب ہے۔ ایک آدھ مضمون اور کچھ شعرا کا کلام پڑھا۔ قرطاسِ اعزاز ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے نام ہے میں انہیں ذاتی طور پر طویل عرصے سے جانتا ہوں۔ بڑے اچھے افسانہ نگار، نقاد اور محقق ہیں۔ رفیک قمر میں مصطفےٰ ملک سے ان کی کتابوں کی فہرست اور ان کی علمی ادبی سرگرمیوں کا حال معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ بہت سا کام کیا ہے اور بہت سا کرنا باقی ہے۔ ماشاءاللہ جوان ہیں ہماری بڑی امیدیں اُن سے وابستہ ہیں۔ افتخار عارف، عظیم صبا نوری، مشکور حسین یاد، شبنم شکیل کی نعتیں عقیدت و محبت سے بھرپور ہیں۔ غزلیں بھی شعرا کی اعلیٰ درجے کی ہیں۔ باقی پرچہ پڑھنا باقی ہے۔ یہ تو صرف حاضری ہے اور آپ کے ارشاد کی تکمیل۔ (محسن احسان)

محترم گلزار جاوید! السلام مسنون۔

آپ نے ''چہار سُو'' بھیجنا بند کر دیا ..... اس کا ملال ہے کہ سارا

"حوالی مہیں آجاؤں تو ضرور لکھوں گا۔ یہاں پر عباس تابش کی زیر ادارت ایک کتابی سلسلہ "دبستان" شروع ہوا ہے۔ میں اس کا اعزازی سرپرست ہوں۔ آج کل میری توجہ کچھ اس جریدے کی طرف بھی ہے کوشش کر رہا ہوں کہ اپنے نام کی وابستگی کی وجہ سے اس کا بھی کچھ معیار قائم رہے۔

(مرتضیٰ برلاس)

بھائی گلزار جاوید! سلام اور بہت ساری دعائیں۔

بہت مدت سے آپ کی محفل سے غیر حاضر رہی وجوہات کو [illegible] یونیورسٹی کے دیئے گئے ایک تعلیمی پراجیکٹ پر کام کر رہی تھی۔ جدید طریقہ تعلیم سے متعلق۔ اسی لئے پاکستان بھی نہ جا سکی اور اب دو برس بعد مارچ میں گئی تو موسم کی جارحیت نے بھاگنے پر مجبور کر دیا آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ رسالہ چہار سو کے بارے میں بات چیت نہ ہو سکی۔ اس دفعہ آپ کے قرطاس اعزاز میں چھپی ہوئی شخصیت کی گفتگو سے کچھ اختلاف کے پہلو نکل آئے جو میں قلم بند کر کے بھیج رہی ہوں۔ صفحہ 98 کے پیراگراف اول میں اور دوم میں الزبتھ براؤننگ کی جگہ رابرٹ براؤننگ لکھا گیا ہے۔ الزبتھ براؤننگ اپنی شہرت ہے... اوپر ہے الزبتھ براؤننگ پر کیا گذری۔ قاری تصحیح کر لیں معلوم نہیں کس کی غلطی ہے ممکن ہے میری ہو..... زلزلہ زدگان پر لکھی ہوئی نظموں نے رومال بھگو دیئے۔ مجھے کچھ بھی نہیں کہنا... قیصر نجفی کی نظم اچھی لگی۔ ستیہ پال آنند کا افسانہ طویل ہو جانے کے باوجود اچھا لگا۔ ماہرانہ انداز ہے آپ کا افسانہ ایک اہم روایت کی بنیاد ڈال رہا ہے میں نوٹ لکھ رہی ہوں پورا ایک مضمون لکھنے کا ارادہ بن رہا ہے فیمنسٹ تحریک کے حوالے سے مضمون اب اگلے شمارہ میں ہی آئے گا۔

مرزا حامد بیگ کے کوائف اور کارگزاریاں دیکھ کر ایک غلط فہمی دور ہوئی ان کے افسانوں کے موضوعات کے باعث میں انہیں معمر شخص سمجھتی تھی معلوم ہوا کہ ان کی ادبی عمر اور طبعی عمر دونوں مجھ سے کم ہیں۔ یعنی 1966 میں انہوں نے میٹرک کے امتحان کی تیاری جبکہ میں انگریزی ایم اے مرے کالج سے کر کے ایم اے اردو کی پرائیویٹ تیاری میں مصروف تھی... اور... افسانے کی دنیا میں قدم جما رہی تھی کیونکہ میرا پہلا افسانہ 62-63 کے درمیان چھپ چکا پھر 1975 میں چھپتی رہی تواتر سے خصوصاً اوراق میں۔ اس تمہید کا مقصد اس مضمون کے خاتمہ پر واضح ہو جائے گا۔ پہلا مضمون "اردو افسانے کے اسالیب بیان" میرے لئے توجہ کا باعث تھا مرزا حامد بیگ کا لہجہ بہت اونچا اور خوفزدہ کرنے والا محسوس ہوا مغرب میں بس جانے والے ذرا..... مضمون ختم کر کے مایوسی ہوئی۔ موضوع سے مضمون انصاف نہیں کر سکا مضمون میں واقعاتی ترتیب زمانی اور منطقی نتائج میں ربط نہیں ہے۔ افسانہ میں جائز ہے شعور کی رو جہاں جہاں چاہے لے جائے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں حجاب گروہ تو نہیں تھے یہ سارا ڈرامہ تو انقلاب روس کے بعد شروع ہوا۔ اور ہم خواہ کتنے ہی ترقی پسندی یا تحریک کی برائی کریں حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۶ سے ۱۹۶۰ء جتنے کامیاب اور بڑے افسانے اس تحریک کی وجہ سے لکھے گئے بعد میں نہیں لکھے گئے۔ تحریک سے وفاداری اور منشور کی مجبوری کے باوجود یہ افسانے نعرے بازی کی مکمل مصنوعات کی طرح نہیں تھے بلکہ ہر افسانہ نگار کی اپنی تحریر پر اپنی شخصیت کی چھاپ تھی۔ بڑے افسانہ نگاروں کی اکثریت ترقی پسند تحریک سے منسلک تھی جبکہ اتنی ہی کامیابی سے فن برائے فن کے تحت لکھی جانے والی تحریریں بھی اتنی نہ کی کامیاب رہیں اصل میں صرف دو گروہوں سے بحث ہو سکتی تھی۔ حقیقت نگاری اور علامت نگاری۔ ان دونوں اسلوب میں ذیلی انداز اور صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اب مرزا حامد بیگ نے ہر ذیلی انداز یا صورت کا ایک افسانہ بیان کر کے مضمون کو الجھا دیا ہے مافی الضمیر واضح نہیں ہو سکا اسی طرح انہوں نے اکثریت میں صرف علامتی افسانے لکھنے والوں کا تذکرہ کیا ہے پھر انہوں نے ہر اسلوب کے ڈانڈے مغربی ادیبوں سے ملائے ہیں میں نہیں سمجھتی کہ اچھا افسانہ نگار ہونے کے لئے کسی نہ کسی مغربی ادیب سے مماثلت ضروری ہے اسی طرح عصمت چغتائی کی تیز چمکیلی فکر میں فرائیڈ کی بازگشت ہے گمراہی۔ ڈی ایچ لارنس کا ایک مضبوط فکری نظام نہیں ہے جس کی طرف مکیلے نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی لارنس کے فکری رویئے کے بارے میں۔

کچھ باتیں میں "براہ راست" کے بارے میں بھی کہنا چاہوں گی ہر ایک سے معذرت کے ساتھ مغرب میں عمر کا زیادہ حصہ گذارنے کے بعد ہم لوگ اصولوں اور نظریوں پر اختلاف رائے رکھنے کو صحت مندی کی علامت سمجھتے ہیں۔ اس کا اظہار کرنا ضروری خیال کرتے ہیں چنانچہ اختلاف پر برا ماننا غیر صحت مند رویہ کو ظاہر کرتا ہے بس اعتراض منطقی ہونا چاہئے۔

صفحہ ۱۳ پر مرزا حامد بیگ کہتے ہیں "میں مشکل پسند ہوں اور پتہ ہے..... قصور ناقدین کا ہے جنہوں نے شرح نہیں لکھی۔

ناقدین کے بجائے خود افسانہ نگار کیوں نہ ساتھ شرح لکھے؟ کیا ناقد کو وہ آزادی حاصل نہیں جو ادیب کو حاصل ہے یعنی موضوع کے انتخاب کی آزادی؟ اور اگر ناقد ہی کو نہ پتہ آئی گتھی تو کیا کرے؟

اس کا ایک منطقی نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ فنکار ایک کل وقتی نقاد ڈھونڈے اور نا کہ قارئین کا کتب بجائے اور انہیں سمجھائے میرا خیال ہے اگر لکھنے والے کے پاس کوئی اہم پیغام ہے تو براہ راست قاری تک پہنچانا چاہتا ہے اگر ایسا نہیں ہے تو پھر مشکل پسندی وقت آفرین کا مطلب ہے ادیب محض رعب ڈالنا چاہتا ہے ایک چھوٹی مثال دوں گی [illegible] سائرہ ہاشمی نے مجھے انیس ناگی کی کتاب "دیوار کے پیچھے" دی تھی میں نے کوئی دس دفعہ کوشش کی کہ پوری کتاب پڑھوں مگر دس صفحوں سے آگے نہ پڑھ سکی۔ میں اپنے کو ایک ذہین قاری سمجھتی ہوں۔ اس کے برعکس کافکا کا دی ٹرائل میں نے دن بھر میں پڑھ ڈالا تھا مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ایک طویل دلچسپ خواب دیکھ رہی ہوں۔ علاوہ پیغام کے

مجھے ادب پارہ میں دلچسپی ہوتی ہی ۱۹۶۰ء کی دہائی کا فاؤ رولینڈ بارتھ جس کا استاد ژاک ڈریڈا ہے لکھتا ہے "ہم جب کہانی کہتے ہیں تو کہانی ہمیں کہہ رہی ہوتی ہے" یعنی تخلیق، تخلیق کار اور قاری کے درمیان ابہام کی حیثیت ہونا ضروری ہے۔

(1) 1968 Engl (Writing Digree Zero)

(2) Death of the Auther

1972ء میں Wolfgang Iser بھی قاری کی اہمیت اجاگر کرتا ہے اس نے عام قاری یا قاری کا امتیاز سے تخیر لکھا ہے۔

"کسی ادب پارہ کا مطالعہ کرتے ہوئے انسان کو یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ نہ صرف یہ کہ تحریر زیر مطالعہ ہے بلکہ اس کو پڑھنے کے بعد قاری پر کونسا تاثر قائم ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ کیا کرتا ہے یعنی کیا ردعمل ہوتا ہے"

اگر قاری تخلیق دامن سے تحریر سمجھنے کے لئے تو اس دور میں قاری کے پاس اتنا وقت کہاں ہے؟

صفحہ ۱۳ پر حامد مرزا کے اس خیال سے بھی مجھے اتفاق نہیں۔

"عالمی معیار سے واقف لوگ یہی کہہ سکتے ہیں کہ اردو افسانہ عالمی معیار کو چھو رہا ہے" یقیناً مرزا حامد بیگ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انہوں نے دنیا بھر میں اردو میں لکھے جانے والے تمام افسانے پڑھے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ان خیالات کا اظہار نہ کرتے جو انہوں نے صفحہ ۱۵ کے آخری پیراگراف میں کیا ہے اور جس سے مجھے شدید اختلاف ہے اور اس ضمن میں پوری منطقی وضاحت دوں گی۔ مستند پارے کے لکھنے والوں کے بارے میں مرزا حامد بیگ رائے نہ دیتے تو بہتر تھا اور یقیناً انہوں نے ماشوکا گی کی وہ کتاب نہیں پڑھی جو یہاں کے لکھنے والوں پر لکھی گئی ہے ورنہ وہ یہ رائے نہ دیتے۔ انہوں نے مستند لکھنے والوں کو مستند اس لئے کہا ہے کہ وہ پاکستان میں چھپتے رہے ہیں۔ جیسے احمد مشتاق، نجم الحسن رضوی، گیان چند، قیصر تمکین، جتیندر بلو۔ شاعروں میں ساقی فاروقی، باصر کاظمی، قیصر تمکین ادب لطیف میں اس وقت بھی لکھتے تھے جب میں نے لکھنا شروع کیا۔ جتیندر بلو نے بھی تقریباً میری طرح 62-63 کے قریب لکھنا شروع کیا اور اوراق میں خصوصاً ہم دونوں ساتھ چھپتے رہے ہیں۔ ادھر ریٹائرمنٹ کے بعد وہ بہت زیادہ نظر آنے لگے ہیں یہاں تک کہ ان کا ایک ہی افسانہ دو دو تین رسالوں میں چھپ رہا ہے۔ لوگوں کو نظر آتا ہو گا ثبوت کے طور پر "فاصلہ" چہار سو اور "نادیب" دونوں میں ہے۔ یہ دونوں پرچے مستند ہیں۔ میں بھی 1962-63 کے درمیان سے تمام موقر ادبی رسالوں میں لکھ رہی ہوں۔ خصوصاً اوراق، فنون، تخلیق، سیپ اور افکار، جدید وغیرہ میں اوراق کے تمام لکھنے والوں نے اکثر میرے افسانوں کو بہت پسند کیا۔ میرے افسانے فن کی دہلیز (۱) مردہ لمحوں کے زندہ منظر (۲) اجلی زمین میلا آسمان (۳) بے سمت بستی (۴) میں چھپے ہیں۔ سوانح

رہے کہ میں پہلے حمیدہ رضوی کے نام سے لکھتی تھی تو میں نے 1962 سے 1975ء تک کے درمیان لکھے گئے۔ حال میں پی ٹی وی کے ایک پروگرام 1965 کی جنگ کے حوالے سے ایک ادبی تجزیہ میں بتایا گیا کہ جنگ کے حوالے سے بہترین افسانہ ایک کم عمر لڑکی حمیدہ رضوی نے لکھا تھا افسانہ کا نام... ایک پل تھا اور فنون میں چھپا تھا۔ سید عقیل نے تیسرے مجموعہ میں تعارف لکھتے ہوئے دوسرے مجموعے کے افسانے "بڑے بھیا" کو ایک unique افسانہ کہا ہے۔ سیما پیروز نے تخلیق میں اجلی زمین میلا آسمان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا "حمیدہ معین رضوی کے کرداروں کے مابین ایک مربوط فکری نظام ہے جو قرآن و حدیث سے متاثر ہیں علاوہ دوسری خوبیوں کو اس وجہ سے ادب کے لئے یہ ایک منفرد ادبی روش اور طبع زاد تحفہ ہے" 1966ء میں نے خواتین افسانہ نگاروں کا نمبر نکالا تھا اس میں میں بھی شامل تھی۔ جس ادبی معیار و کسوٹی سے مرزا حامد بیگ نے قیصر تمکین اور جتیندر بلو کو سند دی ہے مجھے کیوں نہیں دی۔ صرف اس لئے کہ میں خاتون ہوں؟

بات یہاں ختم نہیں ہوتی میں قارئین کے فائدہ کے لئے ان تمام لوگوں کا تعارف کرواؤں گی جن کو مرزا حامد بیگ نے غیر مستند قرار دیا ہے۔

(۱) انور نسرین نے پاکستان بننے سے پہلے لکھنا شروع کیا تھا چھپتی بھی رہیں زور دار ڈرامہ کر چھوڑتی تھیں کوئی ذوقی گھریلو وجہ ہو سکتی ہے۔ انگریزی میں بھی لکھتی ہیں۔ ۲۰۰۳ء میں ان کے دو افسانوی مجموعے اردو میں ایک انگریزی میں چھپا ہے۔ موضوعات عورتوں کی خرید و فروخت سے لے کر دوبئی میں اونٹوں کی دوڑ میں پاکستانی بچوں کا استعمال ان کی موت اور اپاہج ہونے تک کا ذکر ہے سحر خاتون ہیں۔ ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

(۲) صفیہ صدیقی۔ ۱۹۵۸ء کے قریب لکھنا شروع کیا۔ کراچی کے رسالوں میں چھپتی رہیں۔ ساٹھ کی دہائی میں لندن آ گئیں کئی سال خاموش رہیں قیصر تمکین کی طرح روزی کمائی تو اس میں دوبارہ لکھنا شروع کیا پھر باقاعدہ پاکستان اور لندن کے رسالوں میں چھپنے لگیں۔ تین چار افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ پاکستان میں ان کے مداح ہیں۔

(۳) محسنہ جیلانی نے ۱۹۶۰ء میں "سکل فیاز" لاہور سے لکھنا شروع کیا مختلف ادبی رسائل میں چھپتی رہیں۔ باقاعدہ پی سی ڈی "فنون" افکار میں زیادہ تر لکھا۔ پہلے افسانوی مجموعے کا تعارف محمود ہاشمی (ہندوستان والے) نے لکھا ہے اور اچھا تاثر دیا ہے۔ مجموعہ کا نام ہے عذاب بے نیازی دوسرا مجموعہ حال ہی میں چھپا ہے نام ہے بکھرے ہوئے لوگ ان کے ایک افسانے "تیسری ہجرت" کی انور سدید نے بہت تعریف کی ہے۔

(۴) فیروزہ جعفر مرحومہ۔ خواتین کے صفحہ جنگ وغیرہ ادبی مجلوں میں ۱۹۶۵ء سے لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۶۸ء تک لندن آ گئیں۔ یہاں سے بھی زیادہ تر افکار میں لکھا۔ کتاب کا نام پہلی بوند ہے۔ اس پر تبصرہ ماجد اور محمود ہاشمی

ہندوستان والے نے لکھے تھے جو روی اور کسی اور رسالہ میں چھپے تھے۔ صحت کی خرابی کے باعث لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ ۲۰۰۸ء میں انتقال ہو گیا۔ افکار معارف بھی ان کے فن کے گواہ ہیں۔

(۵) بانو ارشد نے بھی غالباً ۱۹۷۰ء کے بعد شادی سے قبل لکھنا شروع کیا تھا چھپتی بھی رہیں۔ شادی کے بعد ماحول سازگار نہ تھا۔ لکھنا چھوڑ دیا۔ ۱۹۸۳ء سے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ زیادہ تر افکار و شاعر میں لکھا ہے۔ دو افسانوی مجموعے آ چکے ہیں ان کے دو افسانوں کی میرے نزدیک خصوصی اہمیت ہے "بانوں کی دنیا" "دارنگی" کامیاب افسانے ہیں۔

(۶) شاہدہ احمد۔ وہی خاتون ہے جس نے آٹھ سال لندن میں گذار کر کراچی واپسی ۱۹۸۱ء میں معذور لوگوں کا واحد رسالہ "آدرش" نکالا تھا اس سے پہلے انہوں نے ایک افسانے کے مجموعے کی اوت بھی کی جس کا نام "نقابِ طلبیہ" میں اردو کے منتخب افسانے" ان کے مجموعے کا مختصر تعارف ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے تبصرہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ کہتے ہیں "شاہدہ احمد کے یہاں دردکا تجزیہ نسوانیت کی دھرتی پا گا ہے"..... شاہدہ احمد کے کردار ایسے کردار ہیں دکھ جن کے قلب میں پیوست ہے دکھ کے پیکاں پہ کھینچنے پہ قادر ہو جائیں تو بھی اس کے لئے تیار نہیں۔" بی بی سی ریڈیو سے اردو پروگرام نشر کرتی رہیں کتابوں کے نام ہیں۔ لکھنؤ میں چوباغ ہجر لوح کے لکھنؤ۔ صحت کی بنا پر مستقل لاہور میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ افسانے اور شاعری تجربہ اچھا کرتی ہیں۔

(۷) پروین لاشاری (قبل پروین مرزا) ریڈیو ٹی وی سے منسلک ہیں بہت کم لکھتی ہیں۔ لندن آنے سے قبل بھی ریڈیو سے منسلک تھیں۔ افکار نئی قدریں وغیرہ میں چھپتی رہی ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ کے رسالے مخزن میں ایک بہت اچھا افسانہ چھپا ہے "منتر" کئی برس قبل افکار میں "اماں" افسانہ چھپا تھا اچھا تھا۔

(۸) نجمہ عثمان شادی سے قبل رومانی افسانے لکھے۔ شاعری بھی کرتی تھیں چھپوانے پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ پہلا شعری مجموعہ خواجہ رضی حیدر نے چھپوایا اس کا نام "شاخ حنا" ہے دوسرا "کرے موسموں کی زد میں"۔ چند سال قبل چھپا ہے۔ گذشتہ پانچ چھ برس سے انہیں افسانے لکھنے میں زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ چند برس قبل اوراق میں ایک افسانہ سہاگن پاپیں کے نام سے لکھا جسے ادبی حلقے میں سراہا گیا۔ مخزن میں بطور خاص لکھ رہی ہیں۔ اس سے قبل مقصود الٰہی شیخ کے راوی میں بھی لکھتی رہی ہیں۔

(۹) چاند کرن بھی لندن کے ہی حلقوں سے ہیں۔ ہندی اور انگریزی میں بھی لکھتی ہیں۔ ہندوستان سے افسانوں کا مجموعہ چھپوایا تھا بد قسمتی سے میں نے نہیں دیکھا۔ وہ واپس ہندوستان چلی گئیں شاید مستقل چلی گئیں۔

(۱۰) ستارہ لطیف خانم کا تعارف مخزن سے ہوا ان کے بارے میں میری معلومات کم ہیں۔ شمالی انگلستان میں رہتی ہیں۔ اچھا افسانہ تھا۔

(۱۱) طلعت سلیم۔ روی میں ہی میں نے ان کی شاعری اور افسانے دونوں پڑھے۔ دونوں ہی معقول لگے۔ علیہ خان ہندوستان پاکستان دونوں جگہ چھپتی ہیں۔

(۱۲) جرمنی میں فہمیدہ ضیاء الدین ہیں۔ بہر تحقیق میں چھپتی رہی ہیں اوراق میں بھی انہیں پڑھا ہے۔ وہ شاعری بھی کرتی ہیں۔

اب قارئین فیصلہ کریں کہ جس کسوٹی پہ ڈاکٹر قیصر تمکین، جتیندر بلو اور ساقی فاروقی نام مستند ٹھہرتے ہیں اس کسوٹی پہ اس فہرست کے دیگر کئی افسانہ نگار غیر مستند ٹھہریں۔ حامد بیگ کی کسوٹی پہ مجھے لے کر سات خواتین تو سو فیصد پوری اترتی ہیں باقی بھی پچاس فیصد پوری اترتی ہیں ایسے میں مرزا حامد بیگ کا ان سب کو غیر مستند قرار دینا کیا جائز ہے؟ کیا بغیر ثبوت کے کسی کو پھانسی دینا مناسب ہے؟

ہرگز نہیں۔ یہ سب خواتین مقابلہ میں موجود رہی ہیں۔ صفحات پہ شائع ہوتی رہی ہیں یہ دوسری بات ہے کہ آج کا نقاد اپنا homework نہیں کرتا۔ ویب سائٹ پہ ہم میں سے کئی نامل سکے ہیں تجزیہ، تحقیق، تنقید اور دیانت داری کا چولی دامن کا ساتھ ہے ورنہ اسے تحقیق کہا جا سکے گا ہمارا آج کا نقاد وقت نہیں کرنا چاہتا جب کہ انگریز نقاد قرۃ العین طاہرہ پر تحقیق کرنے نکلا ہے تو ایران میں جھونپڑی لگا کر بیٹھتا ہے اور جملہ معلومات اکٹھی کرتا ہے۔ ہمارا نقاد دوسروں کے پڑھے رائے دینے کا عادی ہو چکا ہے جن لوگوں تک ان کی رائے پہنچتی ہے وہ سب آپس میں خاص ہیں اور چیلنج نہیں کرتے اور چیلنج کرنے والوں تک یہ آرا پہنچتی نہیں۔ بات کو یہاں ختم کرتی ہوں کہ یہاں کی شاعرات کا بھی ذکر کر دوں گو وہ غالب اقبال نہیں (ہونا بھی نہیں چاہئے) لیکن اس طرح تو ساقی بھائی غالب، اقبال نہیں۔

شمال میں رضیہ اسماعیل دو مجموعے آ چکے ہیں ان کی ویب سائٹ آگئی ہے یا سمین حبیب اخبار و رسالوں میں کلام پڑھتی ہوں۔ فرزانہ فنا۔ رسالوں میں پڑھا ہے۔

لندن سے محسنہ جیلانی، حمیدہ معین رضوی، نجمہ عثمان، نور جہاں نوری، سیما اجازنسکی، پروین پاکیزہ بیگ کو پہلی بار میں سیالکوٹ کالج کی شاعرہ میں ۱۹۶۱ء میں سنا تھا تب سے لکھ رہی ہیں۔ اس ماچز کی پہلی غزل ادب لطیف میں اکتوبر ۱۹۶۱ء میں چھپی بہت کم لکھتی رہی ایک مجموعہ چھپا ہے۔ نور جہاں نوری کے چار مجموعے چھپ چکے ہیں۔ سیمیں بہ ال بھی بہت چھوٹی عمر سے لکھ رہی ہیں بہت کم لکھتی ہیں مگر چھپ رہی ہیں۔ پاکستان میں ان کی شاعری پاکستان کے کسی بھی اچھے شاعر کے مقابلہ میں رکھی جا سکتی ہے چونکہ ہم سب پروفیشنل خواتین ہیں لوگوں کی خوشامد نہیں کرتے اس لئے لوگ ہمیں جانا نہیں چاہتے۔

(حمیدہ معین رضوی)